سلسلۂ نصابیات سررشتۂ تعلیمات عثمانیہ

تاریخ ہند جلد سوم

(برائے انٹرمیڈیٹ)

(طبع دوم)

تالیف

مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی

سابق رکن شعبۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ

نظر ثانی طبع دوم

مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ام - اے - ایل ایل بی (عثمانیہ)

لکچرار کلیۂ جامعہ عثمانیہ سرکار عالی

۱۳۵۸ھ - ۱۳۴۸ف - ۱۹۳۹ء

دارالطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

تاریخ ہند جلد سوم

"طبع دوم"

باب ا

سلطنت مغلیہ کا آغاز

از صفحہ ا تا صفحہ ۴۱

باب ۲

سلطنت مغلیہ کا استقلال

باب ۳

سلطنت مغلیہ کا انتہائی عروج

(از صفحہ ۹۶ تا صفحہ ۱۶۶)

نقل عہد نامہ کہ بموجب التماس بادشاہزادہ محمد مراد بخش قلمی شد

(آداب عالمگیری ورق ۱۳۳ و ۱۳۴)

باب ۴

آخری مغل بادشاہ

(از صفحہ ۱۷۰ تا صفحہ ۲۱۶)

نئی طاقتیں

(از صفحہ ۲۱۷ تا صفحہ ۲۵۵)

باب ۶

اہل یورپ کی آمد ہند میں

(از صفحہ ۲۵۶ تا صفحہ ۲۸۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاریخ ہند جلد سوم

باب (۱)

سلطنت مغلیہ کا آغاز

پہلی فصل :- بابر کی آمد ہند میں -

سلاطین ہند کی کمزوریاں

اس میں شبہہ نہیں کہ " لامرکزیت " کے باوجود پندرھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی مدنی ترقی کی رفتار دور گزشتہ سے زیادہ تیز ہوگئی تاہم سلطنت دہلی کی مرکزی حکومت سے مختلف صوبوں کا انحراف کرنا اصولاً ایک بری نظیر کا قائم ہوجانا تھا جس نے اپنی اپنی جگہ پر ہر نئی حکومت کے استقلال کو مخدوش و مشتبہ بنادیا۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ جس طرح بنگال و دکن یا گجرات و مالوہ کے صوبہ داروں نے خود مختاری کے لالچ میں صدر حکومت

سے قطع تعلق کیا، اسی طرح خود ان صوبوں کے امرا یا ماتحت عمال اپنی خود مختاری کی آرزو اور سازش نہ کرتے۔ یہ ظاہر ہے کہ اُن کی حکومت و ریاست کی دائرہ سلطنت دہلی کے قدیم صوبہ داروں کے برابر وسیع نہ ہو سکتا تھا اور اسی لئے اُن کی بغاوت میں کامیابی یا خود مختاری بھی کچھ دیرپا نہ ہوتی تھی۔ بایں ہمہ ہندوستان کی ان چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں ہم بار بار امرا، صوبہ دار یا والئی ریاست کے اہل خاندان کی بغاوت کا حال پڑھتے ہیں جو گویا ان نئی سلطنتوں کو اور بھی چھوٹے چھوٹے آزاد و خود مختار حصوں میں منقسم کر دینا چاہتے تھے۔

ہندوؤں کے آخری زمانے میں ہندوستان کی ایسی تقسیم اور سیاسی انتشار کا حال پہلے ہماری نظر سے گزر چکا ہے جب کہ ایک ایک پرگنے اور ضلع میں کئی کئی حاکم خود مختار ہو گئے تھے لیکن اس دور لا مرکزیت میں ایسی نوبت نہ آنے پائی تو اسے عام تمدنی ترقی کی دلیل سمجھنا چاہئیے بے شبہ دکن کی اسلامی سلطنت کے آخر میں کئی حصے ہو گئے تھے لیکن اول تو ان حصوں میں بہت سا دہ علاقہ شامل ہو گیا جو پہلے سلطنت بہمنی کی مستقل حدود میں داخل نہ تھا[۱] دوسرے ان خود مختار حصوں کا رقبہ بھی ابتدا سے اتنا تھا کہ اب تک اس دور جدید میں یورپ کی بعض سلطنتوں کا رقبہ اتنا نہیں ہے۔

قومی ضعف

بہر حال اس شوق خود مختاری و لا مرکزیت نے سلاطین ہند کو بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں ایک حد تک ضرور کمزور کر دیا۔ اور ادھر وہ قومی ضعف جو باشندگان ہند کی تاریخی خصوصیت ہے، نو وارد مسلمانوں میں بھی نمایاں ہو چلا۔ مسلمان حملہ آور اپنے ساتھ ایک قسم کی فوجی جمہوریت کا آئین لائے تھے جسے ہم نے "ترک شاہی" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ لیکن ہندوستان کی فتوحات اور دو صدی کی حکومت نے اس آئین کی بنیادیں ہلا دیں کیونکہ اب یہ فوجی سردار دولتمند اور عیش دوست موروثی زمیندار

[۱] اس موقع پر سلطنت بہمنی کے ابتدائی عہد کا نقشہ سامنے رکھنا چاہئیے۔

باب ۱

بن گئے۔ ان کی جنگجوئی اور جمہوریت پسندی میں فرق آگیا اور ادھر تو ان کے مقابلے میں نئے لوگوں کی ترقی کرنے کا میدان تنگ ہوا اور اُدھر خود ان (موروثی جاگیرداروں) کی خود غرضی کا مقتضا یہ ہوگیا کہ صدر حکومت ایسے کمزور ہاتھوں میں رہے کہ اُنھیں اپنی جگہ پر بے غل وغش عیش و حکمرانی کرنے کی فرصت مل جائے۔

سلطان ابراہیم

حکومت کے انتظامی معاملات میں عام رعایا کو پہلے بھی قانوناً کوئی دخل نہ تھا لیکن عائد سلطنت اور فوجی سرداروں کی مذکورۂ بالا خود غرضی اور تنگ نظری اب ہندوستان کی شخصی حکومت کو درحقیقت سخت نقصان پہنچا رہی تھی اور اُن کی اندرونی سازشوں کو دبانے یا ان سب کو پادشاہِ وقت کی اطاعت پر متحد کرنے کے لیے غیر معمولی قسم کی قابلیت درکار تھی۔ مگر سلطان سکندر بن بہلول (لودھی) کا جانشین فرزند، فراست و شجاعت ذاتی کے باوجود، حزم و احتیاط کے اوصاف سے خالی تھا حالانکہ آگرے[1] میں اس کی تخت نشینی کے وقت (۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء) کابل کی وہ نئی حکومت قائم ہو چکی تھی، جس کا فرمان روا ہندوستان پر حملہ کرنے کا علانیہ آرزومند تھا اس طرح کہنا چاہیئے کہ دربار لودھی کے سازشی اور باغی اُمرا کے واسطے کابل میں اب ایسی پناہ لینے کی جگہ بن گئی تھی کہ سلطان ابراہیم لودھی کے لیئے ان کو قابو میں رکھنا اور بھی دشوار ہو گیا۔ بایں ہمہ یہ نمایاں خطرہ سلطان ابراہیم کی سخت گیری اور بدمزاجی میں فرق نہ ڈال سکا اور امرائے سلطنت پہلے سے بھی زیادہ اس کے مخالف ہو گئے۔ چنانچہ بابر نے جس وقت ہندوستان پر آخری حملہ کیا تو سلطان ابراہیم کے خلاف جا بجا بغاوتیں ہو رہی تھیں۔ بہار و دوآب میں بہادر خاں (لوہانی) نے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ پنجاب کا صوبہ دار دولت خاں علانیہ مخالفت پر

[1] سلطان سکندر لودھی نے آگرے کے قریب "سکندرہ" بسا کر اسے اپنا مستقر بنا لیا تھا اور یہیں وفات پائی۔

باب ۱

کمربستہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے افغان رئیس الگ فتنہ و فساد بپا کر رہے تھے اور خود سلطان ابراہیم کے عزیز قریب علاءالدین نے بھاگ کر بابر کے پاس پناہ لی تھی اور ہندوستان پر حملہ کرنے کی تحریک کر رہا تھا۔

فن حرب کی پسماندگی

مگر ان خرابیوں سے قطع نظر، شمالی ہندوستان والوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ فن حرب میں اپنے معاصرین سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ بلبن و علاءالدین خلجی کی جن ہندوستانی فوجوں نے مغلوں سے کلّہ بہ کلّہ جنگ کی ان کے اسلحہ اور حربی واقفیت اپنے حریفوں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ برخلاف ان کے سلطان ابراہیم لودھی جس لشکر کو میدان میں لایا وہ توپ و تفنگ[۱] کے مقابلے میں خالی تیر و خدنگ سے لڑنے آیا تھا اور مغل شہسواروں کے عمدہ قواعد جنگ کے جواب میں اسے فقط اپنی فوج کی کثرت تعداد پر ناز تھا مگر یہ کثرت لڑائی کے وقت الٹی وبال جان ہوگئی۔

محمد ظہیرالدین "بابر"

دوسرے اہل ہند کے اس مرتبہ جس مغل سردار سے مقابلہ کرنا پڑا وہ اپنے عہد کے بہترین سپہ سالاروں میں شمار ہوتا ہے۔ گیارہ بارہ برس کی عمر سے اس کا قریب قریب تمام وقت جنگ و جدال اور فوجوں کی سپہ سالاری ہی میں گزرا تھا۔ جنگ کے نشیب و فراز موقع و محل اور فوجوں کو لڑانے کے طریقے سے

---

۱ اس جگہ یہ صراحت کر دینی چاہیے کہ گو "باروت" کو غالباً سب سے پہلے چینی قوم نے ایجاد کیا، لیکن بعد میں عربوں نے بغیر ان سے سیکھے بطور خود اسے ایجاد کیا اور ساری دنیا میں رواج دیا تھا لیکن توپ و تفنگ کی ایجاد بہت عرصے بعد ہوئی اور اس صنعت میں اوّل اوّل ترک اور اہل اطالیہ ماہر سمجھے جاتے تھے۔ ایجاد کا ٹھیک زمانہ معین کرنا دشوار ہے مگر چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں مغربی ایشیا میں توپ کا رواج عام ہوگیا تھا۔ مغلوں کی توپوں اور بندوقوں کا حال آگے آئیگا اور ان کے مقابلے میں شاہان بنگال و گجرات کے توپخانے کا ذکر بھی ہم اپنی اپنی جگہ پڑھیں گے لیکن یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سلاطین بہمنی کے بعض قلعوں کی جو بڑی بڑی توپیں ابھی تک موجود ہیں انھیں غالباً ان بادشاہوں کے ترک یا ایرانی سرداروں نے اسی چودھویں پندرھویں صدی عیسوی میں ڈھالا تھا۔ (آکسفورڈ ہسٹری، صفحہ ۲۸۴ نیز دیکھو انسائیکلوپیڈیا، جلد ہشتم صفحہ ۱۸۹)

باب ۱

وہ بدرجۂ اتم واقف تھا اس کی ذہانت و فراست اور عام معلومات کے حیرت انگیز ثبوت اس کی خود نوشتہ سوانح یا "تزک بابری" میں محفوظ ہیں اور اس کتاب کے بعض حصے پڑھتے وقت ہم کو بالکل یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ سولھویں صدی عیسوی کے کسی جنگجو کی سوانح کی بجائے، ہم زمانۂ موجودہ کے ایک مشاق اور باخبر جرنیل کا "ڈس پیچ" مطالعہ کر رہے ہیں[۱]۔

ایک بڑا فرق جس نے بابر کے حملے کی نوعیت بدل دی یہ تھا کہ وہ اپنے مغل اسلاف کے مانند محض غارتگری اور تاخت و تاراج کے لئے ہندوستان پر حملہ آور نہیں ہوا تھا۔ بلکہ جیسا کہ خود جابجا بیان کرتا ہے، اس کو مدت سے کم از کم شمال مغربی ہند کے فتح کرنے کی آرزو تھی۔ اسے وہ اپنے جدامجد امیر تیمور کی میراث جانتا تھا اور ادھر ایسے اتفاقات پیش آگئے گویا قضاء و قدر نے اسے مجبور کر دیا کہ تخت ہندوستان کو اپنا مطمح نظر بنائے۔

تخت نشینی اور پہلی لڑائیاں

شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ جس وقت امیر تیمور کا پروتا سلطان ابوسعید میرزا شمالی عراق کے پہاڑوں میں گھر کر مارا گیا (۸۷۳ھ / ۱۴۶۹ء) تو اغیار و اعداد کے علاوہ خود سلطان ابوسعید کے چار فرزند اپنی اپنی جگہ خود مختار بادشاہ بن گئے اور انھی میں بابر کا باپ عمر شیخ میرزا (سب سے شمالی صوبے فرغانہ کا فرمانروا)

۱۔ جنگ پانی پت و کانوہ (یا کنواہہ، بیانہ) کے علاوہ اس قسم کی ایک دلچسپ نظیر دوآبہ "سندھ ساگر" (پنجاب) کے قلعہ "پرنالہ" کی فتح کے حالات ہیں جنھیں تزک بابری سے فارسی نیز انگریزی میں بہت خوبی سے ترجمہ کیا گیا ہے (تزک بابری دفارسی حالات حملہ اول ۹۲۵ھ / ۱۵۱۹ء) الیٹ جلد چہارم وغیرہ۔

تھا۔[1] بابر اس کا سب سے بڑا بیٹا ٦ محرم ۸۸۸ھ (۱۴۸۳ء) کے دن پیدا ہوا چنانچہ ''شش محرم'' اس کی مشہور تاریخ ولادت ہے اس کی ماں **قتلق نگار خانم** **یونس خاں** حاکم ''مغول'' کی بیٹی تھی جو **چغتائی** بن چنگیز خاں کی گیارھویں پشت میں تھا۔

باپ کی ناگہانی وفات کے وقت (رمضان ۸۹۹ھ - ۱۴۹۴ء) بابر کی عمر پورے بارہ سال کی بھی نہ تھی اور فرغانہ کے پایۂ تخت **اندجان** میں اس کے تخت نشین ہوتے ہی دشمنوں نے ہر طرف سے اس پر حملے شروع کر دیے ان حملوں میں اوّل اوّل اس کا بہت سا ملک چھن گیا لیکن تھوڑے ہی عرصے میں پہلے سلطان **احمد میرزا** اور پھر بابر کے دوسرے چچا **محمود میرزا** نے وفات پائی اور اب آل تیمور کے تمام حوصلہ مند سرداروں کی پایۂ تخت

---

[1] اس بیان کو پڑھتے وقت ذیل کا شجرۂ نسب سامنے رکھنا مفید ہوگا:-

امیر تیمور صاحبقران
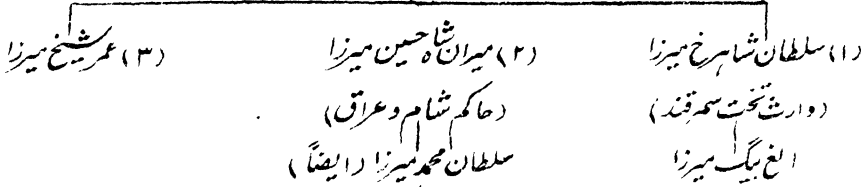
- (۱) سلطان شاہرخ میرزا (وارث تخت سمرقند)
  - الغ بیگ میرزا
- (۲) میران شاہ حسین میرزا (حاکم شام و عراق)
  - سلطان محمد میرزا (ایضاً)
    - سلطان ابو سعید میرزا (جو پایۂ تخت سمرقند پر قابض ہو گیا تھا)
      - (۱) سلطان احمد میرزا وارث تخت سمرقند
      - (۲) سلطان محمود میرزا (حاکم بدخشاں وغیرہ)
      - (۳) عمر شیخ میرزا (حاکم فرغانہ)
        - (۱) ظہیر الدین محمد بابر میرزا
        - (۲) جہانگیر میرزا
        - (۳) ناصر میرزا
      - (۴) الغ بیگ میرزا (حاکم کابل)
        - عبدالرزاق میرزا
- (۳) عمر شیخ میرزا

باب
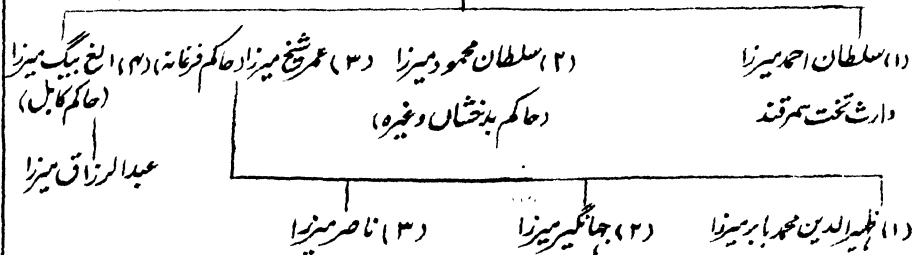
سمرقند پر نگاہ لگ گئی ؛ اس قیمتی ترکے کے لئے ہر شخص خون بہانے پر آمادہ تھا اور فرغانہ کے نوجوان اور پرجوش بادشاہ نے بھی اس کے حصول کے واسطے جان اور سلطنت کی بازی لگا دی تھی ۔ چنانچہ دو مرتبہ وہ سمرقند میں فاتحانہ داخل ہوا اور سات سال کی مسلسل جنگ و جدال نے ثابت کر دیا کہ کم سے کم تیمور کی اولاد میں سپہ سالاری اور حکمرانی کی سب سے زیادہ قابلیت عمر شیخ کے نوجوان فرزند بابر میں تھی ۔

قبضۂ کابل

لیکن اب ماوراء النہر اور تیموری سلطنت کو لینے کے واسطے آل تیمور سے بھی زیادہ بہادر و جاں باز یعنی اوزبک سردار میدان میں کود پڑے تھے اور انھی اوزبکوں کے ہاتھ سے پے در پے شکستیں کھا کر بابر نے خراسان اور پھر افغانستان کا رخ کیا جہاں اسی زمانے میں اُس کے چچا **الغ بیگ میرزا** نے وفات پائی تھی اور گو اس کا بیٹا **عبدالرزاق میرزا** کابل میں تخت نشین ہو گیا تھا لیکن اندرونی فساد کی وجہ سے اسے کابل چھوڑنا پڑا اور دو سال بعد جب بابر اس شہر کے سامنے پہنچا ہے تو اس پر قندھار کے حاکم **ذوالنون ارغون** کا بیٹا (محمد مقیم) قابض تھا ۔

بابر نے کابل کا محاصرہ کر لیا اور اس کی جنگی شہرت اور نیز اُلغ بیگ سے رشتہ داری نے اہل شہر کو خود بخود اس کا طرفدار بنا دیا ۔ چنانچہ چند ہفتے کے معمولی محاصرے کے بعد محمد مقیم نے ہتیار رکھ دئے اور کسی بڑی لڑائی کے بغیر بابر کا شہر پر قبضہ ہو گیا ۔ (سنہ ۹۱۰ھ ۱۵۰۴ء)

پایۂ تخت کابل پر تسلط ہونے کے معنی یہ تھے کہ نہ صرف کابل و غزنی بلکہ دریائے جہلم تک شمالی و مغربی پنجاب کے وہ اضلاع بھی (برائے نام) بابر کے دائرۂ حکومت میں داخل ہو گئے جو امیر تیمور کے زمانے سے کابل کے صوبے میں شامل تھے اور بابر کے آئندہ پانچ چھ برس انھی اضلاع کو از سر نو فتح کرنے پر صرف ہوئے، اور اسی ضمن میں فتح ہند کی آرزو اس کے دل میں پیدا ہوئی ۔ لیکن ابھی تک اس خیال پر عمل کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ اس کے شمالی دشمنوں کو شاہ اسمٰعیل صفوی نے سخت شکست دی

(جنگ مرو ۹۱۶ھ / ۱۵۱۰ء) اور بابر کو پھر سمرقند کی آرزو نے بیتاب کر دیا۔ چنانچہ ایرانیوں کی امداد سے وہ تیسری مرتبہ تیمور کے پائے تخت میں داخل ہوا (۹۱۷ھ / ۱۵۱۱ء) اور کچھ عرصے تک پھر وہیں کے جھگڑوں اور لڑائیوں میں الجھا رہا۔ حتیٰ کہ ۹۱۸ھ / ۱۵۱۲ء میں اوزبکوں نے دوبارہ تازہ قوت بہم پہنچائی اور بابر اور اس کے ایرانی طرفداروں کو کامل شکست دے کر پھر سمرقند چھین لیا۔ (جنگ غجدوان)

فتح ہندوستان

جب فرغانہ اور ماوراءالنہر پر قبضہ رکھنے کی کوئی امید باقی نہ رہی تو بابر پھر کابل چلا آیا اور اب اس کے جذبۂ کشورستانی کے لیے مشرق میں قسمت آزمائی کرنے کے سوا اور کوئی میدان نہیں رہا۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ "دیگر بہ الہام غیبی رفتن ماوراءالنہر را برطرف کردہ تسخیر ممالک ہندوستان را پیش نہاد ہمت والا ساختند[1]"۔ لیکن ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ یہ "الہام غیبی" درحقیقت اوزبکوں کے مقابلے میں اپنی بے دست و پائی کا احساس تھا۔

القصہ اب اس کی توجہ سب طرف سے ہٹ کر فتح ہندوستان پر مبذول ہوگئی اور جب اپنے اندرونی اور مقامی جھگڑوں سے فرصت ملتی تو وہ پنجاب پر فوج کشی کرتا۔ چنانچہ تین حملوں میں دریائے چناب تک شمال مغربی پنجاب پر اس کا مستقل قبضہ ہوگیا اور چوتھی مرتبہ دولت خاں لودھی کے اشارے سے وہ پہلے لاہور آیا اور وہاں کے لودھی سرداروں کو شکست دے کر شہر پر قابض ہوگیا۔ پھر دیپالپور تک بڑھا اور اس شہر کو سلطان ابراہیم لودھی کے عمزاد بھائی علاؤالدین کے حوالے کر گیا جو اپنے بھائی کا ساتھ چھوڑ کر بابر سے آملا تھا (۹۳۰ھ / ۱۵۲۴ء)

معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک پنجاب کے بعض افغان سردار اور علاءالدین لودھی اس بات کی امید رکھتے تھے کہ بابر دریائے ستلج سے آگے نہ بڑھے گا اور خود بابر بھی شمالی پنجاب پر قناعت کرنی چاہتا تھا۔ لیکن ان افغان سرداروں میں جو اس سے آملے تھے سخت نااتفاقی تھی۔ دوسرے علاءالدین لودھی نے بابر کی

[1] اکبرنامہ صفحہ ۹۱

باب

امداد سے دہلی پر جو حملہ کیا اس میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ پس بابر کو نظر آنے لگا کہ جب تک سلطان ابراہیم لودھی سے لڑ کر فیصلہ نہ کیا جائے پنجاب کے معاملات بھی خاطر خواہ طے نہ ہو سکیں گے۔

جنگ پانی پت

اس ارادے سے وہ بارہ ہزار سوار کا چیدہ لشکر لے کر پانچویں مرتبہ ہندوستان روانہ ہوا (ماہ صفر ۹۳۲ھ ۱۵۲۶ء) اور مخالف افغان سرداروں سے ملک پنجاب کو صاف کرتا ہوا[۱] انبالہ و شاہ آباد کے راستے جمنا کے کنارے کنارے دہلی پر بڑھا۔ تزک بابری کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس حملے میں بھی اسے اوّل اوّل "ہندوستان خاص" پر تسلّط حاصل ہو جانے کا پورا یقین نہ تھا بلکہ خود سلطان ابراہیم کا مقابلہ کرنے سے بھی آخر تک اس کے ساتھی ہچکچاتے رہے[۱]۔

لیکن اول تو پنجاب میں اور پھر حمید خاں حاکم حصار کے مقابلے میں (جو معقول فوج لے کر پانی پت کی طرف سلطان ابراہیم کی مدد کو بڑھا تھا) مغلوں کو نمایاں کامیابی ہوئی جس نے ان کا دل بڑھا دیا اور دوسرے پانی پت پہنچتے ہی بابر نے نہایت مستحکم مورچے اور دمدمے قائم کر لئے کہ ان کی پناہ لیکر دشمن کا مقابلہ کیا جا سکے۔

سلطان ابراہیم کی بے تدبیری اور شکست

سلطان ابراہیم لودھی کی غفلت کا ایک ثبوت تو یہی ہے کہ اس نے اپنے سردار حمید خاں کو بچانے کا انتظام نہیں کیا اور پھر بابر کو اتنی فرصت دیدی کہ وہ راستے میں اطمینان سے گاڑیاں اور مدافعت کا سامان فراہم کرتا ہوا آیا اور کئی دن تک ہندوستانی لشکر کے قریب ہی پانی پت میں مورچے

---

[۱] مغلوں کے تردّد کا تزک بابری سے جابجا اندازہ ہوتا ہے (تزک۔ حالات ۹۳۲ھ ۱۵۲۶ء) نیز فرشتہ نے تصریح کی ہے کہ پنجاب کے لودھی سرداروں کا بہ آسانی قلع قمع کرنے کے بعد جب بابر نے دیکھا کہ خود سلطان ابراہیم لودھی کے امرا اور درباری اپنے بادشاہ کے دشمن ہیں تو اس وقت "عازم تسخیر تامی ہندوستان شدہ متوجّہ دہلی گردید" (فرشتہ صفحہ ۲۰۴) یعنی اس سے پہلے اس کا یہ ارادہ مصمم نہ تھا۔

بنو آتارہا۔ دوسرے اس کی سب سے بڑی غلطی بلکہ حماقت یہ ہوئی کہ بے سوچے سمجھے اس جال میں پھنس گیا جو بابر نے اس کے واسطے تیار کیا تھا۔

شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ جب بابر نے اپنے دمدمے بنا کر توپ و تفنگ کو ان کے پیچھے جما لیا تو سلطان ابراہیم کے غدار سرداروں کے اشارے سے ایک رات مغلوں کے دستے نے ہندوستانی لشکر پر چھاپا مارا۔ اور گو اس میں حملہ آوروں کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی تاہم اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان ابراہیم جو پانی پت سے چند میل دور، دشمن کے میدان میں نکلنے کا انتظار ہی کر رہا تھا، دوسرے دن بابر کے پڑاؤ پر حملہ کرنے کے ارادے سے خود فوج لے کر بڑھا اور گویا اپنے آپ دشمن کی توپ اور "ضرب زن" کا نشانہ بن گیا۔ بابر کی آرزو یہی تھی اور جب اس کی صفوں سے ایک میل کے قریب فاصلے پر پہنچ کر ہندوستانی لشکر ٹھٹکا تو پھر بابر نے اسے سوچنے سمجھنے یا توپوں کی زد سے ہٹنے کی مہلت نہیں دی اور مغل سواروں نے پہلوؤں پر اس قدر حملے کیے کہ ہر طرف سے فوج سمٹ سمٹ کر قلب لشکر میں جمع ہونے لگی جس پر بابر کی توپیں گولے برسا رہی تھیں۔

سلطان ابراہیم نے شجاعت ذاتی سے اپنی ناتجربہ کاری اور بیوقوفی کی تلافی کرنی چاہی تھی۔ لیکن اس کا دلیرانہ حملہ بابر کے مستحکم مورچوں پر کوئی اثر نہ کر سکا اور وہ اپنے چار پانچ ہزار جانباز رفیقوں کے ساتھ مارا گیا۔ باقی ماندہ ہندوستانی فوج کی حالت اس سے بھی بدتر ہوئی۔ اپنے سپہ سالاروں کی بدنظمی اور نیز دشمن کے سبک رفتار سواروں اور چالاک تیراندازوں کے پیہم حملوں نے انھیں بازوؤں کی حفاظت کرنے کا موقع ہی نہیں دیا اور دشمن کے قلب پر جہاں مضبوط مورچے بنے ہوئے تھے اور جہاں سے توپیں گولہ باری کر رہی تھیں وہ کوئی کارگر حملہ نہ کر سکے اور سلطان ابراہیم نے حملہ کیا بھی تو وہ بالکل ناکام ہوا۔ ادھر فوج کی کثرت اور صفوں میں ہلچل کی وجہ سے ان کو آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا دشوار ہو گیا تھا غرض دو تین گھنٹے تک گولیاں اور تیر کھانے کے سوا ہندوستانی فوج کی جماعتِ کثیر لڑائی میں کوئی حصّہ نہ لے سکی

باب

اور سورج کے ڈھلتے ڈھلتے بے ترتیب ہو کر بے تحاشا بھاگ نکلی (ماہ رجب ۹۳۲ھ مطابق اپریل ۱۵۲۶ء)

بابر کا فیصلہ

تاریخ ہند کی یہ مشہور لڑائی چند گھنٹے میں ختم ہو گئی۔ اس کی تیاری میں بابر نے جس قدر دردسری کی تھی، جیتنے میں اس کی آدھی بھی نہیں اٹھانی پڑی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ فتح کی اصلی تکمیل سلطان ابراہیم لودھی کی موت سے ہوئی ورنہ ہندوستان میں لڑنے والوں کی ابھی تک کچھ کمی نہ تھی۔ بہرحال، تقدیر نے بہت آسانی سے بابر کو دہلی اور آگرے کا مالک بنا دیا اور اسی بنا پر اگر وہ اپنے آپ کو تمام شمالی ہندوستان کا بادشاہ جائز سمجھ کر مسرور و نازاں ہوا تو یہ کچھ بیجا بات نہ تھی۔ اس فتح نے اس کے دل میں نئے نئے ولولے پیدا کر دیے تھے اور اس نے ہندوستان میں مستقل طور پر رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسی لیے بعض مغل سرداروں نے دہلی اور آگرے کی لوٹ سے مالا مال ہو کر واپسی کی گفتگو چھیڑی تو بابر ناراض ہوا اور کہنے لگا کہ اتنا وسیع ملک کہ بایں مشقتے بدست آوردیم گذاشتن و بہ تنگنائے کابل "گرفتار گشتن" کونسی عقلمندی کی بات ہے؟ پھر اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب میں ہندوستان سے جانا نہیں چاہتا اور یہاں کے فوائد و مصالح اور میری رفاقت چھوڑ کر بھی اگر کوئی وطن جانا چاہے تو اسے اجازت ہے، چلا جائے!

مردِ عزیز بادشاہ کی ایسی تقریر سن کر کسی نے اس کی رفاقت چھوڑنی پسند نہ کی۔ لیکن ایک نامور امیر **خواجہ کلاں** کا دل ہندوستان کی ایک ہی گرمی دیکھ کر سرد ہو گیا تھا۔ اس نے پھر بھی وطن جانے پر اصرار کیا اور بابر نے

؎۱ بابر نے اپنی تزک میں تفصیل سے ہندوستان کے ہمعصر سلاطین اور سیاسی و تمدنی حالات کا ذکر کیا ہے۔ یہاں کی گرمی اور لوگوں کی بدصورتی اور بدذوقی کی وجہ بجا شکایت کرتا ہے لیکن اس نے کئی ورق میں ہندوستان کی پیداوار، پھل پھول اور مختلف شکاری اور اہلی جانوروں کا دلچسپ حال بیان کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسے ہندوستان میں آتے ہی اس ملک سے خاص الفت و دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

طوغا و کرہاً اس کو کابل جانے کی اجازت دیدی۔[1]

دوسری فصل:۔ شمالی ہندوالوں کی آخری جدوجہد۔

ہندوستان میں مستقل سکونت کے فیصلے نے بابر کے اس حملے کی نوعیت کو بدل دیا اور بہت جلد اس کے عمدہ نتائج کا ظہور ہونے لگا: اول تو مغل سپاہیوں نے لوٹ مار کا خیال چھوڑ دیا اور یہ سمجھ کر کہ آیندہ ہندوستان ہی کے لوگوں میں زندگی گزارنی ہے تالیف قلوب اور میل جول پر مائل ہو گئے۔ ادھر نواح دہلی اور مغربی دوآب کی عام رعایا اور کسان جو یہ سمجھ کر گھروں سے فرار ہو گئے تھے کہ تھوڑے دن بعد مغل چلے جائیں گے تو واپس آجائیں گے، چاروناچار واپس آکر بابر کی اطاعت قبول کرنے لگے۔ بعض چھوٹے چھوٹے رئیس اور قدیم حکام کو بھی مصلحت یہی نظر آئی کہ فاتح کی اطاعت قبول کر لی جائے۔ ان واقعات نے قدرتی طور پر بدامنی و بے اطمینانی کو دفع کر دیا اور اسی کے ساتھ رسد رسانی اور باربرداری وغیرہ کی وہ ابتدائی دقتیں جن کی بابر نے تزک میں شکایت لکھی ہے رفع ہو گئیں۔

جونپور کا اتحاد

بعض افغانی قلعہ داروں نے اپنے مقامی حریفوں سے بچنے کے لیے بابر سے امداد کی درخواست کی اور بعد میں قلعے سپرد کر دیے چنانچہ سنبل اور گوالیار میں یہی ہوا۔ لیکن ان فوائد کے ساتھ مغلوں کا ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کرنا بہت سے افغان سرداروں کے واسطے مایوس کن تھا اور اسی مایوسی نے ان کو جابجا باہمی اتحاد اور مغلوں کی مخالفت پر کمربستہ کر دیا لیکن اوّل اوّل مشرقی دوآب اور بہار میں ان کی گروہ بندی کے خطرناک بن جانے سے پہلے شہزادہ ہمایوں چیدہ افواج لے کر ادھر پہنچا اور جونپور تک اس نے دشمنوں سے ملک کو صاف کر دیا اور ہر جگہ اپنے قلعہ دار و حکام متعین کر دیئے۔ مگر یہ انتظام مکمل ہو جانے نہیں پایا تھا کہ ایک دوسرے جتھے کی اطلاع ملی جس نے چتوڑ کے راجہ راناسانگا کی سرداری میں بہت اندیشہ ناک قوت بہم پہنچائی تھی۔ مغلوں کو اس کے مقابلے میں پھر ایک مرتبہ اپنی پوری طاقت سے جنگ کی تیاری کرنی پڑی اور سلطنت ہند کے مستقبل پر

---

[1] ۔ خواجہ کلاں کا یہ شعر مشہور ہے جو وہ چلتے وقت دہلی میں کسی شاہی عمارت پر لکھ گیا تھا۔

اگر بخیر و سلامت گذر ز سند کنم ۔۔۔ سیاہ روئے شوم گر ہوائے ہند کنم!

بابر نے تزک میں ایسا شعر لکھنے پر اپنی خفگی ظاہر کی ہے اور خود بھی جواب میں فی البدیہہ رباعی لکھ کر خواجہ کلاں کو کابل بھیجی تھی۔

باب

دوبارہ امید وبیم کا پردہ پڑ گیا۔

میواڑ کا یہ راجہ جس کا پورا نام سنگ رام سنگھ ہے، ہندوستان میں اپنے عہد کا مشہور سپہ سالار تھا اور گجرات و مالوے کے سلاطین کے ساتھ تیغ آزمائی کی مشق نے اس کی جنگی قوت بہت بڑھا دی تھی۔ کرنل ٹاڈ نے اس کی سپہگری اور اقبالمندی کے بیان میں حسب عادت مبالغے سے کام لیا ہے لیکن ونسنٹ اسمتھ کے اس قول کی تزک بابری اور ہمعصر تواریخ فارسی سے بھی تائید ہوتی ہے کہ بابر سے جنگ کے وقت اس کے لشکر میں اسّی ہزار سوار اور پانچسو جنگی ہاتھی تھے[1] اور افغان اتحادیوں کی امدادی فوج نے کل تعداد کو دو لاکھ کے قریب پہنچا دیا تھا۔

جنگ کا نو

دشمن کی کثرت کے علاوہ مغلوں کے ہراس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ آگرے کی جانب رانا کے بڑھنے کی خبر منتشر ہوتے ہی ملک میں ہر طرف شورشیں برپا ہوگئیں اور کول، سنبھل، چنداور، قنوج وغیرہ مقامات کی مغل فوجوں کو مجبوراً ہٹ کر آگرے آنا پڑا اور بعض قلعوں کے دستے وہیں محصور ہو گئے۔ غرض جیساکہ بابر نے لکھا ہے، روزانہ ہر سمت سے بری خبریں آتی تھیں اور ہندوستانی سپاہی اور سردار مغلوں کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے تھے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں بابر کے چند احباب اور ایک دستہ فوج کابل سے آگرے پہنچا اور انھی میں محمد شریف نامی ایک نجومی بھی تھا۔ اس نے شکست کی فالیں نکال نکال کر لوگوں کو اور بھی بددل کرنا شروع کیا اور مغل

---

[1] اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۳۲۲۔ نیز دیکھو اکبرنامہ صفحہ ۱۰۶۔ فرشتہ صفحہ ۲۰۸ وغیرہ وغیرہ مختلف قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید ان افغانی سرداروں کا ابراہیم لودھی کے وقت سے رانا سانگا کے ساتھ میل جول تھا چنانچہ اس نے بھی بابر کے حملہ کرنے سے پہلے اس کے پاس کابل میں پیام بھیجا تھا کہ اگر تم شمال سے دہلی پر فوجکشی کروگے تو میں تم کو مدد دینے کے لیے جنوب سے پیش قدمی کروں گا (تزک، حالات ۹۳۲ھ ۱۵۲۶ء۔ نیز دیکھو ترجمہ مسز بیورج، حصہ سوم صفحہ ۵۲۹)

سرداروں میں پھر ہندوستان چھوڑ کر کابل چلنے کی سرگوشیاں ہونے لگیں؛ لیکن بابر نے ان حوصلہ شکن باتوں کی مطلق پروا نہیں کی اور آگرے سے پچیس تیس میل مغرب میں بڑھ کر (سیکری پر) دشمن کے قریب پڑاؤ ڈال دیا۔ (جمادی الاول ۹۳۳ھ - ۱۵۲۷ء)

پانی پت کی طرح یہاں بھی بابر نے خندقیں کھدوا کر مورچے بنوا لئے تھے اور اس اثنا میں طرح طرح سے اپنے سپاہیوں کو ابھارتا اور ہمت دلاتا رہا تھا[1] لیکن لڑائی مورچوں سے کچھ دور آگے موضع **کانوہ** (یا کنواہہ) کے میدان میں ہوئی جسے ابوالفضل "خانوہ" لکھتا ہے۔ اور دن بھر کی شدید خوں ریزی کے بعد راجپوت اور ان کے حلیف سخت نقصان اٹھا کر میدان سے فرار ہو گئے۔ مغلوں کو کامل فتح حاصل ہوئی اور "سچ یہ ہے کہ بابر اگر اس موقع پر تعاقب کرتا چلا جاتا تو اسی ایک لڑائی میں راجپوتوں کی قوت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا تھا....."[2]

مگر بابر کو وقت کے وقت "میوات" اور دوآب کے قریبی اضلاع کی فکر ہوئی۔ اور آگرے واپس آکر کئی مہینے کی محنت میں اس نے یہاں کا انتظام درست کیا اور دوبارہ ممالک مشرقی کی طرف فوجیں روانہ کیں یہاں افغانی امرا نے سخت شورشیں بپا کر رکھی تھیں؛ خود بادشاہ نے سال آئندہ جنوب مغربی راجپوتانے پر پیش قدمی کی اور چندیری کے مستحکم قلعے کو ہلہ کر کے چھین لیا جسے راجپوتوں نے چند سال سے اپنا جنگی مرکز بنا لیا تھا؛ پھر جبکہ راجپوتانے کی جانب سے اطمینان ہو گیا تو اس نے پوری فوج سے خود بہار پر فوج کشی کی جہاں سلطان ابراہیم لودھی کے بھائی **محمود لودھی** کے ماتحت بہت سے افغان سردار بابر کے خلاف جمع ہو گئے تھے۔

---

[1] بابر نے اسی موقع پر شراب سے توبہ کی اور اس کے متعلق ایک جوش انگیز فرمان شایع کیا۔ سپاہیوں کے سامنے اس نے جو پر زور تقریر کی تھی وہ بھی تزک میں محفوظ ہے اور اسی کے اثر سے مغلوں نے حلف اٹھائے تھے کہ جیتے جی لڑائی سے منہ نہ پھیریں گے۔

[2] لین پول "بابر"، صفحہ ۱۸۱۔

باب
جنگ گاگرا

بابر کے کڑے پہنچتے ہی مشرقی دوآب کے فتنے فرو ہو گئے۔ اور محمد زماں میرزا کی ماتحتی میں جو فوج اس نے بہار پر بھیجی تھی اس نے گنگا کے جنوبی اضلاع کو بھی مفسدوں سے صاف کر دیا۔ لیکن افغان سرداراب شمالی بہار کے علاقے میں جمع ہو رہے تھے جس پر سلاطین بنگالہ کو اپنی ملکیت کا دعوی تھا۔ بنگالے میں ان دنوں نصرت شاہ بن علاءالدین حسین فرماں روا تھا اور فرشتہ کی روایت کے بموجب، سلطان ابراہیم لودھی کی بیٹی اسے بیاہی تھی[1]۔ اس بادشاہ نے بابر کے بہار میں آنے سے پہلے مصالحت کی گفتگو شروع کر دی تھی مگر معلوم ہوتا ہے گاگرا اور گنگا کے سنگم پر افغانی سرداروں سے جو لڑائی ہوئی اس میں بنگال کی فوج نے بھی حصہ لیا اور بابر کو دریا اترنے سے روکا۔ ان کے پاس مغلوں کے جواب میں توپیں بھی موجود تھیں اور غالباً ہندوستان کی یہ پہلی جنگ ہے جس میں دونوں فریق اس جدید آلۂ آتش بار سے مسلح ہو کر لڑے۔ لیکن بابر نے دریا پر جنگ کرنے اور دریا اترنے کے لیے وسیع پیمانے پر تیاریاں کی تھیں اور لمبی مار کی توپیں ایسے عمدہ موقع سے نصب کی گئی تھیں کہ دشمن کی کشتیاں مغلوں کو دریا اترنے سے نہ روک سکیں، چنانچہ یکے بعد دیگرے بابر کے چھ دستے دریا کے پار ہو گئے اور دو دن کی جنگ میں غنیم شکست کھا کے میدان سے ہٹ گیا (۹۳۵ھ ۱۵۲۹ء)[2]

بابر کی وفات

اس لڑائی کے وقت خود بابر کا مزاج ناساز تھا اور بنگالے میں آگے بڑھنا مصلحت کے بھی خلاف تھا لہذا نصرت شاہ سے صرف اطاعت و پیشکش سالانہ کا اقرار لے کر بابر آگرے چلا آیا اور یہاں کچھ عرصے سمرقند اور بدخشاں کے معاملات نیز اندرونی انتظامات میں مصروف رہا

---

[1] فرشتہ جلد دوم، صفحہ ۳۰۲۔

[2] اس لڑائی کے حالات فارسی تواریخ اور نیز ارسکن کی انگریزی کتاب میں (جلد اول صفحہ ۵۰۲ وغیرہ) تزک بابری کی مدد سے لکھے ہیں لیکن غالباً سب سے واضح اور دلچسپ بیان لین پول کا ہے۔

تیموری پائے تخت کی ہوس ابھی تک اس کے دل میں باقی تھی لیکن اس طرف فوج کشی کا کوئی موقع نہ مل سکا بلکہ خود صوبۂ بدخشاں کی حکومت جس پر بابر کا قبضہ تھا معرض خطر میں پڑ گئی۔ ادھر اس کی صحت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ کئی مہینے کے علاج سے کوئی نمایاں فائدہ نہیں ہوا حتیٰ کہ ماہ جمادی الاول ۹۳۷ھ (مطابق دسمبر ۱۵۳۰ء) میں اس نے وفات پائی اور وصیت کے مطابق اس کا جنازہ کابل لے گئے جہاں بابر کا مقبرہ اور اس کا باغ آج بھی اہل شہر کی سیر گاہ ہے۔

حدود سلطنت

شمالی ہندوستان کے ایک وسیع حصے پر تسلط اور یہاں کی سکونت اختیار کر لینے کے علاوہ دریائے سندھ کے مغرب میں بھی کئی صوبوں پر بابر کا قبضہ تھا ماوراء النہر کو فتح کرنے کی آرزو برابر اس کے دل میں گدگدی پیدا کرتی رہی اور قندز و بدخشاں (یعنی بالائی جیحوں کے جنوبی کناروں) پر اس نے آخر تک اپنا قبضہ رکھنے کی کوشش کی کہ شاید کسی وقت میں اس راستے سمرقند پر فوج کشی کا موقع مل جائے۔ بدخشاں کے مغرب اور جنوب میں اس کی حدود حکومت بلخ و ہرات سے جا ملتی تھیں اور اضلاع کابل، غزنی و قندھار پر اس کا مستقل تسلط قائم تھا۔ بے شبہ کوہستان سلیمان کے وہ جنگجو قبائل جو آج تک انگریزی حکومت کو دق کرتے رہتے ہیں، ایک حد تک آزاد تھے لیکن جلال آباد، پشاور سوات و باجوڑ کے زرخیز آباد اضلاع پوری طرح قابو میں آ گئے تھے۔ جنوبی سندھ میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا مگر اندرونی طور پر شاہ حسین (بن شاہ بیگ) ارغون یہاں کا آزاد حاکم تھا اور بابر کی براہ راست حکومت ملتان سے شروع ہوتی تھی۔ کشمیر میں چودھویں صدی عیسوی سے ایک خود مختار اسلامی سلطنت قائم تھی جس کا مجمل احوال آئندہ ہماری نظر سے گزرے گا باقی پنجاب اور ہندوستان خاص کے تمام علاقوں میں مغلوں کا سکہ چلتا تھا۔ راجپوتانے اور مالوے میں ابھی تک ان کی سرحدی چھاونیاں بیانہ، رنتھنبور اور چندیری سے آگے نہ بڑھی تھیں لیکن ان دونوں علاقوں کے آزاد رئیسوں کی قوت کچھ سیکری کی جنگ اور کچھ آپس کی لڑائیوں نے کمزور کر دی تھی اور ان کے ختم کرنے میں

باب

بظاہر صرف تھوڑی سی مشقت اور فرصت درکار تھی؛ دوآب کے جنوب میں بندھیل کھنڈ، اور اسی طرح جنوب مشرقی بہار کے پہاڑی علاقوں پر بابر کا قبضہ نہیں ہوا تھا اور بنگالے کی حکومت بھی، خراج گزاری کے رسمی عہدوپیمان کے باوجود خودمختار تھی۔

افغان سردار

لیکن اس عہد کی تاریخوں کو بغور پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ مغلوں کی نئی حکومت کو اصلی خطرہ انھی افغان سرداروں سے تھا جنھوں نے دوآب وبہار کی آخری لڑائیوں میں بظاہر ہتیار ڈال دیئے تھے اور اب جوق جوق مغلوں کی اطاعت وملازمت قبول کررہے تھے۔ اس بارے میں فارسی مورخین بالخصوص ابوالفضل کے مبالغہ آمیز بیان سے طالب علم دھوکے میں پڑجاتا ہے اور گاگرا کی جنگ کو افغانوں کی آخری شکست سمجھنے لگتا ہے[۱]۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ گو ان افغان سرداروں میں باہم شدید نفاق تھا اور مل کر کوئی بڑا کام انجام دینے کی صلاحیت باقی نہ رہی تھی۔ تاہم ان میں لڑنے والوں کی کچھ کمی نہ تھی اور ممالک مشرقی میں بہت سے افغان جاگیردار ایسے موجود تھے جو کافی دولتمند اور حکمرانی کی لذت سے آشنا تھے اور جن کو اپنی سلطنت کے ہاتھ سے نکل جانے اور مغلوں کے تسلط کا قدرتی طور پر دلی صدمہ تھا لیکن سب سے بڑی بات، جسے اُن کی اخلاقی قوت کہنا چاہئے، یہ تھی کہ بار بار شکست کھانے پر بھی وہ شجاعت ذاتی کے اعتبار سے اپنے آپ کو مغل سپاہیوں سے کمزور یا کمتر نہیں سمجھتے تھے اور شیر خاں سوری نے بہت دن پہلے پیشین گوئی کردی تھی کہ خدا نے چاہا تو "تھوڑے عرصے بعد میں ان مغلوں کو ہندوستان سے نکال دوں گا" حالانکہ وہ اس وقت بابر کی فوج میں ملازم اور معمولی سردار تھا[۲]۔

[۱] مثلاً ارسکن (صفحہ ۵۰۵) اور سٹینلین پول (صفحہ ۱۹۲) دونوں یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس لڑائی نے افغانوں کی قوت کا خاتمہ کردیا۔

[۲]۔ انگریزی ترجمہ تاریخ شیرشاہی (ایلیٹ جلد چہارم صفحہ ۳۳۰) یہ تاریخ جسے اکبر کے عہد میں عباس خاں ("سردانی" یا سین) نے تالیف کیا تھا، ہندوستان میں کمیاب ہے۔

باب ۱
ہمایوں

شیر خاں نے چند سال بعد، واقعی اپنا دعویٰ صحیح کر دکھایا لیکن ماننا پڑتا ہے کہ اس میں اس کی ذاتی قابلیت کو جتنا دخل تھا، اسی قدر تقدیر نے بھی مساعدت کی اور بابر کی وفات نے ایک حد تک اس کی کامیابی کا راستہ صاف کر دیا۔ کیونکہ گو ذاتی شجاعت یا دیگر اوصاف شاہانہ کے اعتبار سے بابر کا جانشین اپنے باپ سے کم نہ تھا لیکن اس کی فیاضی اور مروت اخلاقی کمزوری کی حد تک پہنچی تھی اور اس کی بادشاہی کا اعلان ہوتے ہی خود اس کے بھائی[1] درپردہ اس کی قوت کو مضمحل کرنے لگے تھے چنانچہ میرزا کامراں جسے باپ نے کابل کی حکومت دی تھی مبارک باد کے بہانے پنجاب میں آ گیا اور جابجا اپنے عہدہ دار مقرر کرنے لگا۔ بایں ہمہ ہمایوں نے نہ صرف چشم پوشی سے کام لیا بلکہ رعایت برادرانہ سے خود ہی کابل کے ساتھ اقطاع پنجاب (تا ستلج) کی سند حکمرانی بھی اس کو بھجوا دی[2]!

دوسرے بھائیوں کو بھی اس نے مناصب جلیل عطا کیئے اور جشن تخت نشینی کے موقع پر اس قدر داد و دہش کی کہ عام و خاص بادشاہ کے گرویدہ ہو گئے۔ پھر اس نے باپ کا آخری ارادہ پورا کیا اور بندھیل کھنڈ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷) اور ہمیں اس کے انگریزی ترجمے پر جو الیٹ کی تاریخ ہند میں شامل ہے، قناعت کرنی پڑی۔ مورخ شیر شاہ سوری کا رشتہ دار تھا اور اس کے خاص رفقا اور سرداروں کی چشم دید روایات بیان کرتا ہے جس نے اس تاریخ کو نہایت دلچسپ اور مستند بنا دیا ہے۔ مختلف شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب دو صدی پہلے تک ہندوستان میں کافی شہرت و قبولیت رکھتی تھی اور اس کے ایک حصے کا اردو یا ہندوستانی زبان ترجمہ بھی شائع کیا گیا تھا لیکن اہل ہند کی علمی غفلت کی بدولت اب یہاں کے بڑے بڑے کتب خانوں میں غالباً نہ اصل فارسی نسخہ محفوظ ہے نہ یہ اردو ترجمہ۔

[1] ہمایوں کے کئی بھائی سوتیلی ماؤں سے تھے:۔ کامراں میرزا، ہندال میرزا، اور عسکری میرزا تین سگی بہنیں تھیں ان میں ہمایوں نامہ کی مصنفہ گلبدن بیگم کا نام مشہور ہے۔

[2] اکبر نامہ، صفحہ ۱۲۵

باب

کے مشہور سرحدی قلعہ کالنجر کو محاصرہ کر کے فتح کر لیا۔

افغانی حریف (۱) جونپور میں

اسی اثنا میں اطلاع ملی کہ محمود لودھی (برادر سلطان ابراہیم) جو بابر کے سامنے سے فرار ہو کر بنگال کے علاقوں میں جا چھپا تھا، پھر مشرقی دوآب پر حملہ آور ہوا اور افغانی سرداروں کی مدد سے جونپور پر قابض ہو گیا ہے لہذا بادشاہ نے کالنجر سے جونپور کی طرف کوچ کیا اور پھر افغانوں کو شکست دے کر یہ حصۂ ملک چھین لیا۔ ابوالفضل کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اب ہمایوں کو صاف صاف نظر آنے لگا تھا کہ جب تک بنگالے پر مغلوں کا مستقل قبضہ نہ ہو، افغان سرکشوں کی شورش خاطر خواہ دفع نہیں ہو سکتی چنانچہ وہ کافی جنگی ساز و سامان کے ساتھ فتح بنگالہ کے ارادے سے روانہ ہو چکا تھا کہ جنوب کی طرف سے ایک نئے فتنے نے سر اٹھایا اور بادشاہ کو ممالک مشرقی کی بجائے مالوے اور گجرات پر فوج کشی کرنی پڑی۔

(۲) دربار گجرات میں

اس فوج کشی کا سبب یہ پیش آیا کہ چند مغل سرداروں نے بادشاہ کے خلاف دو مرتبہ سازش کی اور دوسری مرتبہ ان میں سے ایک (محمد زماں میرزا) قید سے چھپ کر فرار ہو گیا اور اس نے بہادر شاہ والی گجرات کی پناہ لی۔ ادھر علاء الدین لودھی بھی جو اوّل اوّل ہی کابل میں بابر کے پاس پناہ گزیں اور ایک حد تک حملۂ ہند کا محرک ہوا اور مغلوں کی مدد سے پہلے خود ہندوستان پانے کا امیدوار تھا، بدخشاں[1] سے بھاگ کر گجرات چلا آیا تھا جہاں سلطان ابراہیم لودھی کے اور بہت سے مفرور درباری موجود تھے[2]۔

ع۱ فتح پانی پت کے بعد بابر نے اس کے ارادوں سے اندیشہ مند ہو کر اسے بدخشاں بھیج دیا اور وہاں وہ غالباً قید یا نظر بند کر لیا گیا تھا (دیکھو اکبرنامہ ۱۲۶)

ع۲ مثلاً عمر خاں و قطب خاں لودھی جن کی بہادر شاہ نے بہت خاطر مدارات اور دلجوئی کی تھی اور اپنے پاس مہمان رکھا تھا۔ (فرشتہ جلد دوم صفحہ ۲۱۷)

واضح رہے کہ گجرات کی اسلامی سلطنت ان دنوں بڑے عروج پر تھی اور بہادر شاہ بن مظفر شاہ نے (جلوس ۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء) جو وہاں کا دسواں بادشاہ تھا، اس کی وسعت و قوت میں کہیں زیادہ اضافہ کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ نہ صرف خاندیس و برار بلکہ احمد نگر میں اُس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا اور ۹۳۷ھ / ۱۵۳۱ء میں اس نے مالوے کی خود مختاری کا خاتمہ کر کے اس ملک کو اپنی سلطنت کا جزو بنا لیا تھا۔ وسط ہند کی تیسری بڑی ریاست میواڑ کی جنگی قوت جنگ کانوہ میں ٹوٹی اور چندیری کی شکست نے راجپوتوں کا رہا سہا اثر بھی زائل کر دیا تھا۔ مختصر یہ کہ بہادر شاہ کو آس پاس اب کوئی مدمقابل نظر نہ آتا تھا اور اس حالت میں اگر افغانی امرا کی شہ سے اس کے دل میں تمام شمالی ہند فتح کرنے کی ہوس پیدا ہو گئی ہو تو یہ کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔ کم سے کم مغلوں کی جنگی قوت کا اسے کچھ خوف نہ تھا اور جب ہمایوں نے دوسری مرتبہ مطالبہ کیا کہ اگر ہمارے مفرور مجرموں کو حوالے نہ کیا جائے تو گجرات سے ضرور خارج کر دیا جائے، تو بہادر شاہ نے شاہی مراسلے کا جواب بھی نہ دیا اور علاءالدین لودھی کے پرجوش فرزند تاتار خاں کو ہر قسم کی مالی اور فوجی امداد دی کہ وہ خود آگرے پر پیش قدمی کرے۔

مالوہ و گجرات

تاتار خاں کی فوج میں تقریباً چالیس ہزار افغان سپاہی جمع ہو گئے[۱] اور اسی واقعے سے ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اس قوم کی کافی جنگی قوت اور نیز مغلوں سے تیغ آزمائی کا جوش ابھی تک موجود تھا۔ یہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ شمال مشرقی راجپوتانے میں مغلوں کی سرحدی چھاؤنی اس وقت بیانہ میں تھی اور جب تاتار خاں کی فوج نے یک بہ یک حملہ کر کے یہ قلعہ فتح کر لیا، تو ہمایوں کو اپنی مشرقی مہم ملتوی کرنی پڑی اور تاتار خاں کے مقابلے میں عسکری میرزا اور ہندال میرزا کو بھیج کر خود اس نے ارادہ کر لیا کہ پہلے بہادر شاہ کی قوت توڑ دی جائے جس کی مخالفت نے اب علانیہ جنگ کی صورت اختیار کر لی تھی۔

تاتار خاں کی فوج میں نظم نہ تھا اور غالباً بہت سے سپاہی فقط لوٹ مار

[۱] فرشتہ، صفحہ ۲۱۴؛ اکبر نامہ، صفحہ ۱۲۹۔

باب

کے لالچ میں بھرتی ہو گئے تھے۔ لہذا اس "لشکر" کو پراگندہ کرنے میں کچھ زیادہ زحمت نہ پیش آئی اور ایک لڑائی میں خود تاتار خاں گرفتار ہو کر مارا گیا۔ بادشاہ نے ادھر سے مطمئن ہو کر مالوے پر پیش قدمی کی جو حال میں سلطنت گجرات کا صوبہ بن گیا تھا اور سارنگ پور کو (جو آج کل ریاست دھار کے علاقے میں ہے) فتح کر لیا۔

جنگ مندسور

سلطان بہادر شاہ مغلوں کی فوج کشی کے وقت (۹۴۱ھ ۱۵۳۴ء) قلعہ چتوڑ کا محاصرہ کر رہا تھا کیونکہ گو میواڑ کی ریاست اب کمزور ہو گئی تھی پھر بھی وہاں کے منچلے راجپوتوں نے اپنے مشہور و مستحکم آبائی قلعے کے زعم پر شاہ گجرات کی اطاعت قبول نہیں کی تھی اور اسے ان کی آزادی اپنے مالوی علاقوں کی حفاظت کے منافی نظر آتی تھی۔ حتیٰ کہ مغلوں کی آمد آمد سن کر بھی اس نے محاصرے سے ہاتھ نہ اٹھایا اور چونکہ ہمایوں نے عمداً اس کے اور والئی چتوڑ کے معاملے میں مداخلت نہیں کی لہذا گجراتی فوج نے کمال ہمت و مستعدی سے چند روز کی مہلت میں یہ مضبوط قلعہ مسخر کر لیا (رمضان ۹۴۱ھ ۱۵۳۵ء) اور اس تازہ فتح کے جوش میں مغلوں سے مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھی۔ فریقین کا مقابلہ مندسور کی نواح میں ہوا جو راجپوتانے کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے مغلوں کی تازہ دم اور جنگجو فوج کو دیکھ کر گجراتی سپاہیوں کی ہمت پست ہو گئی اور بہادر شاہ کو جنگ کی بہترین صورت یہی نظر آئی کہ خندق اور مورچے بنا کر ہر طرف اپنی توپیں نصب کر دیں جن پر اسے بہت ناز اور بھروسا تھا کہ دشمن کے حملہ کرتے ہی ان کی آتش باری اُسے پراگندہ اور تباہ کر دے گی۔

لیکن بابر کا فرزند آسانی سے دشمن کے جال میں پھنسنے والا نہ تھا۔ اُسے بہت جلد گجراتیوں کی کمزوری معلوم ہو گئی اور عام حملے کا خیال چھوڑ کر اس نے اپنے تیرانداز سواروں کے چند دستے چاروں طرف پھیلا دیئے جن کا کام یہ تھا کہ دشمن کو رسد نہ پہنچنے دیں۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور چند ہی روز میں گجراتیوں کے لشکر میں اجناس خوردنی کا قحط پڑ گیا۔ ان کے بیل اور گھوڑے ہلاک اور سپاہی فرار ہونے لگے۔ توپیں مورچوں میں بیکار دھری رہ گئیں اور بیان کرتے ہیں کہ جس وقت خود بہادر شاہ رات کو چھپ کر لشکر گاہ سے فرار ہوا تو صرف پانچ رفیق اس کے ساتھ تھے!

باب

(شوال ۹۴۱ھ / ۱۵۳۵ء)۔

تسخیر چمپانیر

اس شکست نے، جس میں کسی بڑی لڑائی کی نوبت نہیں آئی، وقت کے شاہ گجرات کو بالکل بے دست و پا کر دیا اور مالوہ ایک طرف، اب گجرات کا بچانا بھی محال ہو گیا کیونکہ لشکر مغل برابر تعاقب میں بڑھ رہا تھا اور مالوے کا الحاق اور انتظام کرنے کے بعد خود ہمایوں اس کے ملک میں پہنچ گیا تھا۔ واضح رہے کہ پندرہویں صدی عیسوی کے اواخر میں، جب سلاطین گجرات کی حدود حکومت مالوے اور خاندیس و دکن کی طرف بڑھیں تو انھوں نے اپنا مستقر بھی احمد آباد کے جنوب میں چمپانیر یا جانپانیر کو بنا لیا تھا اور اس کے پہاڑی قلعے کو از سر نو بنا کر پہاڑ کے دامن میں ایک وسیع شہر محمود آباد بسایا تھا جس کی تجارت اور دولت چند ہی روز میں دور دور مشہور ہو گئی تھی[1]۔ لیکن سلطان بہادر شاہ اپنی شکستہ حالی میں یہاں بھی زیادہ عرصے نہ ٹھیر سکا اور مغلوں نے مالوے سے بڑھ کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ قلعے کی فوج نے استقلال اور بہادری سے مدافعت کی مگر جب ہمایوں صرف تین سو چیدہ سپاہیوں کے ساتھ رات کو ایک طرف سے دیوار میں میخیں گاڑ کر چڑھ گیا اور قلعے کے اندر دربانوں کو مار کر دروازہ کھول دیا تو پھر محصورین، مغلوں کو نہ روک سکے اور قریب قریب سب لڑ کر مارے گئے۔ چمپانیر، جو ان دنوں گجرات کا پائے تخت سمجھا جاتا تھا، فتح ہو گیا۔ (ماہ صفر ۹۴۲ھ / ۱۵۳۵ء)۔

ہمایوں کی واپسی

گجرات کا شکست خوردہ بادشاہ اب محض ایک مفرور پناہ گزیں کی حیثیت سے پرتگیزوں کے پاس مقیم تھا جنھوں نے کچھ مدت سے گجرات کے جنوب مغربی سرے پر قدم جما لیے تھے اور دیو یا دیپ نامی بندرگاہ کو نہ صرف تجارتی مرکز بلکہ اپنا جنگی مستقر بنا لیا تھا۔ جب تک ہمایوں اپنی فوج کے ساتھ گجرات میں رہا، بہادر شاہ کو نہ یہ ہمت ہوئی نہ فرصت کہ کوئی بڑی فوج مرتب کر لیتا۔

---

[1] محمود آباد چمپانیر کا ریشم اور فولاد کی مصنوعات مشہور تھیں اور بڑودہ کے پچیس میل شمال میں اس شہر کے وسیع اور شاندار کھنڈروں میں اب بھی چند محلات و مساجد قابل دید ہیں (گزیٹیر جلد دہم صفحہ ۱۳۵)۔

باب

لیکن اہل گجرات دل سے اس کے طرفدار تھے۔ اکثر مسلمان سرداروں نے بھی اس کی رفاقت ترک نہیں کی تھی، اور نہ خود وہ مغلوں کی اطاعت پر آمادہ تھا۔ ایسی حالت میں ہمایوں نے ملک میں ایک گشت لگاکر جابجا اپنے حکام متعین کر دیئے، بایں ہمہ فتح کی تکمیل نہیں ہوئی اور بہادر شاہ کے بعض فوجی سردار جہاں سے موقع ملتا تھا خود مالگزاری وصول کر لیتے اور کبھی کبھی مغل سپاہ سے ان کی لڑائیاں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ ہمایوں نے اس چھیڑ چھاڑ کو چنداں وقعت نہیں دی اور غلطی سے دشمن کا اصلی ملک چھوڑ کر شاہ گجرات کے بیرونی مقبوضات کی فتح پر متوجہ ہوگیا۔ یعنی کنبایت وبروچ کے اضلاع لیتا ہوا خاندیس، اور مالوے آگیا جہاں کی آب وہوا اور مناظر اسے بہت پسند تھے۔

فرشتہ کی روایت کے بموجب اسی سفر میں بادشاہ کو شیر خاں سوری کی شورش وبغاوت کی اطلاع ملی اور اسی کے ساتھ معلوم ہوا کہ گجرات کے نئے مغل حکام کی باہمی مخالفت گجراتیوں کو دوبارہ چیرہ دست بنا رہی ہے۔ بادشاہ کی پہلی غلطی کو اس واقعے نے اور نمایاں کر دیا کہ احمد آباد کا حاکم یا گجرات کا صوبہ دار اس نے اپنے بھائی عسکری میرزا کو مقرر کیا۔ جو حکومت پاتے ہی اپنی خود مختار بادشاہی کے منصوبے سوچنے لگا تھا، لیکن ادھر تو جونپور کے لائق ومنتظم مغل صوبہ دار سلطان جنید برلاس کی وفات نے مشرقی دوآب اور بہار کے انتظامات میں ابتری پیدا کر دی تھی اور ادھر شیر خاں (سوری) کی سرداری میں افغان سرکشوں نے ازسرنو ہنگامہ برپا کر دیا۔ غرض ہمایوں کو گجرات کا خیال چھوڑ کر آگرے جانا پڑا کہ ممالک مشرقی کی بغاوت فرو کرنے کے لیے دوبارہ فوج کشی کا سامان کرے۔ مگر ابھی وہ آگرے نہیں پہنچا تھا کہ عسکری میرزا، کچھ مغل سرداروں کی مخالفت اور کچھ گجراتیوں کی جنگی چھیڑ چھاڑ سے تنگ آکر احمد آباد سے واپس چلا آیا اور یہ ملک جسے ہمایوں نے کافی دردسری اور ایک حد تک ذاتی جانبازی سے فتح کیا تھا چند مہینے کے اندر مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

شیر خاں کا عروج

مگر یہ محض اُن مصائب اور ناکامیوں کی ابتدا تھی جو ہمایوں کو عنقریب پیش آنے والی تھیں کیونکہ اس چند سال کے عرصے میں شیر خاں[1] افغان نے بہار میں بڑی قوت

[1] شیر خاں کا اصلی نام فرید خاں ہے اور اس کا خاندان سلاطین غور کی اولاد میں ہونے کا دعوی کرتا تھا۔

بھیم پہنچا لی تھی اور بنارس کو لوٹ کر چنار کے[۱] مستحکم اور با موقع قلعے پر قابض ہوگیا تھا۔
یہ غالباً ۹۳۹ھ ۱۵۳۳ء کا واقعہ ہے جبکہ مہم مالوہ و گجرات پیش آ جانے کی وجہ سے ہمایوں کو اس
طرف فوج کشی ملتوی کرنی پڑی اور شیر خاں نے بھی رسمی طور پر اطاعت کا عہدہ و پیمان کر کے
اسے فی الجملہ مطمئن کر دیا۔ پھر آیندہ تین چار سال تک اس کی حکومت بنگالہ سے لڑائیاں ہوتی
رہیں جس نے جلال خاں لوحانی کی حمایت میں زبردستی شیر خاں سے لڑائی مول لی تھی۔
بنگالے میں انھی دنوں نصرت شاہ کی وفات (۹۴۳ھ[۲] ۱۵۳۶ء) کے بعد وہاں کا ایک امیر سلطان محمود شاہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳) اول اول اس کا دادا ابراہیم سُور جو گھوڑوں کی سوداگری کرتا تھا ہندوستان میں
آکر بسا اور سکندر لودھی کے عہد میں اس کے باپ کو سہسرام کے ضلعے میں فوجی سردار کی حیثیت سے جاگیر
ملی جس کے لیے شیر خاں کا بہت دن تک سوتیلے بھائیوں سے جھگڑا ہوتا رہا جنگ پانی پت کے بعد وہ
کچھ عرصے تک بابر کی فوج میں بھی ملازم رہا لیکن بابر اس کی طرف سے بدگمان ہوگیا اور شیر خاں پھر
بہار چلا آیا جہاں ان دنوں دو افغاں سردار بادشاہی کے مدعی تھے ان میں سے ایک (یعنی سلطان
محمود بن سکندر لودھی) کی مغلوں نے قوت توڑ دی لیکن دوسرا (یعنی بہار خاں الملقب بہ سلطان محمد لوحانی)
ابھی تک جنوبی بہار کے ویران کوہستانی اضلاع میں خود مختاری کا دعویدار تھا۔ شیر خاں ان میں سے حسب
موقع کبھی ایک فریق کے ساتھ ہو جاتا تھا کبھی دوسرے کے حتیٰ کہ سلطان محمد نے وفات پائی اور اس کے
صغیر سن بیٹے کی طرف سے شیر خاں اس کی تمام فوج اور علاقے پر حاوی ہوگیا۔ شیر خاں کی سوانح کو مفصل
بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے تاریخ شیر شاہی (ترجمہ الیٹ جلد چہارم) اور منتخب التواریخ (صفحہ ۳۵۶
وغیرہ) میں یہ حالات بہ تفصیل موجود ہیں۔ ابوالفضل نے مغلوں کی طرفداری میں تصویر کا بُرا رُخ دکھایا ہے
(اکبر نامہ صفحہ ۱۴۸) اور فرشتہ نے اپنے طور پر ان سب تواریخ کا خلاصہ پیش کر دیا ہے (فرشتہ صفحہ ۲۲۰)
[۱] ۔ یہ قلعہ بنارس کے جنوب میں دریائے گنگا کے جنوبی کنارے پر واقع ہے اور اس زمانے میں جنگی
اعتبار سے بہار و بنگال کے راستے پر نہایت با موقع اور مستحکم مقام تھا اور کچھ عرصے بعد قلعۂ رہتاس کی
فتح نے (جو اس سے تقریباً پچھتر میل جنوب مشرق میں دریائے سون پر بہت مضبوط پہاڑی قلعہ ہے)
چنار کی جنگی اہمیت اور بھی بڑھا دی تھی۔
[۲] فرشتہ جلد دوم صفحہ ۳۰۲، مگر الفنسٹن کی تاریخ کے تتمے میں ۹۴۱ھ درج ہے (صفحہ ۴۸۷)
اور ریاض السلاطین میں اگرچہ ایک جگہ ۹۴۳ھ لکھا ہے (صفحہ ۱۳۸) لیکن دوسرے مقام پر تحریر ہے

باب ۱

کے نام سے سلطنت کا مالک بن گیا تھا اور قرینہ کہتا ہے کہ اس انقلاب نے بھی حکومت کی اندرونی قوت کمزور کر دی ہوگی۔ بہرحال حکومت بنگالہ سے جنگ میں شیر خاں کو نمایاں فتح حاصل ہوئی اور بہت سی توپیں اور جنگی ساز و سامان ہاتھ آگیا اور اب اس نے خود بنگالے پر فوج کشی کی اور سلطان محمود والی بنگالہ کو پائے تخت گور میں محصور کر لیا۔

مہمات بہار و بنگال

یہ وقت ہے جب کہ ہمایوں نے دوبارہ ممالک مشرقی کی فتح اور شیر خاں کی سرکوبی کے لیے جونپور کی جانب کوچ کیا۔ (صفر ۹۴۴ھ / ۱۵۳۷ء) مہم کا آغاز چنار کے محاصرے سے ہوا جہاں اس وقت شیر خاں کی طرف سے غازی خاں قلعے کا حاکم تھا محصورین بڑی جاں بازی سے لڑے مگر دریا کی طرف سے مغلوں کی توپوں نے وہ آگ برسائی کہ آخر کار مدافعت سے نا امید ہو گئے اور انھیں اطاعت قبول کرنی پڑی۔ لیکن اس ایک قلعے کی تسخیر ہی میں چھ مہینے صرف ہو گئے اور اس اثنا میں شیر خاں نے بنگالے کے بادشاہ کو پیہم شکستیں دے کر ملک سے نکال دیا اور خود گور پر قابض ہو گیا۔

سلطان محمود نے شکست کھا کر مغلوں کی پناہ لی اور ہمایوں کو آمادہ کیا کہ جہاں تک جلد ممکن ہو بنگالے پر حملہ کیا جائے چنانچہ ہمایوں نے ۹۴۵ھ / ۱۵۳۸ء کے شروع میں گور پر پیش قدمی کی۔ راستے کے پہاڑی دروں میں شیر خاں کے بیٹے نے شاہی ہراول کو روکا اور شکست دے کر پسپا کیا لیکن جب مغلوں کی پوری فوج وہاں آئی تو اس نے ہٹ کر جنوبی پہاڑیوں کی پناہ لی اور ہمایوں کو بنگالہ فتح کرنے کی ایسی جلدی تھی کہ قلعۂ رہتاس پر توجہ نہ کی اور آگے بڑھ گیا۔

ہمایوں کی غلطیاں

ابوالفضل کا بیان ہے کہ یہ قلعہ اس وقت ایک برہمن راجہ کے قبضے میں تھا۔ بہرصورت مغلوں کا اس طرف توجہ نہ کرنا فن جنگ کے لحاظ سے دور اندیشی کے خلاف تھا اور جب شیر خاں ہمایوں کے مقابلے سے بچ کر یہاں پہنچ گیا[۱] تو انھیں بہت جلد اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴) (صفحہ ۱۴۲) کہ اس نے پانچ سال تک بادشاہی کی جس سے شبہہ ہوتا ہے کہ شاید وہ ۹۴۰ھ میں ہی تخت نشین ہو گیا تھا۔

[۱] الفنسٹن کا قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قلعے پر مغلوں کی فوج کشی بنگالہ کے وقت شیر خاں کا

غلطی پر پشیماں ہونا پڑا۔ واضح رہے کہ شیر خاں نے بنگالے یا گور کی کوئی مدافعت نہیں کی بلکہ مغلوں کے ادھر بڑھتے ہی یہاں کا تمام مال غنیمت اور اپنی فوج لے کر غیر معروف پہاڑی راستوں سے بہار کی جنوب مغربی سمت میں آ گیا اور قلعۂ رہتاس پر قابض ہوتے ہی بنگالے کی بڑی شاہراہ گویا اس کی زد میں آ گئی۔

ہمایوں نے گور پہنچ کر بنگالے کا الحاق اپنی سلطنت سے کر لیا تھا لیکن ادھر تو کثرت بارش نے بنگالے میں آمد و رفت کے تمام راستے مسدود کر دیئے اور ادھر موسم کی مرطوب آب و ہوا سے مغلوں کی فوج میں طرح طرح کے امراض پھیل گئے۔ سب سے بڑی پریشانی یہ پیش آئی کہ ہندال مرزا نے جو منگھیر تک بادشاہ کے ساتھ آیا تھا آگرے واپس جا کر اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور گو اکثر مغل سردار اس کی غداری پر نفریں کرتے تھے اور لاہور سے کامران مرزا بھی بظاہر ہمایوں کی مدد کے لئے آگرے آ رہا تھا جس نے ہندال مرزا کو آلور کی طرف ہٹنے پر مجبور کیا۔ لیکن ان واقعات نے "ہندوستان خاص" کے اضلاع میں بھی اتنی ابتری ضرور پیدا کر دی کہ ہمایوں کو وہاں سے کسی فوجی کمک کے آنے کی امید نہیں رہی اور اسے معلوم ہو گیا کہ جب تک وہ خود آگرے نہ جائے معاملات روبراہ نہ ہوں گے۔

جنگ چوسہ ماہ صفر ۹۴۶ھ ۱۵۳۹ء

لیکن اس عرصے میں بادشاہ کی غفلت و بیکاری سے فائدہ اٹھا کر شیر خاں تمام مشرقی دوآب اور بہار پر قابض ہو گیا تھا۔ منگھیر سے قنوج تک گنگا کے دونوں طرف اور ہندوستان کے راستے کے ہر با موقع مقام اور قلعے میں اس کے فوجی دستے متعین تھے اور گور سے ہمایوں کی روانگی کے وقت وہ جونپور کا محاصرہ کر رہا تھا۔ بے شبہہ مغلوں کی پوری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵) قبضہ تھا۔ لیکن اکبر نامہ (صفحہ ۱۵۳) اور منتخب التواریخ (۳۴۹) میں صاف صاف تحریر ہے کہ اس قلعے پر شیر خاں نے بنگالے سے واپسی کے بعد دھوکے سے قبضہ کیا۔

۱؎ ابو الفضل کا بیان ہے کہ ہندال کی ماں نے بیٹے کو آلور سے بلا کر کامراں سے مصالحت کرا دی تھی اور پھر یہ دونوں بھائی ہمایوں کی مدد کے لیے شیر خاں سے لڑنے چلے تھے لیکن وقت پر نہ پہنچ سکے "از توفیق ایں خدمت دولت پیرائی نیافتند" (اکبر نامہ صفحہ ۱۵۶)

باب

فوج سے لڑنے کی ابھی تک افغانوں کو جرأت نہ تھی لیکن راستے کے تمام علاقوں سے مغل حکام کا اخراج اور دشمن کا قبضہ مغل سپاہ کی بے دلی اور مشکلات سفر میں اضافہ کرنے کے لیے کافی تھا اور جس وقت شیر خاں اپنے تمام دستے سمیٹ کر بنارس کی طرف سے مقابلے کے لیے بڑھا تو اکثر مغل سرداروں نے بادشاہ کو حملہ کرنے کی بجائے دفاعی مورچے بنانے کی صلاح دی اور معلوم ہوتا ہے ہمایوں بھی شیر خاں کے مصالحانہ پیام سلام اور کچھ اپنی بے سامانی دیکھ کر لڑ کر راستہ نکالنے کے ارادے سے باز آ گیا۔

اب مغلوں کا لشکر بھوجپور کے پرگنے میں موضع چوسہ کے قریب مقیم تھا جو آرہ سے پچاس میل مغرب میں گنگا کے کنارے واقع ہے اور دیگر دفاعی تدابیر کے ساتھ دریا میں کشتیاں بھی جمع کی جا رہی تھیں کہ اگر صلح نہ ہو سکے اور جنگ کا موقع بھی نہ ملے تو پل بنا کر گنگا کے دوسرے (شمالی) کنارے پر فوج کو ہٹا لیا جائے تاکہ وہ افغانوں کے حملے اور تعاقب سے ایک حد تک محفوظ ہو کر آگرے کا سفر جاری رکھ سکے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات نے تھکے ہارے مغلوں کی ہمت اور بھی پست کر دی اور جب شیر خاں نے دھوکے سے ایک دستہ فوج بھیج کر ناگہاں ان پر عقب سے حملہ کیا تو لڑائی کا شور ہوتے ہی ہر مغل سپاہی کو بھاگنے کی پڑ گئی اور اس وقت سامنے سے شیر خاں کی پوری فوج نمودار ہوئی جس نے مغلوں کو اور بھی بدحواس کر دیا اور ہزاروں آدمی دریا میں کود کر تلف ہو گئے۔ کیونکہ ہر شخص کو سلامتی صرف اس میں نظر آتی تھی کہ کسی طرح دریا کے پار ہو جائے اور پل ابھی تک پورا نہیں بنا تھا کہ اس تباہ کن فراری میں کچھ مدد مل جاتی۔

نتائج

مغلوں کی اس کامل شکست[1] نے شمالی ہند کے اکثر حصوں میں انقلاب پیدا

---

[1] ۔ فارسی تاریخوں میں اس لڑائی کے بہت سے چشم دید راویوں کی روایات محفوظ ہیں مگر ان کی جزئیات میں اختلاف ہے۔ مغلوں کے طرفدار مورخ شکست کی اصلی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ شیر خاں نے صلح کا عہد و پیمان کر لیا تھا اور کمال دغابازی سے دھوکا دے کر حملہ کیا۔ مولف شیر شاہی نے اس الزام کو دفع کرنے کی کوشش کی ہے لیکن تمام بیانات کو بغور پڑھنے سے اتنا تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس شکست میں دشمن کے فریب سے زیادہ خود مغل سپاہیوں کی بے سروسامانی اور پست ہمتی کا دخل تھا اور

کر دیا لڑائی کا ایک نتیجہ تو ظاہر تھا کہ بہار و بنگال میں اب شیر خاں کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ رہا اور ہمایوں نے گور کے مغل صوبہ دار کے پاس جو فوجیں چھوڑی تھیں وہ ایک ہی لڑائی کے بعد پراگندہ ہوگئیں اور وہاں سے مغل حکومت کا نشان مٹ گیا۔ نیز اسی فتح چوسہ کے بعد شیر خاں نے افغان امراکی اتفاق آراسے تاج شاہی سر پر رکھا اور شیر شاہ (سور) کے لقب سے اپنا خطبہ و سکہ جاری کیا۔ لیکن ان ظاہری نتائج کے علاوہ اس شکست نے ہر طرف مغلوں کے دشمن کھڑے کر دیئے اور دو آب نیز گنگا کے شمال میں جہاں کہیں افغان امراکی جاگیریں تھیں، وہاں ضلعے کے ضلعے اُن سے منحرف ہو گئے اور ایک سال کے اندر اندر قنوج و کالپی تک دو آب میں، اور شمال میں اودھ سے آگے موجودہ رہیل کھنڈ تک سارا علاقہ مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

تیسری فصل۔ مغلوں کا اخراج اور عہد شیر شاہی۔

فریقین کی حالت اور ارادے

اب جس نسبت سے مغلوں کی قوت گھٹ رہی تھی، اسی نسبت سے شیر شاہ کا زور بڑھ رہا تھا، وہ اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ جب تک دہلی اور آگرے میں ہمایوں جیسے اولوالعزم اور صاحب غیرت بادشاہ کی حکومت موجود ہے اسے ممالک مشرقی میں اطمینان سے حکومت نصیب نہ ہوگی۔ اور تاریخ شیر شاہی کے مؤلف کا یہ قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ انھی اندیشوں کی بنا پر اس نے صلح کا عہد و پیمان کرنے کے باوجود چوسہ پر مغلوں کو شکست دینے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ لڑائی میں کامیابی بھی نمایاں حاصل ہوئی اور لشکر گاہ کے ساتھ شاہی بیگمات تک نکلنے کا موقع نہ پاسکیں جنھیں شیر شاہ نے عزت و احترام سے چند روز بعد آگرے بھجوا دیا۔ لیکن اصلی حریف یعنی ہمایوں بادشاہ بچ کر نکل گیا اور ملکی خلفشار اور اندرونی نفاق کے باوجود دوبارہ جنگ کی تیاری میں مصروف تھا۔ لہٰذا شیر شاہ جیسا دور اندیش و مستعد سپہ سالار اگر چاہتا بھی کہ بہار و بنگال کے قبضے پر قناعت کرے تو یہ ارادہ مصلحت کے خلاف ہوتا اور اس کے معنی یہ ہوتے کہ ایک قوی دشمن کو اپنے استیصال کی فرصت دے دی جائے دوسرے شیر شاہ جیسا کہ ہم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰) سوء اتفاق سے اس رات کو طلائے کا مغل سردار بھی غافل ہوگیا کہ افغانوں کے عقب سے آکر ناگہانی حملے کی وقت پر اطلاع نہ ہوسکی۔

باب ۱

پڑھ چکے ہیں، ابتدا ہی سے تمام ہندوستان کو مغلوں سے صاف کرنے کی دھن میں تھا۔ پس بنگال و بہار پر تسلط ہوتے ہی اس نے اپنی فوجیں "ہندوستان خاص" میں پھیلا دیں اور دوآب و رہیل کھنڈ کے علاوہ مالوے کی طرف بھی ایک فوج روانہ کی جہاں اب مغلوں کی عملداری تھی۔

جنگ قنوج

مغل سرداروں کی بددلی اور ہمایوں کے بھائیوں کی نااتفاقی نے شیر شاہ کو اور دلیر کر دیا تھا لیکن خود ہمایوں جب سے آگرے آیا برابر فوجوں کی فراہمی اور انتقام لینے کی تیاری میں منہمک تھا۔ چنانچہ ہجری سال (۹۴۶ھ ۱۵۴۰ء) ختم ہونے سے پہلے اس نے سواروں کی بہت بڑی تعداد[1] جمع کر لی اور پھر دوآب کی طرف بڑھا کہ افغانوں کا استیصال کر دے۔

دوآب اور مالوے کی جانب جو شیر شاہی فوجیں بھیجی گئی تھیں، انھیں مغلوں نے شکست دی لیکن شیر شاہ کے پورے لشکر سے قنوج کے قریب مقابلہ ہوا اور گو مغلوں نے

[1] ابوالفضل تحریر کرتا ہے کہ بھائیوں کے نفاق نے جمعیت کو متفرق کر دیا تھا اور ہمایوں کے پاس کثیر التعداد دشمن کے مقابلے میں بہت کم فوج مہیا ہو سکی تھی (اکبر نامہ صفحہ ۱۶۲) اور یہ روایت قرین قیاس بھی ہوتی لیکن فرشتہ (صفحہ ۲۱۸) اور منتخب التواریخ (صفحہ ۳۵۴) دونوں کا بیان ہے کہ ہمایوں کے پاس دشمن کی جمعیت سے زیادہ (تقریباً ایک لاکھ سوار کی جمعیت تھی اور ان کی تائید میں سب سے وزنی شہادت حیدر میرزا (دوغلات) صاحب تاریخ رشیدی کی ہے جو بابر کا خالہ زاد بھائی اور اس جنگ میں ہمایوں کا مشیر کار تھا۔ اس شکست کے بعد ہمایوں کو کشمیر چل کر قسمت آزمائی کرنے کی صلاح دی تھی اور جب ہمایوں نے اس رائے سے فائدہ نہ اٹھایا، تو خود جا کر ملک کشمیر پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہاں کئی سال تک اس نے بڑی قابلیت کے ساتھ فرمانروائی کی اور ہمایوں کو بھی اس کی غریب الوطنی اور شکستہ حالی کے زمانے میں امداد کے وعدے پر کئی مرتبہ کشمیر بلایا گر ہمایوں نہ جا سکا۔ حیدر میرزا نے خوانین مغل اور امراے کاشغر کی نہایت فاضلانہ تاریخ (تاریخ رشیدی) اپنی یادگار چھوڑی ہے اور تھوڑے دن ہوئے اس کا انگریزی ترجمہ بھی شایع ہو گیا ہے۔ اصل فارسی تاریخ کا ایک قلمی نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے۔ کتاب میں ہندوستان کے بھی بعض چشم دید واقعات میرزا نے تحریر کیے ہیں اور ان کا خلاصہ الیٹ نے اپنی تاریخ میں شایع کر دیا ہے۔ (جلد پنجم صفحات ۱۲۷ تا ۱۳۵)

بہت مضبوط مورچے بنا لیئے تھے اور اُن کے پاس سات سو چھوٹی (۲½ سیر گولے کی) اور
اکیس بڑی (تقریباً ۲۵ سیر گولے کی) توپیں تھیں[1] مگر اول تو بعض نمک حرام سرداروں
نے اس نازک وقت میں ساتھ چھوڑنا شروع کیا دوسرے بارش نے لشکرگاہ میں رہنا
دشوار کر دیا کیونکہ وہ ایسی نشیبی جائے میں تھا کہ خیموں میں پانی بھر آیا۔ غرض جب مغل سردار
بادلِ ناخواستہ لڑنے کے لیئے نکلے تو دشمن کا سامنا ہوتے ہی اُن کے غلام اور نوکروں میں
گھبراہٹ پیدا ہوئی اور میمنہ کی فوجیں، جن کی طرف خود شیر شاہ حملے کے لیئے بڑھا تھا،
لڑائی کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ بھاگ بھاگ کر منتشر یا قلب کی جانب پسپا ہونے لگیں!
ایسی لڑائی کا جو نتیجہ نکلنا تھا، وہ ظاہر ہے۔ مغلوں کے صرف چند دستے ایسے تھے جو تھوڑی
دیر جم کر لڑے ورنہ ساری فوج میں ابتری پھیل گئی اور شروع ہی سے ترتیب میں ایسا خلل
آیا کہ پھر لڑائی کسی کے سنبھالے نہ سنبھلی اور مغلوں کو کامل ہزیمت ہوگئی۔ (محرم ۹۴۷ھ / ۱۵۴۰ء)

مغلوں کا اخراج

ہمایوں اس میدان سے بچ کر نکل گیا۔ لیکن اب آگرے یا دہلی میں ٹھیرنا
دشوار تھا۔ فتحمند افغانی فوجیں تعاقب میں آرہی تھیں۔ مغل حکام اور سردار ہر طرف سے
سمٹ کر پنجاب میں آنے لگے اور لاہور میں ان پناہ گزینوں کی اس قدر کثرت ہوئی کہ رہنے
کے لیے مکان میسر نہ آتا تھا[2] مگر باہمی نفاق اور بے سروسامانی و پست ہمتی کی وجہ سے
یہاں بھی دشمن کی مزاحمت یا مقابلے کی کوئی تیاری نہ ہوسکی۔ دوسرے شیر شاہ نے
شکست خوردہ مغلوں کا تعاقب نہ چھوڑا تھا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ مغلوں سے ملک خالی
کرا لینے کا اس سے بہتر کوئی موقع نہ ملے گا لہذا آگرے میں تھوڑی دیر ٹھیر کر وہ پھر لاہور
پر بڑھا اور اس کی آمد آمد کا غلغلہ سن کر مغل فوجیں کابل و کشمیر کی طرف پراگندہ ہوگئیں
خود میرزا کامراں جس نے ہمایوں کی مروت سے فائدہ اٹھا کر پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا

۱۔ ان کی "پرتاب" کے متعلق کسی قدر شبہ ہے۔ بابر نے اپنی بڑی توپوں کی مار سولہ سو قدم تک
بیان کی ہے مگر صاحب تاریخ رشیدی نے لکھا ہے کہ ہمایوں کے ساتھ کی یہ بڑی توپیں "ایک
فرسخ" یعنی تین میل سے بھی زیادہ دور تک مارتی تھیں (تاریخ رشیدی، حالات جنگ قنوج
الیٹ جلد پنجم صفحہ ۱۳۱۔ نیز دیکھو لین پول کی کتاب "بابر" حاشیہ صفحہ ۱۶۱ وغیرہ)
۲۔ تاریخ رشیدی۔

باب

اب کمال بزدلی سے ان دعاوی سے دست بردار ہوگیا اور بھائی کو اس پریشاں حالی میں چھوڑ کر کابل چل دیا۔ دوسرے بھائیوں نے بھی اسی کی پیروی کی۔ لیکن شیر دل ہمایوں کی ہمت پست نہیں ہوئی ناکامیاں اس کی شجاعت و شرافت کے جوہر کو چمکا رہی تھیں اور اس بے سروسامانی میں بھی بابر کے خلف الرشید کو ہندوستان کی تاجداری کا دعویٰ تھا اور اب (رجب ۹۴۷ھ) وہ چند رفیقوں کے ہمراہ جنوبی سندھ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ وہاں کے حاکم (شاہ حسین ارغون) سے مدد لے کر گجرات پر حملہ کرے اور دوبارہ شیر شاہ کے ساتھ تیغ آزمائی کی قوت بہم پہنچائے!

شیر شاہ کے اوصاف

ہمایوں کو ان منصوبوں میں پیہم ناکامی ہوئی جن کا اجمالی ذکر آگے آئے گا۔ تسلسل تاریخی کے لحاظ سے یہاں ہمیں اس کے فتحمند حریف کے حالات پر ایک نظر ڈالنی چاہئے جو اب دریائے جہلم سے دریائے برہم پتر تک تمام شمالی ہند کا فرماں روا ہوگیا تھا۔

اس اعتبار سے کہ ادنیٰ رتبے سے ترقی کر کے تخت شاہی تک پہنچا، **شیر شاہ** (سور) اس بادشاہی سلسلے کی آخری کڑی ہے جس کا سر حلقہ سلطان **قطب الدین** (ایبک) تھا کیونکہ اس کے بعد کسی غیر شاہی خاندان کے آدمی کو ہندوستان کی فرماں روائی کرنی نصیب نہ ہوئی اور یہی ایک واقعہ شیر شاہ کی غیر معمولی قابلیت کے ثبوت میں کافی ہے۔ لیکن جب ہم اس بات کو یاد کرتے ہیں کہ شیر شاہ کو محض بہار و بنگال کے افغان بادشاہوں سے ہی لڑنا نہیں پڑا بلکہ اس نے مغلوں کی وسیع سلطنت کا مقابلہ کیا اور ان کی جمی جمائی قوت کو بزور بازو اکھاڑ دیا تو قدرتی طور پر ہمارے دل میں اس کی عظمت سوا ہو جاتی ہے اور مغلوں کے طرفدار مورخ اس کی کیسی ہی ناقدری کریں، تمام واقعات کو پڑھ کر چاروناچار سہسرام کے اس افغان سپاہی کا نام ہند کے شاہان اعظم کی فہرست میں درج کرنا پڑتا ہے۔

(۱) عالی حوصلگی اور فرض شناسی

خوش قسمتی سے اس کے حالات کا مطالعہ کرنے کے لیے ہمارے پاس تاریخی مصالحہ

۱؎ طبقات اکبری اور تاریخ فرشتہ کے علاوہ منتخب التواریخ میں شیر شاہ کے حالات کافی صحت و تحقیقات کے ساتھ تحریر ہیں اور فاضل مؤلف نے جابجا چشم دید اور ثقہ راویوں کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن اس کے اوصاف اور کاموں کو سب سے زیادہ واضح طریق پر عباس خاں صاحب تاریخ شیر شاہی نے تحریر کیا ہے۔ مورخ

باب ۱

موجود ہے اور اس کے زمانے کی معتبر شہادتوں کی بنا پر ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ شیرشاہ محض ایک "فتنہ سرشت خداع منش" لٹیرا نہ تھا جیسا کہ ابوالفضل نے اسے دکھانے کی کوشش کی ہے بلکہ نہایت عالی حوصلہ اور فرض شناس بادشاہ گزرا ہے جو اپنے رتبۂ جلیلہ کی ذمہ داریوں کو بخوبی پہچانتا تھا۔ تاریخ شیرشاہی کے مؤلف نے اس کے روزانہ مشاغل کا وضاحت سے ذکر کیا ہے جن کے مقررہ اوقات سفر و حضر کسی حالت میں نہ بدلتے تھے۔ مذہبی فرائض و عبادات کے علاوہ اس کا زیادہ وقت ملکی انتظامات اور لوگوں کی دادرسی میں صرف ہوتا تھا اور وہ اس اصول کو خوب سمجھتا تھا کہ دنیا میں رتبۂ عالی کے اہل درحقیقت وہ لوگ ہیں جو زیادہ سے زیادہ محنت و ذمہ داری کے کام انجام دینے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ اس کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہی محنت کشی اور مستعدی تھی اور بادشاہ ہونے کے بعد بھی اس میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ کہنا چاہیئے کہ مرتے دم تک وہ اسی طرح مستعد اور سرگرم کار رہا۔[۱]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱) شیرشاہ کا دل سے مداح ہے لیکن اس کی مدح محض قومی طرفداری پر مبنی نہیں اور نہ اس نے شاعرانہ مبالغے سے کام لیا ہے بلکہ اپنی تاریخ میں بہت سے ایسے واقعات اور دلچسپ حالات جمع کر دیے ہیں جو اس تفصیل و تحقیق سے اور کسی نے نہیں لکھے۔ جیسا کہ ہم ایک حاشیے میں لکھ چکے ہیں اس کتاب کا اصلی نسخہ ہمارے سامنے نہیں مگر الیٹ کے انگریزی ترجمے کی خوبی ان حواشی سے بڑھ گئی ہے جن کا اس تاریخ کی روایات کی تائید میں "واقعات مشتاقی" اور "تاریخ داؤدی" وغیرہ دوسری تاریخ کے حوالے سے مترجم نے جابجا اضافہ کر دیا ہے (الیٹ جلد چہارم صفحات ۳۰۱ تا ۴۳۴) ان سب کے سوا ہمارا ایک ماخذ ایڈورڈ ٹامس کی کتاب (کرانکلز اوف دی پٹھان کنگز) ہے جس نے عہد شیرشاہ کی تواریخ اور سکوں سے کمال محنت و تحقیقات کے ساتھ نہایت محققانہ اور حیرت انگیز تاریخی نتائج نکالے ہیں (صفحات ۳۹۲ تا ۴۱۰)۔

[۱] چنانچہ جب محاصرۂ کالنجر کے دوران میں، ایک آتشبازی کے لٹو سے شیرشاہ کے کپڑوں میں آگ لگ کر جابجا سے بدن جل گیا اور اسے خیمے میں اٹھا کر لائے تو اسی تکلیف و سوزش کی حالت میں "ہرگاہ کہ اندکے بحال می آمد فریاد و بر مردم زدہ، ترغیب برگرفتن قلعہ می نمود و ہر کس کہ بدیدن (یعنی یہ عیادت) ادمی آمد اشارت بجنگ می کرد........" عالت جاں کنی میں بادشاہ کی اس حیرت انگیز توجہ نے پیاہیوں

باب
قوم پرستی

لیکن اس زمانے کے مذاق کے، مطابق شیر شاہ کا سب سے نمایاں وصف وہ قوم پرستی ہے جس کے والہانہ جوش میں اس نے جان کی بازی لگا دی تھی۔ اپنے ہم قوم افغانوں کی جنگی اور انتظامی برتری کے ثبوت میں جب تقریروں سے کام نہ چلا تو اس نے طاقتور مغلوں کے خلاف تلوار علم کی اور شاید اسی جذبۂ قوم پرستی کا طفیل تھا کہ اس نے جو کچھ کہا تھا آخر سچ کر دکھایا۔

ہندی افغانوں کی ہزیمت خوردہ قوم کو دوبارہ آزاد و حکمراں بنانے کے واسطے سب سے دشوار و اہم کام یہ تھا کہ ان کے باہمی نفاق کو دور کیا جائے جس نے ہر افغانی خاندان کی قوت منتشر کر رکھی تھی۔ اس میں شیر شاہ کی سعی مشکور ہوئی۔ افغان لوگ نہ صرف آپس کی مخالفت سے باز آئے بلکہ نہایت منتظم اور طاقتور قوم بن گئے اور حق یہ ہے کہ اس قومی خدمت پر شیر شاہ جس قدر ناز کرتا بجا تھا چنانچہ قنوج کی جنگ کے نازک موقع پر اس نے افغانی سرداروں کے سامنے ایک جوش انگیز تقریر کی اور انھیں یاد دلایا کہ مجھ سے جہاں تک ممکن تھا میں نے تم کو متحد و فراہم کرنے کی کوشش کی اور مل کر جنگ کرنے کے قاعدے سکھائے اور یہ سب کچھ کوشش و تدبیر آج کے دن کے واسطے تھی۔ اب وہ آزمائش کا وقت آگیا۔ اور آج مجھے دیکھنا ہے کہ تم میں سے کون کون سا بہادر میدان میں شجاعت کے جوہر دکھاتا اور ہر چشموں پر بازی لے جاتا ہے ...."[1] جواب میں سرداروں نے اس کے احسانات کا اعتراف اور اطاعت و جاں نثاری کا اقرار کیا اور اپنے اپنے ماتحت دستوں میں اسی قومی جوش جنگ کی روح پھونک دی۔

ہندی افغانوں کے مجمل حالات

یہ سب اس وقت کی باتیں ہیں جب کہ ایک دشمن قوی سے مقابلہ درپیش تھا۔ لیکن جب ان قومی خدمات کے صلے میں خدا نے اسے دنیا کے سب سے بڑے ہمعصر سلاطین میں شامل ہونے کا شرف دیا تو گویا حب قومی کے اظہار کا بہترین موقع مل گیا اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲) میں عجیب جوش پیدا کر دیا اور انھوں نے ایسا جان توڑ کر حملہ کیا کہ کالنجر جیسا مضبوط قلعہ چند گھنٹے میں فتح ہو گیا۔ نوید فتح سن کر شیر شاہ نے اطمینان سے جان دی اور مرتے مرتے سپاہیانہ ادائے فرض اور عزم دلیرانہ کی یہ ولولہ خیز مثال یادگار چھوڑ گیا۔

[1] تاریخ شیر شاہی مترجمہ الیٹ جلد چہارم صفحہ ۳۸۱۔

اس نے ہندی اور نیز خالص افغانوں پر بڑی بڑی نوازشیں کیں۔ واضح رہے کہ افغانستان کے جنگجو سپاہیوں کی ہمیشہ سے ہندوستان میں قدر کی جاتی تھی حتیٰ کہ مسلمانوں کی فتوحات ہند کے وقت بعض ہندو ریاستوں میں بھی افغان سپاہیوں کے ملازم ہونے کا سراغ ملتا ہے۔ پھر جب دہلی میں اسلامی سلطنت قایم ہوئی تو قدرتی طور پر بہت سے افغانی مسلمان سوداگری یا ملازمت کے لیے ہندوستان میں آنے لگے اور ان کے بعض خاندان پنجاب و دوآب کے اقطاع میں آباد ہوگئے۔ مغل حملہ آوروں کے ساتھ بھی کہیں کہیں افغانوں کی آمد کا ذکر آتا ہے۔ مگر انھیں ہندوستان میں سب سے پہلے عروج اس وقت حاصل ہوا جب کہ ان ہی کے ایک ہمقوم **بہلول** لودھی نے تخت دہلی پر قبضہ کرکے شمالی ہند میں خاصی وسیع سلطنت قایم کرلی اور بڑے بڑے عہدے اور بہت سی جاگیریں دے کر صدہا تازہ ولایت افغانوں کو ملک میں جابجا آباد کردیا۔ یہی جاگیردار تھے جو لودھیوں کی مرکزی حکومت مٹنے کے بعد بھی بابر و ہمایوں سے سالہا سال تک لڑتے رہے اور بہت سی ناکامیاں اٹھانے کے باوجود آخر کار انھوں نے شیر شاہ کی سرکردگی میں مغلوں کو نکال کر ایک مرتبہ پھر اپنی حکومت قایم کرلی۔

یہ نیا افغان بادشاہ بہلول لودھی سے کہیں زیادہ حب قومی کا جذبہ رکھتا تھا اور قدرت نے سلطنت بھی اسے زیادہ وسیع عطا کی تھی پس ہر افغان زادے کو جو اپنی وطنی زبان (پشتو) میں بے تکلف شیر شاہ سے گفتگو کرسکتا تھا[1] سپہ گری کی معمولی قابلیت دیکھ کر حکومت کی طرف سے معقول مناصب وجاگیر مل جاتی تھی اور یہ فیاضی اس قدر عام تھی کہ مولف تاریخ شیر شاہی کے الفاظ میں "روہ اور ہندوستان کا کوئی افغان باشندہ اس کے عہد حکومت میں نادار و محتاج نہ رہا بلکہ سب خوشحال اور امیر ہوگئے تھے"[2]

سیاسی مصالح

"روہ" اس علاقے کو کہتے تھے جو دریائے سندھ سے کابل تک اور چترال سے

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ کو اپنی وطنی زبان سے خاص محبت تھی اور وہ افغانوں سے بالعموم اسی زبان میں گفتگو کرتا تھا (تاریخ شیر شاہی، الیٹ جلد چہارم صفحہ ۴۱۳)

[2] الیٹ، جلد چہارم صفحہ ۴۲۴۔

باب

موجودہ وزیرستان تک پھیلا ہوا ہے اور جس کا بیشتر حصہ آج کل "صوبہ سرحدی" میں داخل ہے۔ شیر شاہ کا خاندان ہندوستان آنے سے پہلے اسی "روہ" کے جنوبی اضلاع کا رہنے والا تھا اور یوں بھی یہ علاقہ ہمیشہ سے افغانوں کے اکثر مشہور و ذی اثر قبائل کا مسکن رہا ہے، لیکن قومی ہمدردی کے علاوہ ہندوستان کے اس ہوشمند بادشاہ کا اہل روہ کے ساتھ اس قدر فیاضی کرنا مصلحت سے خالی نہ تھا۔ کیونکہ گو ہمایوں دو سال تک سرگرداں پھرنے کے بعد ۹۵۰ھ (۱۵۴۲ء) (ماہ ربیع الثانی) میں ہندوستان کے حدود سے نکل گیا تھا، تاہم کابل و قندھار میں مغلوں کی حکومت تھی اور ادھر حیدر میرزا (دوغلات) نے کشمیر فتح کر کے (۹۴۷ھ ۱۵۴۱ء) پنجاب کے شمال میں اس قوم کا ایک نیا مرکز بنا لیا تھا۔ خود شمال مغربی ہند میں جہلم کے پار میدانی اضلاع پر مغل سردار دخیل تھے اور شیر شاہ کو دوسرے کاموں سے اتنی فرصت نہ تھی کہ وسیع پیمانے پر فوجی مہم بھیج کر ان مغلوں کے اخراج کی کوشش کرتا۔ نظر بریں روہ کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانا گویا دشمن کے راستے میں اپنے حلیف مہیا کر لینا تھا اور یہ اسی قسم کی حکمت عملی تھی جس کی بنا پر آج تک ہندوستان کی انگریزی حکومت افغانوں کے سرحدی قبائل کے ساتھ غیر معمولی مراعات کرتی رہتی ہے۔

جنگی انتظامات

ظاہر ہے کہ سلطنت کی اصلی قوت خود اس کی فوج اور جنگی ساز و سامان پر منحصر ہے اور شیر شاہ اس فرض کی طرف سے کسی طرح غافل نہ ہو سکتا تھا۔ مگر حق یہ ہے کہ اس نے چار پانچ سال کے اندر سلطنت ہند کی جنگی قوت کو جس مرتبے پر پہنچا دیا، اس کی نظیر ملنی دشوار ہے۔ اس کی فوج میں تقریباً پانچ ہزار (جنگی) ہاتھی، ڈیڑھ لاکھ سوار اور پچیس ہزار پیادہ سپاہی تھے۔ لیکن ہاتھیوں پر بھروسا کرنے کا اب زمانہ نہیں رہا تھا اور شیر شاہی افواج کے متعدد جیوش جدید ترین آلات حرب یعنی توپ و تفنگ سے مسلح تھے۔ تاریخ شیر شاہی نے صراحۃً چوبیس ہزار تفنگچیوں کی تعداد بتائی ہے جو مختلف چھاؤنیوں اور قلعوں میں متعین تھے[1]۔

[1] یہ اور ذیل کے واقعات، تاریخ شیر شاہی مترجمۂ ایلیٹ کے آخری حصے (صفحات ۴۰۹ تا ۴۲۳) سے ماخوذ ہیں اور ان کی مترجم کے حواشی نیز دیگر فارسی تواریخ سے ایک حد تک تائید ہوتی ہے۔

باب

پائے تخت کی خاص شاہی افواج کو چھوڑ کر سب سے بڑی اور قوی فوجیں پنجاب کی سرحدوں پر تھیں جو شمال مغرب کے خطرناک حریفوں کا پرانا راستہ ہے لیکن اس وقت کابل وکشمیر میں مغلوں کے جنگی مرکز ہونے کی وجہ سے، (نیز شمال مغربی پنجاب کے کھوکھروں پر نظر رکھنے کے واسطے جو کسی حد تک مغلوں کے طرفدار تھے) شیرشاہ شمالی پنجاب کے وفاعی انتظامات کو ملتان و دیپال پور کی چھاؤنیوں سے زیادہ اہم سمجھتا تھا اور لاہور و پشاور کا راستہ محفوظ رکھنے کے لئے جو تدابیر اس نے اختیار کی تھیں وہی اس کی جنگی اور انتظامی قابلیت کا نہایت عمدہ ثبوت ہیں۔

قلعۂ رہتاس (پنجاب)

عین اس مقام پر جہاں دریائے جہلم کشمیر کے جنوبی پہاڑوں سے نکل کر پنجاب کے میدانوں میں داخل ہوتا ہے، اور جس کے متصل قصبۂ جہلم آباد ہے، کشمیر و کابل سے ہندوستان آنے کے راستے مل گئے ہیں۔ جنگی ضروریات کے اعتبار سے ملک پنجاب کا سب سے اہم یہی مقام ہے اور یہیں راجہ پورس نے سکندر (مقدونی) کو دریا عبور کرنے سے روکا تھا۔ اگرچہ ہمیں اس بارے میں بہت کم حالات معلوم ہیں۔ لیکن پہلے راجہ یا بعد کے اسلامی سلاطین کبھی اس "ناکے" کو کافی مستحکم نہیں بنا سکے جس کا ایک سبب یہاں کی نیم وحشی آبادی کی شورہ پشتی اور علاقے کی کم آبادی کو سمجھنا چاہئے۔ مغل سلاطین کے عہد میں، جو کشمیر و کابل پر بھی حکمراں تھے، یا آج کل جب کہ ہندوستان کی مغربی سرحد کوہستان سلیمان قرار دی گئی ہے، اور کشمیر بھی انگریزوں کے زیر اثر ہے، مذکورۂ بالا مقام کی جنگی اہمیت باقی نہیں رہی۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، مغلوں کے تسلط سے قبل ہندوستان کی وفاعی ضروریات بالکل دوسری تھیں اور جہاں تک تاریخی شواہد محفوظ ہیں، بلبن کے بعد شیرشاہ دوسرا بادشاہ ہے جس نے ہندوستان کے جنگی مسائل کو نہایت عمدہ طریق پر سمجھا اور ملکی حفاظت کی بہترین تدابیر اختیار کیں چنانچہ اسی مقام پر دریائے جہلم کے پار اس نے ایک نہایت وسیع و مستحکم قلعہ بنایا جس کی فصیلیں دس گز چوڑے آثار کی پندرہ سولہ گز تک بلند تھیں! قلعے کا محیط یا دورڈھائی میل اور اس میں اڑتیس برج اور بارہ عالیشان وسنگین دروازے تھے مقامی آبادی کی شورش وعداوت کی وجہ سے مزدوروں کو غالباً دور دور سے لانا پڑا جس کی بدولت خرچ کی میزان اور بھی زیادہ ہوگئی تھی[1] اس جنگی حصار کو

---

[1] گزے ٹیر، جلد اکیس صفحہ ۳۲۲۔ اس کتاب میں مصارف تعمیر کا تخمینہ چالیس لاکھ روپے (سکۂ رائج الوقت)

باب

شیر شاہ نے اپنے بہار کے عزیز قلعے کے نام پر "رہتاس نو" موسوم کیا تھا اور یہیں اس کا سب سے لائق سپہ سالار ہیبت خاں "ہمایون اعظم" کے پر معنی خطاب کے ساتھ متعین تھا۔

سرحدی افواج

ہیبت خاں کے ماتحت (لشکر شاہی کو مستثنیٰ کر کے) سب سے بڑی فوج اسی نئے قلعے اور گرد و نواح کی چھاؤنیوں میں رہتی تھی اور اس میں تیس ہزار چیدہ جنگی سوار شامل تھے۔ اس کے عقب میں سپہ سالار حمید خاں نے موجودہ سیالکوٹ سے کانگڑے کے ضلع تک پہاڑی قلعوں کا ایک جال تیار کر دیا تھا اور کسی پہاڑی رئیس یا قبیلے کی مجال نہ تھی کہ سرکاری مطالبات ادا کرنے سے انکار کر سکے۔ جنوب میں ملتان اور دیپالپور پنجاب کے قدیم جنگی مرکز تھے اور یہاں ہر قسم کی فوری ضروریات کے لئے شیر شاہ نے بہت کچھ ساز و سامان اور فاضل روپیہ جمع کرا دیا تھا۔ گجرات کو وہ اپنی سلطنت میں شامل نہیں کر سکا لیکن راجپوتانہ اور مالوے کے تمام مشہور قلعے اس کے قبضے میں تھے اور اس جنوبی سرحد کا سب سے بڑا جنگی مرکز اس نے چتوڑ اور مانڈو کو بنا دیا تھا۔

ملکی نظم و نسق اور مالگزاری بندوبست

دوآب اور شرقی ممالک پر کسی بیرونی دشمن کے حملے کا اندیشہ نہ تھا۔ لیکن مردم شناس بادشاہ کو ملکی نظم و نسق کے واسطے بھی اکثر عہدہ دار نہایت لائق و منتظم ملے تھے جنھوں نے چند ہی سال میں احکام شاہی کے مطابق مزروعہ زمینوں کی پیمائش اور تشخیص مالگزاری کا دشوار کام تکمیل کو پہنچا دیا اور شمالی ہند کے تمام صوبوں میں بندوبست کے یکساں اصول اور ضوابط مروج ہو گئے۔ واضح رہے کہ اس قسم کی باقاعدہ پیمائشیں بعض خلجی اور تغلق بادشاہوں کے زمانے میں بھی کی گئی تھیں لیکن ان کا دائرہ محدود تھا اور اسی طرح گو "لامرکزیت" کے زمانے میں مالگزاری اور بندوبست کے آئین و قوانین میں بہت سی اصلاحات اور ترقیاں عمل میں آئی تھیں باایں ہمہ شیر شاہ شمالی ہندوستان کا پہلا بادشاہ ہے جس نے بہت وسیع اور ہمہ گیر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶) کیا ہے۔ "تاریخ داؤدی" میں اس کتبے کے حوالے سے جو صدر دروازے پر کندہ تھا کل مصارف "آٹھ کرور پانچ لاکھ دام" لکھے ہیں (الیٹ، جلد چہارم حاشیہ صفحہ ۴۱۹) جس کے شیر شاہی یا قدیم سکے میں تقریباً سوا اکیس لاکھ روپے ہوئے اور یہ اس زمانۂ ارزانی میں جب کہ روپے کی قوت خرید کہیں زیادہ تھی، بہت بڑی رقم ہے۔

پیمانے پر اپنی سلطنت کے ایک ایک گاؤں کی پیمائش کرائی اور اسی لیے تاریخ شیر شاہی کا یہ بیان کہ "اس سے پہلے زمین کی پیمائش کا یہ طریقہ رائج نہ تھا" بے بنیاد نہیں ہے۔ اسی طرح مالگزاری کے واسطے صوبے کی "سرکاروں" میں اور ہر سرکار کی "پرگنوں" میں تقسیم اور مالگزاری کے مخصوص عامل، خزانچی، شقدار، کارکن وغیرہ عہدہ داروں کا تقرر دراصل اکثر عہد شیر شاہی کی وہ اصلاحات ہیں جنھیں ابوالفضل کی تحریروں سے مغالطہ کھا کر اس زمانے کے تاریخ نویسوں نے اکبر بادشاہ سے منسوب کر دیا ہے۔

عام نتائج

شیر شاہ کی ان اقتصادی اصلاحات خصوصاً اصلاح سکہ، نیز محکمۂ عدالت اور ڈاک کی تنظیم کے متعلق ہمیں آئندہ ابواب میں پھر کچھ لکھنے کا موقع ملے گا۔ ان حالات کو اجمالی طور پر یہاں بیان کرنے سے صرف یہ تاریخی نتیجہ نکالنا منظور ہے کہ شیر شاہ کا ہمایوں پر غلبہ، ہندی مسلمانوں کی محض ایک ہنگامی کامیابی نہ تھا بلکہ درحقیقت اس کا عہد حکومت شمالی ہندوستان میں ایک بہت بڑے سیاسی انقلاب اور اس شہرۂ آفاق سلطنت کا افتتاح کرتا ہے جو آئندہ مغل بادشاہوں سے انتساب اور مزید رونق و ترقی حاصل کرنے والی تھی۔ لیکن عہد اکبری کی شان و شوکت یا دربار جہانگیری کے جاہ و احتشام کے دلکش قصوں کو پڑھتے وقت ہمیں یہ نکتہ نہ بھولنا چاہیے کہ بابر و ہمایوں باں ہمہ اوصاف و قابلیت تیرہ چودہ برس کے عرصے میں سلطنت کے اندر وہ استقلال اور نظم و نسق نہ پیدا کر سکے جو سہسرام کے ایک افغان سپاہی زادے نے پانچ سال کے اندر پیدا کر دیا تھا[1] اور نیز یہ کہ نوجوان اکبر کی آئندہ شہرت و کامیابی کی ایک بڑی وجہ

[1] صاحب تاریخ شیر شاہی نے اپنے ممدوح کے حالات کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے کہ "اس نے تھوڑے ہی عرصے میں ملک پر تسلط بھی حاصل کیا اور اسی فرصت قلیل میں راستوں کی حفاظت، سپاہ و رعایا کی خوشحالی اور سلطنت کے نظم و نسق کے (مفصل) آئین مہیا کر گیا" اس جامع تعریف کی تائید میں اڈورڈ ٹامس کا خلاصۂ تحقیقات پیش کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا جو شیر شاہ کے اوصاف حکمرانی کا ہمایوں سے مقابلہ کر کے اور قابل ترجیح قرار دے کر لکھتے ہیں کہ "جس طرح شیر شاہی سکوں کی کثرت اس کی سلطنت کے استقلال و وسعت کا ثبوت ہے اسی طرح اُن (کے مختلف اور بعید مقامات میں ہاتھ آنے) سے جو معلومات اخذ ہوتے ہیں اس کی بنا پر ہم وثوق کے ساتھ

باب

یہی ہے کہ وہ دور لامرکزیت کے لودھیوں کے بعد نہیں آیا بلکہ "عہد تجدید شہنشاہی" کے شیر شاہی سلاطین کا وارث ہوا!

خاندان شیر شاہی

لیکن شیر شاہ کے انتقال (۹۵۲ھ ۱۵۴۵ء) اور شاہ ایران کی فوجی مدد سے ہمایوں کے دوبارہ کابل پر مسلط ہونے کے بعد بھی کئی سال تک مغلوں کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی جہاں اب شیر شاہ کا بیٹا جلال خاں اپنے بڑے بھائی کو کچھ مصالحت سے اور کچھ زبردستی ہٹا کر سلطان سلیم شاہ (یا اسلام شاہ) کے لقب سے بادشاہ ہوگیا تھا۔ اسے انتظامی قابلیت اور مستعدی اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی اور کم سے کم اُن آئین وضوابط کو جو شیر شاہ نافذ کر گیا تھا، جاری رکھنے کی لیاقت رکھتا تھا، گور سے رہتاس تک ایک بڑی شاہ راہ شیر شاہ کے عہد میں صاف اور آباد کرائی گئی تھی اور اس کے ہر دوسرے میل پر بادشاہ موصوف نے پختہ سرائیں بنوا دی تھیں جن میں ہر مذہب وملت کے محتاج مسافروں کی سرکار کی جانب سے مہمانی کی جاتی تھی۔ سلیم شاہ نے نہ صرف ان کی مرمت کی اور دیگر مصارف بحال رکھے بلکہ حکم دیا کہ ہر دو سراؤں کے بیچ میں ایک ایک سرا اس کی طرف سے اور تعمیر کرا دی جائے[1]۔ غور کیجئے تو یہ فیاضی "شاہانہ اسراف" میں داخل تھی اور دیگر واقعات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکپن معمولی حالت میں گزارنے اور باپ کی سپاہیانہ تربیت پانے کے باوجود اسلیم شاہ اُن عیوب سے خالی نہ تھا جو موروثی بادشاہوں کی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں۔ ممالک عالم کی ہر ایک تاریخ اور اخبار حاضرہ برابر فریاد کر رہے ہیں کہ بادشاہوں کو بلکہ ہر شخص کو ایسی مطلق العنانی جس میں خالق کائنات یا کم سے کم بنی نوع کے محاسبے کا خوف باقی نہ رہے، ہمیشہ خود پرستی اور ظلم وشقاوت کے راستے پر ڈال دیتی ہے اور بعض اوقات ایسے ایسے افعال کا ارتکاب کراتی ہے جو بالکل مجنونانہ نظر آتے ہیں۔ پس اسلیم شاہ کے دیگر متکبرانہ احکام کے ضمن میں جب ہم یہ پڑھتے ہیں تو کچھ حیرت نہیں ہوتی کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸) کہہ سکتے ہیں کہ شیر شاہ کا اپنی رعایا پر تسلط واثر بھی غیر معمولی تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔" (کرانیکلز، صفحہ ۴۰۴)۔

[1] منتخب التواریخ صفحہ ۳۸۴۔

ہر ولایت (یا سرکار؟) کے مستقر پر جمعے کے دن تمام شاہی عہدہ دار اور امرا جمع ہوتے تھے اور ایک بلند شامیانے میں کرسی پر سلطان اسلیم شاہ کی جوتی رکھ کر اس کے روبرو سر جھکاتے تھے اور "بہ ادب تمام ہر کدام بجائیگاہِ متعین می نشستند۔ و دبیرے می آمد و آں حکمنامہ (یعنی مجموعۂ قوانین شاہی) راکہ بمقدار ہشتاد جزو کاغذ بود کہ بایش مبوب و مفصل می خواند و ہر مسئلہ کہ اشکال می داشت بجمیع شقوق و انواع دراں می یافتند و بہ عمل در می آوردند....."[1]

امرا کی شورش و نا اتفاقی

اسلیم شاہ کی روز افزوں رعونت اور عیش پسندی کی بعض اور مثالیں بھی محفوظ ہیں اور گو بادشاہ کی ان بدعنوانیوں کا عام لوگوں پر اول اول زیادہ اثر نہیں پڑا، تاہم درباری امرا بیزار ہونے لگے اور جب ایک بغاوت میں سرحدی پنجاب کے نامی سپہ سالار ہیبت خاں نے بھی شرکت کی تو چند روز کے لئے اسلیم شاہ کی حکومت کی خیر نظر نہ آتی تھی لیکن کچھ اس کی جنگی مستعدی اور زیادہ تر باغی امیروں کی باہمی نا اتفاقی کی وجہ سے یہ خطرہ دفع ہو گیا اور دو شکستیں کھا کر اہل سازش کی قوت ٹوٹ گئی مگر ان واقعات نے ایک طرف تو سرحد کے سب سے اہم مقام کے دفاعی انتظامات میں خلل ڈالا اور ادھر بادشاہ کے غرور و خود داری میں ترقی ہو گئی۔ اس نے بعض بڑے بڑے عہدوں پر ادنیٰ درجے کے لوگوں کو متقرر کرنا شروع کیا جس کی وجہ سے دربار میں نئی نئی سازشیں، فرقہ بندیاں اور نا اتفاقیاں پیدا ہونے لگیں حتیٰ کہ ۹۶۱ھ / ۱۵۵۴ء میں اسلیم شاہ کا انتقال ہوتے ہی[2] افغانی قوت کا جسے شیر شاہ نے اس محنت و قابلیت سے متحد کیا تھا،

---

[1] منتخب التواریخ ۱/۳۸۵ مولف کتاب لکھتے ہیں کہ یہ رسم بچپن میں مجھے بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اسلیم شاہ کے آخری زمانے تک جاری رہی۔

[2] اسی سال سلطان محمود شاہ گجرات اور نظام الملک شاہ احمد نگر (دکن) کا انتقال ہوا تھا چنانچہ میر نعمت اللہ (رشوتی) کا ایک قطعۂ تاریخ مشہور ہے جس کا آخری شعر یہ ہے کہ:-

زمن تاریخ فوت ایں سہ خسرو ✽ چہ می پرسی "زوال خسرواں" بود!

یہ لکھنا خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ ابو الفضل نے جا بجا سخت مذمتوں کے بعد آخر میں شیر شاہ اور اسلیم شاہ کی سب سے بڑی داد یہ دی ہے کہ "الحق ایں پدر و پسر در انتظام اسباب روزگار سلیقۂ موافق داشتند۔ حیف کہ در حرام نمکی و کافر نعمتی زندگانی خود را پدرود کردند۔ اگر ایں دو کس از ملازمانِ عتبۂ علیہ.. (یعنی ہمایوں)) بودہ، خدمت بارگاہِ معلّی بہ پدر مفوض می شد و اہتمام سرحلہا

شیرازہ بکھر گیا اور جا بجا سلطنت و خود مختاری کے مدعی خروج کرنے لگے۔ ان کی یہ باہمی کشاکش جاری ہی تھی کہ ہمایوں جو ایسے موقع کی تاک میں تھا، کابل سے بڑھا اور معمولی جنگ کے بعد قلعۂ رہتاس پر قابض ہو گیا (۹۶۲ھ / ۱۵۵۴ء)۔ سرحد پنجاب کی سب سے بڑی چھاؤنی ہاتھ آگئی تو لاہور لینے میں کوئی مزاحمت نہ پیش آئی اور یہاں چند روز ٹھیر کر اس نے ستلج تک ملک پنجاب پر دوبارہ مغلوں کا تسلط قائم کر لیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱) بہ پسر او نامزدی بود ...."۔!!

ع۱۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ اسلیم شاہ کے بعد جب افغانوں میں نزاع و خانہ جنگی بپا ہوئی تو دہلی اور آگرے کے بعض لوگوں نے ہمایوں کو عرضیاں بھیجیں کہ ہندوستان پر فوج کشی کا اس سے بہتر وقت نہ ملیگا پھر بھی وہ آخر تک حملہ کرنے میں متردد رہا کیونکہ ہندی افغانوں کی کثیر فوجوں کے مقابلے میں وہ کابل میں پندرہ ہزار سوار سے زیادہ مہیا نہ کر سکا تھا۔

سلطنت مغلیہ کا استقلال

پہلی فصل ۔ فتوحات ممالک

(۱) پنجاب

پنجاب کے لینے میں مغلوں کو اس لئے آسانی ہوئی کہ وہاں کا افغانی صوبہ دار **احمد خاں** جو شیر شاہی خاندان سے تھا، اسلیم شاہ کے بعد خانہ جنگی میں حصہ لینے آگرے کی طرف چلا آیا اور اپنی تمام فوجی قوت کے ساتھ سلطنت کے دوسرے حریفوں سے مصروف جنگ تھا، واضح رہے کہ تخت کا اصلی وارث اسلیم شاہ کا بیٹا **فیروز** تھا لیکن اس کے ماموں **مبارز خاں** نے اسے قتل کر کے سلطنت غصب کر لی اور بیچواٹے برعکس نہند نام زنگی "کافور" سلطان **محمد عادل** کے لقب سے اب دوسرے حریفوں کے ساتھ بہار و دوآب کے علاقوں میں کشمکش کر رہا تھا۔ مگر وہاں اسے **پوری طرح کامیابی نہ ہوئی** تھی کہ پائے تخت آگرے پر ایک نئے حریف نے قبضہ کر لیا جسے احمد خاں نے پنجاب سے آکر شکست دی اور خود **سکندر شاہ** کے لقب سے اپنی بادشاہی کا اعلان کرا دیا (۹۶۲ھ ۱۵۵۴ء)

افغانی فوجوں نے صرف دیالپور کی چھاؤنی کے قریب مغلوں کی کچھ مزاحمت کی تھی لیکن جب احمد خاں یعنی خاندان سور کے نئے بادشاہ (**سکندر شاہ**) کو مغلوں کے پنجاب پر

باب ۲

تسلط کی اطلاع ملی تو بلا تاخیر خود نہ آسکا اور صرف تیس ہزار سوار کے ساتھ دوسرے افغان سرداروں کو اس لئے روانہ کیا کہ مغلوں کو پنجاب سے نکال دیں یا کم سے کم آگے بڑھنے سے روک لیں ؛ اس فوج کو ہمایوں کے مشہور سردار بیرم یا بیرام خان نے جالندھر کے علاقے میں پراگندہ کر دیا اور مغلوں کو اتنی فرصت مل گئی کہ انھوں نے دریائے ستلج کے شمال وجنوب میں دہلی سے پنجاب آنے کے راستے پر جا بجا قلعہ بندی کر لی اور آخر جب سکندر پوری فوج لے کر ادھر بڑھا تو اسے اتنے دن تک روکے رکھا کہ ہمایوں لاہور سے اپنی تمام سپاہ لے کر آ گیا اور سرہند کے قریب ایک بڑی لڑائی میں سکندر کو شکست دی[1] (سنہ ۹۶۲ھ ۱۵۵۴ء)

سکندر دہلی کی جانب ہٹنے کے بجائے ہمالیہ کے پہاڑوں کی طرف نکل گیا اور انھی پہاڑی راستوں سے مانکوٹ[2] پہنچ کر عرصے تک شمالی پنجاب میں مغل حکام کو دق کرتا رہا حتی کہ جلوس اکبری کے دوسرے سال خود بادشاہ نے اس پر فوج کشی کی اور مذکورۂ بالا قلعہ میں

ع۱۔ ان لڑائیوں کے حالات ہمعصر تاریخوں میں تفصیل سے درج ہیں۔ لیکن بعض ایسے ضروری جزئیات چھوٹ گئے ہیں یا ان میں اختلاف رہ گیا ہے کہ فریقین کے جارحانہ اور مدافعانہ ارادوں کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چلتا۔ اور سرہند پر سکندر کی شکست کی ظاہری وجوہ بھی کافی وضاحت سے نہیں بتائی گئیں کیونکہ یہ مسلمہ ہے کہ ان کی اسی ہزار فوج مغلوں کی کابل اور پنجاب سے تازہ فراہم کی ہوئی فوج سے تعداد میں زیادہ تھی اور قریب قریب وہ تمام توپ و تفنگ اور جنگی ساز و سامان اس کے قبضے میں تھا جسے شیر شاہ اور سلیم شاہ نے اسی دن کے لیے پنجاب میں فراہم کیا تھا اور جس کی بدولت خود اس نے پہلے اپنے خاندانی حریفوں کو مغلوب کیا اور پھر جنگ سرہند کے بعد بھی مانکوٹ میں قلعہ بند ہو کر عرصے تک مغلوں کا مقابلہ کرتا رہا۔

ع۲۔ سیالکوٹ کے قریب کشمیر و پنجاب کے فاصل کوہستان کے دامن میں یہ مضبوط قلعہ سلیم شاہ نے تعمیر کیا تھا اور اصل میں اسی سلسلۂ استحکامات میں شامل تھا جسے دگکھڑوں کی تادیب اور سرحد کی حفاظت کے لئے شیر شاہ نے "رہتاس نو" سے کانگڑے کی حدود تک تیار کیا تھا۔ اور چار چھوٹے چھوٹے پہاڑی قلعوں کو کمال سلیقے کے ساتھ ایک حصار میں شامل کر کے اس قلعے کو اس قدر محفوظ کر دیا گیا تھا کہ بعض اوقات سلیم شاہ مانکوٹ کو لاہور کے بجائے پنجاب کا صدر مقام بنانے کا خیال ظاہر کرتا تھا (اکبرنامہ جلد اول صفحہ ۳۳۶، جلد دوم صفحہ ۵۰ و ۵۱ وغیرہ)

باب ۲

اسے گھیر لیا۔ پھر چھ مہینے کے محاصرے کے بعد اس شرط پر کہ اسے صحیح سلامت بنگال جانے دیا جائے، سکندر نے پنجاب میں افغانوں کا یہ آخری جنگی مرکز مغلوں کے حوالے کر دیا۔

(۲) دہلی و آگرہ

لیکن یہ کچھ عرصے بعد کے واقعات ہیں۔ ورنہ شروع میں جنگ سرہند اور سکندر کی پہاڑوں میں پسپائی سے فقط یہ فائدہ ہوا کہ دہلی، آگرہ اور نواح کے اضلاع پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ اور گو اس کامیابی سے ہندوستان میں خاندان تیموری کے دن پھرنے کی فال نکلتی تھی لیکن خود ہمایوں بادشاہ کے گزشتہ مصائب کی پوری تلافی ابھی نہ ہوئی تھی کہ اس نے بالاخانے سے اتفاقیہ گر کر وفات پائی (ربیع الاول ۹۶۳ھ ۱۵۵۶ء) اور اس کا بڑا بیٹا **جلال الدین اکبر** وارث تخت و تاج ہوا۔

اکبر کی تخت نشینی

یہ شہزادہ جو ہمایوں کی سخت پریشاں حالی کے زمانے میں **امرکوٹ** (سندھ) میں پیدا ہوا تھا (رجب ۹۴۹ھ مطابق نومبر ۱۵۴۲ء) ہندوستان کے ان معرکوں میں باپ کے ساتھ، اور اس کی وفات کے وقت سکندر سے لڑنے شمالی پنجاب کی طرف بھیجا گیا تھا۔ وہیں اسے (کلانور ضلع گرداسپور کے مقام پر) مغل سرداروں نے ہمایوں کا جانشین تسلیم کیا اور سپہ سالار **بیرام خاں** نے "اتالیق و وکیل سلطنت" کی حیثیت سے انتظامات کی باگ اپنے ہاتھ میں لی (ربیع الثانی ۹۶۳ھ مطابق فروری ۱۵۵۶ء) کیونکہ خود اکبر کی عمر قمری حساب سے ابھی پورے چودہ برس کی بھی نہ تھی۔

جنگ پانی پت

اس اثنا میں سکندر کو پنجاب کے میدانی اضلاع سے مغلوں نے دفع کر دیا تھا اور کچھ عرصے بعد کثرت بارش کی وجہ سے بھی بادشاہی فوجیں جنوب میں جالندھر چلی آئی تھیں۔ وہیں اطلاع ملی کہ وراثت شیر شاہی کے اصلی مدعی **عادل شاہ** نے خانہ جنگی سے فرصت پائی اور اس کا وزیر ہیمو[1] جابجا افغان باغیوں کو شکست دینے کے بعد اپنی پوری قوت سے مغلوں کے مقابلے کے لئے بڑھا اور مختلف اضلاع کے

[1] ہیمو کی شکل و شمائل کی تضحیک میں ابوالفضل نے اپنی فلسفیانہ انشا پردازی کا پورا زور صرف کر دیا ہے (اکبر نامہ، صفحہ ۳۳۷) اور یہ صحیح ہے کہ وہ ریواڑی (نواح دہلی) کا ایک بد صورت اور ذات کا دھوسر بنیا تھا۔ اسلیم شاہ نے قدیم افغانی سرداروں کا زور توڑ کر جب نئے لوگوں کو بڑے بڑے عہدے دیئے، جیسا کہ ہم پچھلی فصل میں بیان کر چکے ہیں، تو انہی میں لشکر شاہی کا یہ بقال بھی پہلے

مغل سرداروں کو ہٹاتا ہوا دہلی پہنچ گیا جہاں حاکم شہر تردی بیگ کی ماتحتی میں گرد و نواح کی اکثر مغل فوجوں نے جمع ہو کر اس سے شکست کھائی اور "ہندوستان خاص" کا یہ ٹکڑا جس میں آگرہ اور دہلی جیسے مشہور شہر واقع ہیں، ایک مرتبہ پھر مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

شکست خوردہ مغل سردار دریائے ستلج تک ہٹ آئے اور اس ناکامی اور نیز ہیمو کی کثرت فوج کی خبروں نے خود اکبری لشکر میں انتشار پیدا کر دیا۔ یہ خبریں کچھ غلط نہ تھیں لیکن اول تو ہیمو میں ذاتی بہادری کے سوا سپہ سالاری کی اتنی قابلیت نہ تھی کہ بیرام خاں، خان زماں خاں، سکندر خاں (ازبک) جیسے جہاندیدہ و فن حرب کے ماہروں کا مقابلہ کر سکتا دوسرے معلوم ہوتا ہے گزشتہ کامیابی کے غرور نے بھی اس کا دماغ بگاڑ دیا اور اس نے "راجہ بکرماجیت" کا لقب اختیار کر کے بعض ایسی حرکتیں کیں[۱] کہ ہمراہی افغان اس کی طرف سے بدگمان ہو گئے کہ اگر مغلوں کے مقابلے میں ہیمو کو فتح ہوئی تو کیا عجب ہے کہ وہ عادل شاہ کی برائے نام اطاعت سے بھی منحرف ہو جائے۔ کیونکہ اسی مہم کے روانہ ہوتے وقت یہ بادشاہ مشرقی علاقوں کی نگہداشت کے لئے چنار کے قلعے میں ٹھیر گیا تھا اور مغربی علاقوں کے تمام ملکی اور فوجی انتظامات اس نے اپنے ڈھوسر وزیر کے حوالے کر دیے تھے۔ پس ہمعصر مورخ کا یہ فقرہ محض لطیفہ نہیں بلکہ صحیح حالات کا پتہ دیتا ہے کہ "افغانان بسکہ از محکمات او (یعنی ہیمو) بجاں آمدہ بودند زوال او را از خدا می خواستند و بزبان حال و مقال نِعْمَ الانقلاب ولو علینا را می خواندند"[۲]۔

نتیجۂ جنگ

ایسے بیدل سپاہیوں اور بے تدبیر سپہ سالار کا جو کچھ حشر ہونا تھا، وہ ظاہر ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴) بازار کا شحنہ (یا منتظم) اور پھر بادشاہ کا مصاحب خاص بن گیا۔ عمل شناسی، عام انتظامی قابلیت اور نیز دلیری کے علاوہ اس کے رسوخ و ترقی مدارج کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہوئی کہ بے حد مالدار تھا اور خاندان شیر شاہی کی خانہ جنگی کے زمانے میں عادل شاہ کے تمام ملکی اور مالی انتظامات اس کے قبضے میں آگئے تھے۔ (اکبر نامہ۔ نیز ملاحظہ ہو منتخب التواریخ صفحہ ۳۸۹)

[۱] اس کی مختلف تاریخوں میں جابجا مثالیں ملتی ہیں (منتخب التواریخ صفحہ ۴۳۰، جلد دوم صفحہ ۳ اور غیرہ نیز دیکھو اکبر نامہ جلد دوم صفحات ۳۰ و ۳۱۔ طبقات اکبری وغیرہ وغیرہ)

[۲] منتخب التواریخ۔ جلد دوم صفحہ ۱۵

ہیمو نے پہلی ہی نادانی تو یہ کی کہ اپنا توپ خانہ اتنی کم جمعیت کے ساتھ پانی پت بھیج دیا کہ مغلوں کے ہراول نے تیزی سے ایک منزل آگے بڑھ کر اس پر قبضہ کر لیا اور افغانی فوج اس کی کارگر امداد سے محروم ہو گئی۔ ادھر جب ہیمو (غالباً یہ خبر سن کر) جلد سے جلد پانی پت کے کے میدان میں پہنچا تو ازبک تیرانداز بازووں پر اس طرح آ گرے جس طرح یک بیک چاروں طرف سے بھڑیں آ کر لپٹ جاتی ہیں۔ تیراندازی میں انھیں کمال حاصل تھا اور مل کر اتنی جلد اور صحیح تیر چلاتے تھے کہ دشمن کی پیوستہ صفوں کا قدم بڑھانا دشوار ہو جاتا تھا۔ پانی پت کی اس (دوسری) جنگ میں بھی انھی ازبکوں کی حیرت انگیز اور قیامت خیز تیراندازی کی بدولت نہ صرف دشمن کا خوفناک حملہ رک گیا بلکہ ہیمو کے جنگی ہاتھی زخمی ہو کر قابو سے باہر ہو گئے اور انھوں نے خود اپنی فوج کی صفوں میں ہل چل ڈال دی۔ سپاہی پہلے ہی سے مذبذب تھے، ہیمو کے زخم کھا کر بیہوش ہوتے ہی بھاگ نکلے اور اس "بکرماجیت ثانی" کا سارا تزک و احتشام چند گھنٹے کے اندر خاک میں مل گیا[۱] (محرم ۹۶۴ھ ۱۵۵۶ء)

اس لڑائی کا فوری نتیجہ تو یہ تھا کہ مغلوں کا پھر دہلی اور آگرے پر قبضہ ہو گیا لیکن چند سال کے تجربے نے بتا دیا کہ درحقیقت ہیمو کی یہی ہزیمت شمالی ہند میں ہندی افغانوں کے خاتمۂ اقتدار کی مرادف تھی[۲] جس کے بعد پھر ان علاقوں میں وہ کبھی مغلوں کے مقابل کوئی بڑی فوج فراہم و متحد نہ کر سکے تین ہی سال کے اندر اندر ان کی قوت پھر ممالک مشرقی میں سمٹ آئی اور اودھ و جونپور تک دونوں دوآبوں پر مغلوں کا تسلط ہو گیا۔

ح[۱] ہیمو گرفتار ہو کر، اور افغان سپہ سالار شادی خاں میدان جنگ میں مارا گیا۔ ہیمو کی بیوی تمام مال و خزانہ ہاتھیوں پر لاد کر بھاگی تھی لیکن راستے میں جابجا گنواروں نے لوٹا اور کچھ حصہ تعاقب کرنے والے مغلوں کے ہاتھ پڑا باقی زیادہ تر ادھر ادھر جنگلوں میں برباد ہو گیا۔ (منتخب التواریخ جلد دوم صفحہ ۱۷)

ح[۲] اسی جنگ پانی پت کے کچھ عرصے بعد ہیمو کا آقا محمد عادل بھی جو خانہ جنگی کے خوف سے خود چنار میں مقیم تھا بنگالے کے افغانوں سے ساتھ جنگ کرتے میں مارا گیا۔ اس کے حالات میں ہمعصر مورخوں نے سوائے اس کے اور کوئی قابل تحسین دیادگار بات نہیں لکھی کہ وہ فن موسیقی میں یگانۂ روزگار مانا جاتا تھا اور تانسین اور بہادر جیسے بے نظیر استاد اس کی شاگردی کے معترف تھے۔ (منتخب التواریخ ۴۳۳)

(۳) مالوہ

بایں ہمہ ملک مالوہ پر ابھی تک قبیلۂ سور کا قبضہ تھا اور گزشتہ خانہ جنگی کے دوران میں وہاں کے موروثی حاکم **باز بہادر** بن شجاعت نے اپنی خود مختاری کا باضابطہ اعلان کر دیا تھا (۹۶۳ھ / ۱۵۵۵ء) جانباز سپاہ اور دولت و مال کی بھی اس کے پاس کمی نہ تھی کیونکہ پچھلی دو صدیوں میں اس علاقے میں جابجا اسلامی چھاؤنیاں اور بستیاں آباد ہو گئی تھیں اور خود مالوے کا اپنا پایۂ تخت **سارنگ پور** تھوڑے دن میں وسط ہند کا نہایت بارونق شہر بن گیا تھا[1] لیکن باز بہادر کی عیش پرستی اور عاشق مزاجی ضرب المثل ہے۔ اجمیر بیانہ اور گوالیار پر مغلوں کا تصرف سن کر اس نے کوئی اعتنا نہ کی تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ شہر اس کی حدود سے باہر تھے۔ لیکن ۹۶۸ھ (۱۵۶۰ء) میں مغل فوجیں اس کے علاقے میں داخل ہو گئیں تو بھی وہ محفل رقص و سرود سے اس وقت اٹھا جب کہ مغل سپہ سالار **ادہم خاں** سارنگ پور کے قریب پہنچ چکا تھا۔ لڑائی کا جو کچھ نتیجہ ہونا تھا وہ ظاہر ہے لیکن دو مرتبہ شکست کھا کر بھی باز خاں نے ہمت نہ ہاری اور آئندہ سال خاندیس کے فاروقی بادشاہ (میراں مبارک شاہ) کی مدد سے پھر مغل حکام کو شکست دے کر مالوے پر قابض ہو گیا مگر یہ عارضی کامیابی تھی اور جس وقت اکبر کا مشہور سردار **عبد اللہ خاں** ازبک دوبارہ مالوے میں آیا تو باز بہادر اس کے مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور کئی سال تک مختلف ممالک ہند میں سرگرداں پھرنے کے بعد آخر کار اکبر کی سلک ملازمت میں منسلک ہو گیا[2]۔

اندرونی فسادات

لیکن عہد اکبری کے آئندہ سات آٹھ برس میں کئی بار اندرونی فساد اور سیاسی تغیر ہوئے اور گو ان کی وجہ سے دیگر ممالک ہند کی فتح میں تاخیر واقع ہوئی لیکن مفسدوں کے مقابلے میں نوجوان بادشاہ کی پیہم کامیابی نے اس کی ذاتی شہرت و قوت کو بہت بڑھا دیا۔ اور سب سے اول اس نے **بیرام خاں** کے اثر سے آزادی حاصل کی جس کی سخت گیری نے اکثر اہل دربار کو ہراساں کر رکھا تھا۔

ماتحتوں پر اس تشدد کے علاوہ جو بعض اوقات بادشاہ اور اہل دربار کو ناگوار گزرتا تھا

---

[1] یہ زوال پذیر شہراب دیواس (مالوہ) کی ریاست میں داخل ہے اور اس کے کھنڈر اور نیز بعض قدیم صنعتوں کے بچے کھچے کارخانے سارنگ پور کے گزشتہ تمدن کی یادگار رہیں۔ گزٹیر جلد ۲۲ صفحہ ۹۶)

[2] عام فارسی تاریخوں کے علاوہ خاص باز بہادر کے حالات کے لیے دیکھو مآثر الامرا (جلد اول صفحات ۳۸۷ تا ۳۹۰)

اب اکبر اپنے اتالیق کے ذاتی اقتدار سے بھی غالباً رشک کرنے لگا تھا اور اسی لیے جب اس کی اَنّا ماہم انگہ" اور انّا کے بعض رشتہ داروں نے بیرام خاں کی شکایتیں کیں تو نوجوان اکبر علانیہ بیرام خاں سے ناراض ہوگیا اور پھر اس نے ہر چند استمالت و معذرت کی مگر بادشاہ رضامند نہ ہوا۔ آخر بیرام خاں کو نظر آگیا کہ اب دربار اکبری میں اس کا وہ رسوخ و اقتدار کسی طرح قائم نہیں رہ سکتا جو سالہا سال کی رفاقت و جانبازی کا ثمرہ تھا۔ اس کی وفاداری بادشاہ سے علانیہ بغاوت کی بھی اجازت نہ دیتی تھی لہذا اوّل اوّل اس نے مالوے یا بنگالے پر بطور خود فوج کشی کرنے کا منصوبہ سوچا کہ ان میں سے کسی کو فتح کرکے آزادانہ حکومت کی بنیاد ڈالے۔ لیکن جب اس کا معتوب ہونا سن کر بہت سے ماتحت سردار برگشتہ ہو گئے اور ان ارادوں میں کامیابی کی امید نہ رہی تو اس کی سپاہیانہ غیرت نے زوال قوت و ذلت پر ہجرت کو ترجیح دی اور وہ حجاز کے ارادے سے گجرات کی جانب روانہ ہو چکا تھا کہ پھر بادشاہ کی بدگمانی اور بعض بیجا مطالبات[۱] نے اسے اندیشہ مند کر دیا اور جب اکبر کی طرف سے بیرام خاں کا قدیم دشمن ملا پیر محمد تعاقب میں بھیجا گیا تو اسے گجرات کا سفر بھی مخدوش نظر آیا اور وہ راجپوتانے سے جنوبی پنجاب کے علاقے میں چلا آیا جہاں جا بجا اس کے آور دہ حکمراں تھے۔ برے وقت میں ان لوگوں نے احسان فراموشی کی اور ادھر جالندھر کے قریب بادشاہی فوجوں نے گھیر کر اس کی رہی سہی جمعیت پراگندہ کر دی۔ ان مصائب نے آخر کار خوددار بیرام خاں کا سر خم کرا دیا اور گو اکبر نے اس کی درخواست پر اسے معافی دے دی تھی لیکن وہ ہندوستان میں نہ ٹھیرا اور بادشاہ کی اجازت سے پھر بہ ارادۂ حج گجرات روانہ ہو گیا[۲]۔

---

[۱] بیرام خاں سے وزارت و وکالت کے ماہی مراتب واپس لینے کے بعد یہ مطالبہ بھی کیا گیا تھا کہ وہ اپنے بعض مفسد رفیقوں کو بادشاہ کے حوالے کر دے (ملاحظہ ہو فرمان اکبری منقول در اکبر نامہ جلد دوم صفحہ ۱۰۶)

[۲] ان واقعات کو سب سے بہتر و مستند طریق پر ملا عبد القادر نے تحریر کیا ہے۔ (جلد دوم صفحات ۳۶ تا ۴۴) اور تمام روایات اور جزئیات کو بغور پڑھنے کے بعد راقم الحروف کے نزدیک ابوالفضل وغیرہ مورخین کا جا بجا بیرام خاں کو ابتدا سے نمک حرامی اور فتنہ پردازی کا مجرم بنانا ثابت نہیں

باب ۷
"بادشاہ کی بے بسی"

بیرام خاں شہر پٹن (گجرات) تک پہنچا تھا کہ بعض افغانوں نے ذاتی کاوش کی بناپر اسے دھوکے سے قتل کر دیا (۹۶۸ھ - ۱۵۶۱ء) لیکن نوجوان بادشاہ کے وہ مشیر بھی جو بیرام کی معزولی اور مصائب کا باعث ہوئے اور جنھوں نے چند روز اس انقلاب سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا، زیادہ عرصے تک سرسبز نہ رہ سکے اور آئندہ دو سال میں شمس الدین اتکہ، ادہم خاں اور ماہم انگہ تینوں کا باہمی عداوت اور قتل و علالت نے خاتمہ کر دیا (۹۷۰ھ - ۱۵۶۲ء) اور اکبر نے جس کی عمر اب بیس سال سے تجاوز کر چکی تھی صحیح معنی میں زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ بایں ہمہ معلوم ہوتا ہے کہ بیرام خاں اور ادہم خاں کیساتھ جو کچھ معاملہ گزرا تھا وہ بھی عہد ہمایوں کے بعض سرداروں کو نوجوان اکبر سے مرعوب کرنے کے لیے کافی نہ تھا اور وہ درحقیقت اس کے شہنشاہانہ مزاج کو اچھی طرح سمجھ نہ سکے تھے جس کی وجہ محض اکبر کی نوعمری اور ناخواندگی نہ تھی بلکہ یہ کہ وہ طبعاً فیاض اور حلیم تھا۔ دوسرے ہمایوں کی گزشتہ ناکامی اور شکستہ حالی کے قصے ابھی تک تازہ تھے اور وہ سردار جو دوبارہ اس کے ساتھ ہندوستان آئے اس بات کو نہ بھولے تھے کہ انھی کی محنت و جانبازی کے طفیل ہندوستان کی چھنی ہوئی سلطنت خاندان تیموریہ کے ہاتھ آئی ہے۔ غرض یہ اور دیگر اسباب ایسے جمع ہو گئے کہ اکبر کو ابتدا میں قدیم سرداروں پر اپنا رعب قایم کرنے میں بہت دشواریاں پیش آئیں حالانکہ اپنی فطری رواداری اور نرمی کے باوجود وہ شاہانہ امتیاز اور مطلق العنانی کا دلدادہ تھا جس کے اسباب و علل پر ہم آئندہ گفتگو کریں گے۔ یہاں صرف اس تصادم کی اصلی وجوہ بیان کرنی مقصود ہیں جو نئے بادشاہ اور اس کے امرا میں ہونا ناگزیر تھا اور جس کا آخری اور سب سے خطرناک ظہور ازبکوں کے فساد میں ہوا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸) نہیں ہوتا۔ بے شبہہ اول اول عہدۂ اتالیقی کو جو ہمایوں کی طرف سے اسے ملا تھا وہ محض اکبر کے حکم سے چھوڑنے میں تامل کر رہا تھا اور غالباً یہ چاہتا تھا کہ کم سے کم ہندوستان سے رخصت ہونے تک اسے معزول نہ سمجھا جائے لیکن جب اکبر نے یہ رعایت جائز نہ رکھی تو اس وقت غصے میں اس نے پنجاب آکر اس قسم کی گروہ بندی کرنی چاہی کہ ممکن ہو تو بادشاہ کو بزور اپنی "وکالت" تسلیم کرادی جائے اور ہمارے خیال میں اپنے تربیت دادہ سترہ سال کے لڑکے کے مقابلے میں اس کی یہ کوشش بھی "بغاوت" کے لفظ سے بہ مشکل موسوم کی جاسکتی ہے۔

ازبک سرداروں کی شورش

یہ منچلے سپاہی اگرچہ نسلاً مغلوں کے ہم نسل تھے لیکن اپنے مشہور سردار شیبانی خاں کے زمانے سے بالکل علیحدہ قوم سمجھے جانے لگے تھے اور تیموری خاندان کے بادشاہوں کو انھیں کے پیہم حملوں نے ماوراء النہر سے مار کر نکال دیا تھا۔ لیکن اس قومی دشمنی کے باوجود کچھ عرصے بعد ان کے بعض گروہ تیموریوں کی افواج میں بھرتی ہونے لگے تھے، دراصل اس زمانے میں جنگ و جدال سپاہی پیشہ لوگوں کا معمولی مشغلہ تھا اور مختلف بادشاہوں یا قوموں کی لڑائیاں قریب قریب اسی دلچسپی سے دیکھی جاتی تھیں، جیسے آج کل ہاکی یا فٹ بال کے بعض مقابلے۔ لہذا ان جنگی معرکوں میں اگرچہ فریقین وقت کے وقت ایک دوسرے کے قتل کرنے میں کمی نہ کرتے تھے، لیکن لڑائی کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد ان کی "دشمنی" بھی غائب ہو جاتی تھی اور بارہا ایک فوج کے بعض گروہ پہلے سردار کی رفاقت چھوڑ کر اس کے حریف کی ملازمت اختیار کر لیتے تھے۔

القصہ مغلوں کے ہندوستان میں آنے کے وقت بہت سے اُزبک سپاہی بھی شمشیر آزمائی کے شوق میں بابر و ہمایوں کے ہمراہ ہو گئے۔ اور حق یہ ہے کہ اس دوسری آمد کے موقع پر مغلوں کی کامیابی زیادہ تر اسی قوم کی سعی و جانفشانی کا نتیجہ تھی، اور نہ صرف جنگ پانی پت کے وقت، بلکہ دوآب و جونپور میں بھی ازبک سرداروں نے سوری افغانوں کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا تھا چنانچہ زیر نظر سنین میں مشرقی صوبوں میں اکثر سرحدی چھاؤنیوں پر اسی قوم کے سپہ سالار متعین اور بہار کے افغان رئیسوں سے مصروف جنگ و جدال تھے اور جیسا کہ ہم اوپر پڑھ چکے ہیں مالوے کو بھی دوبارہ عبداللہ خاں ازبک ہی کی تلوار نے باز بہادر سے خالی کرایا تھا۔

ازبکوں سے اکبر کی ناراضی کا آغاز اسی عبداللہ خاں کی بعض "نا سزا اداؤں" کی وجہ سے ہوا۔ اس کا قصور تو یہ تھا کہ مال غنیمت میں جو ہاتھی ملے تھے وہ سب کے سب حضور میں روانہ نہیں کئے لیکن اکبر نے باز پُرس کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ بھی کچھ موزوں نہیں نظر آتا کہ (موجودہ جھانسی) کے قریب انرر کے جنگلوں میں ہاتھی کا شکار کھیلتے کھیلتے وہ یک بہ یک مالوے میں داخل ہو گیا اور عبداللہ خاں کو غالباً اس کی طفلانہ حرکت دیکھ کر ایسی وحشت ہوئی کہ وہ بادشاہ کی ملازمت ہی کو خیرباد کہہ کے گجرات چل دیا۔ یہ خبر سن کر اکبر نے پہلے چند سرداروں کو بھیجا تھا کہ اُسے

سمجھا بجھا کر واپس لے آئیں مگر جب نہ مانا تو فوج لے کر اس کا تعاقب کیا اور اس نے افتان وخیزاں حدود گجرات میں پہنچ کر اپنی جان بچائی۔

اس واقعے نے ادھر تو ازبک سرداروں کو جن کی شجاعت و تند خوئی مشہور تھی ناراض کیا اور ادھر ملک میں یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ بادشاہ نے مغلوں کے قدیم دشمن ازبکوں کے استیصال کا ارادہ کر لیا ہے۔ مغل حکام پہلے ہی ان سے رشک و حسد، اور بادشاہ کی رفاقت میں جن افغانوں کی انھوں نے جا بجا مغلوب و منکوب کیا تھا، وہ ان کی طرف سے کینہ رکھتے تھے۔ غرض ان تمام اسباب نے مل کر بادشاہ کو ان سے اور انھیں بادشاہ سے بدگمان کر دیا اور وہ آخر میں علانیہ منحرف ہو گئے۔ (۹۷۲ھ ۱۵۶۴ء)

جونپور کا نامور صوبہ دار علی قلی خاں سیستانی (الخاطب بہ خان زماں خاں) باغی ازبکوں کا سرگروہ تھا اور لڑائی شروع ہونے کے بعد بھی اس نے کئی بار صلح و اطاعت کی کوشش کی اور بادشاہ نے کئی بار باغیوں کا قصور معاف کر دیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ خود اپنے رفیق امرا کی بدعنوانیوں کا کافی تدارک نہ کر سکا[1] اور کچھ ان کی زیادتی اور کچھ ازبکوں کے غرور شجاعت کے باعث یہ لڑائیاں تھوڑے تھوڑے وقفے سے تین سال تک ہوتی رہیں، حتیٰ کہ کڑے کے قریب ایک جنگ میں باغیوں کے لشکر کثیر کو شکست فاش نصیب ہوئی اور علی قلی خاں مارا گیا۔ دو ایک سرداروں کے سوا جنھوں نے بھاگ کر جان بچائی باقی جو گرفتار ہو گئے تھے انھیں بادشاہ نے جونپور پہنچ کر قتل کرا دیا۔ (اواخر ۹۷۴ھ ۱۵۶۶ء)

(۴) راجپوتانہ

اس لڑائی میں اگرچہ بادشاہ کی بہت کم فوج جنگ میں حصہ لے سکی تھی، لیکن یہ پڑھ کر کہ اس میں دو ہزار صرف جنگی ہاتھی تھے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اب اکبر کی جنگی قوت کس قدر ترقی کر گئی تھی۔ ازبکوں کی کامل شکست کے دوآب و جونپور کی طرف سے بھی بادشاہ کو مطمئن کر دیا اور اب وہاں کا صوبہ دار خان خاناں منعم خاں بنگالے کے

[1] مثال کے لئے دیکھو معز الملک اور ٹوڈرمل کے زبردستی ازبکوں کے ساتھ جنگ کرنے کا واقعہ (منتخب، جلد دوم صفحہ ۷۷ تا ۸۰، اکبر نامہ جلد دوم صفحہ ۲۶۰ وغیرہ وغیرہ) اسی طرح آصف خاں کو جس نے ان لڑائیوں میں جانفشانی اور نمک حلالی کا حق ادا کیا تھا امرائے اکبری کی نکتہ چینی نے اس قدر پریشان کیا کہ وہ بادشاہ کا ساتھ چھوڑ کر خان زماں خاں سے جا ملا اور کچھ مدت تک علانیہ باغی رہا۔

افغان بادشاہ کو "شہنشاہ ہند" کی اطاعت قبول کرنے کی دعوت دے رہا تھا۔ پنجاب کے اقطاع میں بھی میرزا عبدالحکیمؔ کی لاہور سے پسپائی کے بعد عمدہ نظم و نسق کی بدولت کسی فساد و خلل کا اندیشہ نہ رہا تھا لہذا اکبر نے اپنی کشور کشایانہ توجہ راجپوتانے پر مبذول کی جس کی بعض ریاستوں نے اس کی اطاعت قبول نہیں کی تھی لیکن دو ایک قلعے فتح کرنے کے بعد وہ رنتھنبور پر پیش قدمی کا ارادہ کر رہا تھا کہ مالوے میں بعض باغی امیروں نے مانڈو پر قبضہ کر لیا اور اکبر کو جدید فتوحات چھوڑ کر مالوے میں آنا پڑا۔ باغی امیروں نے گجرات بھاگ کر جان بچائی اور اس صوبے کی از سر نو تنظیم و تنسیق کر کے اکبر نے میواڑ پر حملہ کیا جس کا پائے تخت چتوڑ مالوے کے قریب اور نیز راجپوتانے میں سب سے مستحکم و ممتاز قلعہ تھا۔

میواڑ

اکبر کے ساتھ اس موقع پر کوئی بڑی فوج نہ تھی لیکن راجپوتوں نے کھلے میدان میں مقابلہ نہیں کیا بلکہ گرد و نواح کا تمام علاقہ ویران و پامال کر کے چتوڑ میں کئی سال کا آذوقہ فراہم کر لیا۔ اور تا مقدور مدافعت کے تمام جنگی ساز و سامان مہیا کرنے کے بعد خود رانا اودے پور کی پہاڑیوں میں ہٹ گیا۔ مگر مغلوں نے محض محاصرے پر اکتفا نہ کی بلکہ صدہا نجار و سنگتراشں کی مدد سے بلند و مضبوط دیواریں (ساباط) بنا کے انہیں بہت جلد قلعے کی دیواروں تک بڑھا لیا اور پھر ان کی پناہ لے کر دو برجوں کے نیچے سرنگیں کھودیں اور ان میں بارود بھر کے ایک برج اڑا دیا۔ راجپوت سپاہی جو اپنے سردار کے اتفاقیہ

۱۔ میرزا عبدالحکیم اکبر کا سوتیلا چھوٹا بھائی تھا اور اسے بالکل بچپن میں ہمایوں نے ہندوستان آتے وقت کابل کی حکومت پر نامزد کر دیا تھا لیکن ۹۷۳ھ ۱۵۶۵ء میں (جب کہ اس کی عمر چودہ پندرہ سال کی تھی) بعض خانگی فسادات میں اس کا پائے تخت چھن گیا۔ اور اسے پنجاب کی طرف فرار ہونا پڑا۔ پھر اکبر کو ازبکوں کی لڑائیوں میں مصروف دیکھ کر اس نے دغابازی سے لاہور پر قبضہ کر لینا چاہا مگر ابھی قلعے کا محاصرہ جاری ہی تھا کہ اکبر کے ادھر آنے کی خبر ملی اور میرزا عبدالحکیم کابل کی طرف ہٹ گیا جہاں اتفاقاً پھر میدان حریفوں سے خالی ہو گیا تھا۔ اس کے بعد مقامی آزادی کے باوجود وہ اکبر کی اطاعت کا دم بھرتا رہا اور ۹۹۳ھ ۱۵۸۵ء میں جب اس نے وفات پائی تو صوبۂ کابل کا باقاعدہ سلطنت ہندوستان سے الحاق کر لیا گیا اور پھر محمد شاہی زمانے تک اس ملک پر مغل بادشاہوں کے صوبہ دار حکومت کرتے رہے۔

مارے جانے سے پہلے ہی شکستہ دل ہو چکے تھے، اب حملہ آوروں کو قلعے میں گھسنے سے نہ روک سکے اور یہ مستحکم قلعہ چند مہینے کے محاصرے اور جدوجہد کے بعد فتح ہو گیا۔[1] (رمضان ۹۷۵ھ ۱۵۶۷ء)

ریاست میواڑ کو ایک "سرکار" قرار دے کر یہاں مغل عامل مقرر کر دیئے گئے تھے، لیکن سخت بے سروسامانی کے باوجود میواڑ کے رانا اور اس کے دلیر ہموطنوں کو محکومی کا عار قبول کرنا گوارا نہ تھا اور وہ آیندہ تقریباً نصف صدی تک مغل صوبیداروں سے اس قسم کی جنگ کرتے رہے جسے فن حرب کی اصطلاح میں "جنگ قزاقانہ" (گیوریلا وارفیر) کہتے ہیں ان لڑائیوں میں فریقین کے بعض سرداروں کے کارنامے شجاعت و جانبازی کی ولولہ انگیز داستانیں ہیں لیکن اس جگہ انھیں بیان کرنے کا محل نہیں اور نہ ان لڑائیوں کا ہندوستان کے عام سیاسی حالات پر کوئی اثر پڑا کیونکہ درحقیقت یہ ایک چھوٹے گروہ کی اپنے سے کہیں بڑی قوت کے مقابلے میں آزادی قایم رکھنے کے لیے مایوسانہ جدوجہد تھی جس کا نتیجہ ناکامی ہوا اور آخر کار جہانگیر کے عہد میں رانا امر سنگھ نے سلاطین مغلیہ کی اطاعت و باج گزاری قبول کر لی اور ان بادشاہوں نے بھی اس کے ساتھ بڑی عزت کا سلوک مرعی رکھا۔ (۱۰۲۳ھ ۱۶۱۲ء)

رنتھنبور

خود اکبر کو فتح چتوڑ کے بعد راجپوتانے کے باقی حصے مطیع کرنے میں زیادہ زحمت پیش نہ آئی۔ سال آیندہ (۹۷۶ھ ۱۵۶۸ء) رنتھنبور کا مضبوط قلعہ بادشاہی توپوں کی جو پہاڑی پر چڑھا دی گئی تھیں تاب نہ لا سکا اور اس کے راجہ نے چند گولوں کے محلات پر پڑتے ہی مجبوراً اطاعت قبول کر لی اور اسی دن سے کہنا چاہیئے کہ اس جدید آلۂ حرب کے سامنے قلعہ رنتھنبور کی پہلی شہرت اور وقعت بھی

---

[1] راجپوت مقتولین کی تعداد فرشتہ نے دس ہزار بتائی ہے (صفحہ ۲۵۸) لیکن ابوالفضل لکھتا ہے کہ تقریباً تیس ہزار آدمی مارے گئے "وسبب بسیار کشتہ شدن آں بود کہ درزمان پیش (کہ سلطان علاؤالدین در شش ماہ و ہفت روز (چتوڑ را) گرفتہ بود) چوں رعایا بہ جنگ نمی پرداختند از قتل ایمن ماندہ بودند۔ و دریں ولا نہایت ستیزہ و پرخاش بتقدیم رسانیدند۔ بعد از ظہور بتاثیر استیلا و غلبۂ معذرت ایں گروہ فائدہ مند نیامد۔ حکم قتل عام شد و جمعے کثیر در بند ہم افتادند اکبر نامہ جلد دوم صفحہ ۳۲۳)

قصۂ پارینہ ہوگئی ۔ ریاست امبر (یا جے پور) کا راجہ پہلے ہی مغلوں کا غاشیۂ اطاعت کندھے پر رکھ چکا تھا۔ جودھپور و بیکانیر نے بھی اس کی پیروی کی اور سنہ ۹۸۰ھ ۱۵۷۲ء تک راجپوتانے کی تمام ریاستیں مغل شہنشاہ کی باج گزار بن گئیں اور اب قدرتی طور پر اسے ملک گجرات کے معاملے میں دخل دینے کا موقع ملا۔

(۵) گجرات

یہاں کے بادشاہ سلطان بہادر شاہ کی ہمایوں سے شکستوں کا حال پہلے ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ گجرات کے مغل حکام کی نالائقی اور پھر ہمایوں کی شیر شاہ سے آویزش کی بدولت اس نے اپنی سلطنت پر دوبارہ قبضہ پا لیا تھا لیکن تھوڑے ہی دن میں اس کے پرتگیز حلیفوں نے دھوکے سے اسے مار ڈالا[۱] (۹۴۳ھ ۱۵۳۷ء) اور کچھ عرصے انتشار کے بعد سلطان مظفر شاہ ثانی کا پوتا محمود (ثالث) حکومت کا وارث ہوا۔ اس بادشاہ نے سترہ اٹھارہ برس تک کمال قابلیت سے بادشاہی کی اور مفید انتظامات کی ضمن میں بندرگاہ سورت کا "شاہ قلعہ" بھی اسی کے عہد میں تعمیر ہوا[۲] اور مغربی

۱۔ اسی زمانے میں سلطان بہادر کی اجازت سے پرتگیزوں نے دیو (دیپ) میں تجارتی کوٹھی بنائی تھی اور اسی بہانے وہاں جنگی استحکامات تعمیر کر رہے تھے۔ اور دراصل تجارت سے زیادہ بحری قزاقی ان کا مقصود و مشغلہ تھا۔ سلطان بہادر شاہ کو فریب سے قتل کرنے کے متعلق فرنگی مورخوں نے طرح طرح کی تاویلیں کی ہیں لیکن غنیمت ہے کہ اس واقعے سے وہ بھی انکار نہ کر سکے کہ سلطان موصوف دوستانہ حیثیت سے ملنے آیا تھا اور پرتگیزوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ (یہ روایت تمام ہمعصر فارسی تاریخوں میں مذکور ہے۔ جدید تحقیقات کے لیے ملاحظہ ہو الفنسٹن صفحہ ۴۵۷۔ اکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۲۷۰)

۲۔ پرتگیزوں نے اس بارونق تجارتی بندرگاہ کو دو مرتبہ یکایک حملہ کر کے آگ لگا دی تھی اور انھی کی قزاقانہ تاخت کے انسداد کے لیے یہ وسیع و مستحکم قلعہ بنایا اور جدید ترین آلات حرب و ضرب سے آراستہ کیا گیا تھا چنانچہ قطعہ تاریخ بنا میں بھی اس غرض کی صراحت کی گئی ہے۔

مصرعہ اسکندر بود بر روئے یاجوج فرنگ ۔ کامدہ از غیب دوار در لب این بحر جائے"
این ندا آمد ز غیب از بہر تاریخش بگوش ۔ سد بود بر سینہ و جان فرنگی این بنائے"
(تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۲۲۷۔ نیز ملاحظہ ہو گزیٹیر جلد بست و سوم صفحہ ۱۵۴)

باب ۲

سواحل ہند پرتگیزوں کی بحری قزاقی سے ایک حد تک محفوظ ہو گئے۔
لیکن اس بادشاہ کے لاولد فوت ہونے سے (۹۶۱ھ / ۱۵۵۴ء) ملک میں پھر ابتری پھیل گئی اور جابجا اُمرا اپنی جاگیروں میں خود مختار ہو گئے۔ اس خرابی کو دفع کرنے کے لیے **اعتماد خاں** نامی ایک امیر نے پہلے خاندان شاہی کے ایک لڑکے رضی الملک (احمد شاہ) کو اور جب وہ دشمن ہو گیا تو ایک اور مجہول النسب لڑکے کو **مظفر شاہ ثالث** کے لقب سے بادشاہ بنایا (۹۶۱ھ / ۱۵۶۱ء) بایں ہمہ اندرونی فتنہ و فساد میں کوئی کمی نہ ہوئی اور گجراتی اُمرا[1] اسی طرح باہمی فرقہ بندی اور لڑائیوں میں مصروف رہے اور اسی اثنا میں دربار اکبری کے چند مفرور سردار (میرزا محمد حسین، مسعود حسین وغیرہ) بھی گجرات آ کر ان کے شریک حال ہو گئے۔ آخر جب اعتماد خاں کو اندرونی امن و امان اور ذاتی اقتدار قایم کرنے کی کوئی امید نہ رہی اور "تازہ وارد میرزایاں" بھی بعض مقامات پر قبضہ کر کے قابو سے نکل گئے تو اس نے اکبر کو گجرات آنے کی دعوت دی اور جب یہ بادشاہ ناگور سے **پٹن** (گجرات) پہنچا تو اپنے کئی رفیقوں کے ساتھ اطاعت قبول کر لی (۹۸۰ھ / ۱۵۷۲ء) اس کا نام نہاد بادشاہ مظفر شاہ بھی امرائے اکبری میں داخل کر لیا گیا تھا اور **منعم خاں** کے بنگالے جاتے وقت اس کے ہمراہ تھا۔ وہیں خان موصوف کی بیٹی سے اس کی شادی ہوئی لیکن پھر بادشاہ نے بدگمان ہو کر اسے نظر بند کر لیا اور اس نظر بندی سے بھاگ کر وہ ۹۹۱ھ / ۱۵۸۳ء میں دوبارہ گجرات پہنچا اور اس کی بادشاہی کے دعوے تازے ہو گئے۔ مگر ظاہر ہے کہ سلطنت مغلیہ کی فوجی قوت کے سامنے اب اہل گجرات کی کچھ حقیقت نہ رہی تھی اور مظفر شاہ کا فتنہ و فساد بھی دو سال کے بعد فرو ہو گیا۔ اور آخر کار جب اس نے گرفتار ہو کر (۱۰۰۱ھ / ۱۵۹۲ء) خودکشی کر لی تو پھر گجرات میں سلطنت مغلیہ کا کوئی حریف یا مدعی باقی نہیں رہا۔

(۶) بنگالہ

فتح گجرات کے بعد اگر اکبر کو تمام ممالک ہند کی سیادت و شہنشاہی کا دعویٰ ہوا تو یہ کچھ تعجب کی بات نہ تھی اور اسی بنا پر جونپور کے مغل صوبہ دار **منعم خاں** نے بنگالے

---

[1] اس عہد کے گجراتیوں کی ابوالفضل نے ان الفاظ میں ہنسی اڑائی ہے کہ "ہراس و فریب و نادرستی باقدرے آراستگی و ساد گی و فروتنی معجون ساختہ "گجراتی" نام کردہ اند و ازاں میاں اعتماد خاں راسر آمد آں گروہ گردانیدہ اند"!

کے بادشاہ سے دو ایک مرتبہ اکبر کی سیادت تسلیم کرنے اور خطبہ وسکہ جاری کرنے کی سلسلہ جنبانی بھی کی تھی لیکن اس مصالحانہ کوشش کیں کامیابی نہیں ہوئی اور داؤد خاں بن سلیمان کے بنگالے میں تخت نشیں ہونے کے بعد (۹۸۱ھ ۱۵۷۳ء) بظاہر اس کا امکان بھی جاتا رہا۔ کیونکہ سچ یہ ہے کہ ان مشرقی صوبوں میں ابھی تک افغانوں کی جنگی قوت ایسی اچھی حالت میں تھی کہ اگر منعم خاں جیسا دور اندیش ومنتظم صوبہ دار جونپور میں اور اندرونی نفاق کی بلا افغان سرداروں میں موجود نہ ہوتو خود ان کا عہد ہمایوں کی طرح کسی آیندہ وقت میں مغلوں کے لئے خطرناک حریف بن جانا محال نہ تھا اور "کررانی" خاندان کے نئے افغان بادشاہوں کے برسر اقتدار ہونے سے اس امکان کو مزید تقویت پہنچ گئی تھی۔

بنگالے کے افغان بادشاہ

اس سلسلے میں مختصر طور پر ہمیں یہ بیان کر دینا چاہیئے کہ جب اسلیم شاہ نے وفات پائی اور اس کے صغیر سن بیٹے کو مار کر عادل تخت نشین ہوا تو بنگالے کے افغان صوبہ دار محمد خاں سور نے ایسے ظالم غاصب کی بادشاہی تسلیم نہ کی اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ پھر وہ شاید جونپور کو فتح کرکے اودھ کے آگے تک بڑھ آیا تھا کہ کالپی کے قریب عادل اور اس کے وزیر ہیمو نے اسے شکست دی اور وہ اسی لڑائی میں مارا گیا (۹۶۱ھ ۱۵۵۴ء) بایں ہمہ اس کا بیٹا (خضر خاں) بہادر شاہ وراثت بادشاہی کا مدعی تھا اور جس وقت ہیمو مغلوں سے مقابلہ کرنے آگرے اور دہلی کی طرف بڑھا تو اسی بہادر شاہ کی روک تھام کے لئے عادل چنار کے قلعے میں ٹھیر گیا تھا اور آخر اسی کے ساتھ لڑائی میں زخمی ہوکر مارا گیا۔ (۹۶۴ھ ۱۵۵۶ء)

کررانی خاندان

بہادر شاہ اور اس کی اولاد سات آٹھ برس تک حکومت کرتی رہی اور اس کے بعد افغانوں کا ایک دوسرا خاندان برسر اقتدار ہوا جن کے سنین جلوس مشکوک ہیں[1]

---

[1] حتیٰ کہ فرشتہ نے شاہان بنگالہ کے بیان میں (جلد دوم مقالۂ ہفتم) اس خاندان کے پہلے بادشاہ تاج خاں (کررانی) کا ذکر ہی نہیں کیا اور الفنسٹن وغیرہ انگریزی تاریخ نویسوں نے بھی اسی کی پیروی کی حالانکہ ہمعصر تاریخوں میں اس کے حالات موجود ہیں۔ (اکبر نامہ جلد دوم ۳۲۵ وغیرہ نیز ملاحظہ ہو ریاض السلاطین صفحہ ۱۵۲)

باب ۲

بہر حال اسی خاندان کا دوسرا بادشاہ سلیمان خاں کررانی تھا جس کے عہد حکومت میں بنگالے کو تازہ قوت حاصل ہوئی اسی کی نسبت ابوالفضل کی معصر شہادت محفوظ ہے کہ "استقلال غریب بہم رساند۔ افغانان بے سرہمہ گرد او فراہم آمدند و خسرینہ جمع کرد و فیل فراواں بدست آورد"۔ اسی اندرونی انتظام و استحکام خاص کر اڑیسہ اور کوچ بہار کے علاقے از سر نو فتح کرنے کی مصروفیت کے باعث مغلوں کے ساتھ اس نے ابتدا سے دوستانہ مراسم قایم رکھے تھے اور اسی لئے منعم خاں کو امید ہوگئی تھی کہ شاید وہ بغیر لڑے بھڑے اکبر کی سیادت باضابطہ تسلیم کرے گا لیکن اول تو یہ محض سلیمان کی سیاسی شاطری تھی کہ وہ مغلوں سے بگاڑ کرنا نہ چاہتا، دوسرے جب اس نے وفات پائی اور اس کا بیٹا داؤد تخت نشین ہوا (۹۸۱ھ / ۱۵۷۳ء) تو سپاہ و دولت کے غرور نے اسے اتنی مصلحت بھی نہ برتنے دی اور معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کے ساتھ جنگ کی چھیڑ اسی کے طرف سے ہوئی ہو

مغلوں سے لڑائیاں اور شکست

مغلوں سے الجھنے کے وقت بنگالے کی افغانی سلطنت کی مالی اور جنگی قوت کا صاحب ریاض السلاطین[۱] (صفحہ ۱۵۵) کے اس قول سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ "چوں داؤد خاں بر سریر حکومت بنگالہ متمکن شد بواسطۂ شرب مدام و افزونی شان و شوکت کہ چہل ہزار سوار خوش اسپ و سہ ہزار و سہ صد زنجیر فیل و یک لک و چہل ہزار پیادہ از قسم بندوقچی و تفنگچی و برق انداز و بان انداز و کماندار و بست ہزار توپ و بسیار نوارہ (کشتی ہائے) جنگی و دیگر آلات و ادوات حرب حواشی ممالک محمد اکبر بادشاہ را مزاحمت رسانید" اور ایسے غنیم کو ابوالفضل کا بد معاشان فتنہ شعار" کے حقیر لقب سے یاد کرنا بالکل نار وا تعصب ہے لیکن اس ایں

[۱] یہ تاریخ جسے ایشیاٹک سوسائٹی نے اپنے اہتمام سے چھاپ کر شایع کیا ہے، سید غلام حسین سلیم (زید پوری) نے کسی انگریز حاکم کی فرمائش سے ۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۶ء میں تالیف کی تھی اور اس میں مؤلف نے بنگالے کے کچھ جغرافی اور کچھ عہد ہنود کے تاریخی واقعات کے بعد (محمد بن بختیار خلجی کی فتح سے نواب سراج الدولہ کے آخر عہد تک) بنگالے کی اسلامی حکومت کے حالات جمع کئے ہیں۔ اگرچہ اس کتاب میں گزشتہ واقعات کے متعلق بہت کم کوئی ایسی بات ملتی ہے جو طبقات اکبری، فرشتہ وغیرہ مشہور تاریخوں میں نہ ہو تاہم مؤلف نے کافی تحقیقات اور سلیقے سے منتشر معلومات کو ایک جگہ فراہم کر دیا ہے۔

کوئی شبہہ نہیں کہ مغلوں سے لڑتے وقت افغانوں کو عرصے تک مستقل و متحد رکھنے کے لیے جس غیر معمولی قابلیت کی ضرورت تھی، داؤد خاں اس سے متصف نہ تھا اور جنگ شروع ہونے کے بعد جب اس کے سپہ سالار **لودی خاں** نے منعم خاں سے صلح کرنی چاہی تو داؤد نے بدگمانی اور نادانی سے لودی خاں کو دھوکا دے کر گرفتار کر لیا اور بعض مصاحبوں کی اغوا سے قتل کر ڈالا جسے ابوالفضل جا بجا تائید الٰہی سے تعبیر کرتا ہے کہ ایسے دشمن سخت "کہ بہ ہزار تدبیر دور ساختن او از میاں دشوار بود بہ اہتمام مخالفان بر داشتہ آمد"[۱] اس واقعے نے ادھر تو افغانوں کے ایک گروہ کو علانیہ داؤد سے منحرف کر دیا اور ادھر سون و گنگا کے سنگم پر جب خود اس نے منعم خاں کا مقابلہ کیا تو سخت شکست کھائی اور ہٹ کر پٹنے میں قلعہ بند ہو گیا (۹۸۱ھ ۱۵۷۴ء) اسی محاصرے کے دوران میں اکبر بھی پٹنے آیا تھا اور داؤد خاں فرار ہوا تو ہاتھیوں کے لالچ میں خود بھی تعاقب میں شریک تھا۔ ورنہ پھر شاہ عالم ثانی کے زمانے تک کسی مغل بادشاہ کو بنگالے پر خود فوج کشی کرنے کی ضرورت نہیں پیش آئی اور مغل صوبہ داروں ہی نے آسام تک اقطاع بنگالہ کو فتح کیا اور پونے دو صدی تک وہاں کامیابی اور امن و انتظام کے ساتھ حکومت کرتے رہے جو بجائے خود سلاطین مغلیہ کے اقبال و استقلال کا نہایت عمدہ ثبوت ہے۔

بعد کی شورشیں

باایں ہمہ داؤد کی مذکورۂ بالا ہزیمت نے افغانوں کی جنگی قوت کا خاتمہ نہیں کر دیا تھا اور گو اوّل اوّل داؤد نے منعم خاں سے اس شرط پر کہ اسے اڑیسہ کا باج گزار بادشاہ تسلیم کر لیا جائے گا، صلح کر لی اور بنگالے کے دیگر اقطاع کے دعوے سے دست بردار ہو گیا تھا۔ لیکن جب منعم خاں نے ۹۸۳ھ ۱۵۷۵ء میں وفات پائی تو اس نے پھر سر اٹھایا اور نئے ناظم یا صوبہ دار **خان جہاں** (حسین قلیخاں ترکمان) کے پہنچتے پہنچتے بنگالہ و بہار کے اکثر جنوبی اضلاع پر قابض ہو گیا۔ افغانوں کی بہت بڑی فوج، جس کے بعض سردار شجاعت و سپہ گری میں یگانۂ روزگار تھے، اس نے جمع کر لی تھی اور انھوں نے جانبازی دکھانے میں بھی کمی نہیں کی مگر تقدیر نے خان جہاں کا ساتھ دیا اور اس قیامت خیز جنگ میں

---

۱ اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۷۲۔

باب ۲

جو موجودہ بھاگلپور کے قریب ہوئی تھی، مغلوں کو فتح کامل نصیب ہوئی اور داؤد خاں گرفتار ہو کر مارا گیا [۱] (ربیع الثانی ۹۸۴ھ ۱۵۷۶ء)

اس دوسری ہزیمت اور داؤد کے قتل سے بقول صاحب ریاض السلاطین "شدہ تخت شاہی زشاہاں تہی بہ زبنگالہ شد ختم نام شہی!" تاہم افغان سردار بہت عرصے تک بہار و اڑیسہ کے دشوار گزار مقامات میں قزاقانہ جنگ کرتے رہے اور جب اکبری عہد کے قانون مالگزاری کا ان ممالک میں نفاذ ہوا اور خود مغل جاگیرداروں میں شورش برپا ہوئی تو حکومت کی اس پریشانی سے انھوں نے فائدہ اٹھایا اور ان کے ایک سرغنہ **عثمان خاں** نے اتنی قوت بہم پہنچا لی کہ پچیس چھبیس برس تک مغل حکام کے قابو میں نہ آیا۔ آخر جہانگیر کے عہد میں جب نواب **اسلام خاں** بنگالے کا صوبہ دار مقرر ہوا اور بادشاہ کے اس فتنے کے استیصال کلّی کی تاکید کی تو **شجاعت خاں** کی سرکردگی میں پھر ایک مہم روانہ کی گئی۔ مغلوں کے ساتھ ہندی افغانوں کی آخری بڑی لڑائی کا خاتمہ اسی سپہ سالار کے ہاتھ پر ہوا اور اس کی حیرت انگیز شجاعت ذاتی کی گویا قضا و قدر کی طرف سے یہ جزا ملی کہ عثمان خاں جو میدان سے ہٹنے کا نام نہ لیتا تھا، کسی نامعلوم شخص کی گولی سے زخم کھا کے مارا گیا اور باقی افغان سرداروں نے بھی مایوس و مضمحل ہو کر اطاعت قبول کر لی [۱] (۱۰۲۱ھ ۱۶۱۲ء)

(۷) کشمیر

اس طرح شمالی ہند کے ملکوں میں اگرچہ سب سے زیادہ تاخیر و تشویش بنگالے کی فتح میں پیش آئی اور بہار و اڑیسہ کو ملا کر یہی سب سے وسیع و زرخیز ملک بھی تھا تاہم فتح کشمیر کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ گو اس گل ریز و میوہ خیز ملک میں عرصے سے آریہ نسل

---

[۱] بنگال کے افغانوں کی لڑائیوں کے ولولہ انگیز حالات اس عہد کی فارسی کتابوں میں تفصیل سے ملتے ہیں۔ صاحب ریاض السلاطین اور اسٹوارٹ نے اپنی انگریزی تاریخ بنگال میں انھیں کسی قدر مختصر لیکن مسلسل بیان کیا ہے۔ شجاعت خاں کی مذکورۂ بالا جنگ کے لیے (جس میں یہ سردار دشمن کے فیل مست کے سامنے سے نہیں ہٹا اور اپنی حیرت انگیز بہادری کے صلے میں "رستم زماں" کے خطاب سے مفتخر ہوا تھا) دیکھو اقبال نامہ جہانگیری صفحات ۶۱ تا ۶۴۔ ریاض السلاطین ۱۷۶ تا ۱۸۰ نیز مآثر الکرام جلد دوم صفحہ ۶۳۰۔

باب

کے لوگ آباد ہو گئے تھے اور اس لیئے وہ صحیح معنی میں "کشور ہند" کا حصہ تھا، پھر بھی ہندوستان کی کوئی اسلامی سلطنت مغلوں سے پہلے اس پر تسلط حاصل نہ کر سکی جس کی سب سے بڑی وجہ راستے کی دشواریاں تھیں۔

خود مختار اسلامی حکومت

لیکن کشمیر میں فتح نہ ہونے کے باوجود آٹھویں صدی ہجری کے شروع ہی میں مذہب اسلام شائع اور یہاں کا راجہ رنچن (۲۱ ؁ھ تا ۳۱ ؁ھ ۱۳۲۱ء تا ۱۳۳۱ء) بطور خود ایک درویش کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا تھا۔[۱] اس نے اپنا اسلامی لقب سلطان صدر الدین رکھا اور خاندان کے بہت سے لوگوں کو مسلمان کر لیا تھا گر وہ مر اتو اس کی بیوہ رانی نے پہلے راجہ کے بھائی اودن دیو کو بلا کر شادی کر لی اور وہ دس بارہ برس تک حکومت کرتا اور خانہ جنگی میں الجھتا رہا حتیٰ کہ ایک مسلمان امیر "شاہ میرزا" نے تمام حریفوں کو دفع کر دیا اور مستقل طور پر اسلامی بادشاہی کی بنیاد ڈالی (۴۳ ؁ھ ۱۳۴۲ء) اگرچہ وہ خود بھی نکو در کا پر دتا اور ہندوستان کے قدیم پانڈو راجاؤں کی اولاد میں ہونے کا مدعی تھا۔

شاہ میرزا نے جو کشمیری زبان میں شنبھو کے عرف سے مشہور ہے سلطان شمس الدین کا لقب اختیار کیا تھا اور اس کی تخت نشینی سے آئندہ دو صدی تک اس ملک میں خود مختار مسلمان بادشاہ فرماں روائی کرتے رہے جن میں سلطان سکندر (بت شکن) (۹۷ ؁ھ تا ۱۹ ؁ھ ۱۳۹۷ء تا ۱۴۱۶ء) اپنے مذہبی تعصب اور سلطان زین العابدین (۲۶ ؁ھ تا ۷۵ ؁ھ ۱۴۱۷ء تا ۱۴۶۷ء) کے تعصبی اور نیک نفسی میں مشہور ہیں۔ سلطان سکندر کے زمانے میں ہندوؤں پر بڑی سختیاں ہوئیں اور بہت سے برہمن خوف جان و مال کی وجہ سے مسلمان ہو گئے۔ اسی کے ساتھ بیرونی ممالک سے بے شمار مسلمان علماء اور درویش کشمیر میں آکر آباد ہوئے اور اسلامی علوم و تمدن کو بڑی رونق حاصل ہوئی لیکن سلطان زین العابدین کے طویل عہد سلطنت میں سکندر کے ان بیجا مظالم کی تلافی ہوئی اور اہل کشمیر کو نہ صرف

---

[۱] ونسنٹ اسمتھ صاحب جنھوں نے سلاطین کشمیر کے حالات میں "سکندر بت شکن" کو نمایاں جگہ دی ہے (اوکس ہسٹری ص۲۷۰) اس واقعے کا ذکر نہیں کرتے حالانکہ وہ نہ صرف بعد کی فارسی اور نیز اردو تاریخوں میں بلکہ آئین اکبری (جلد اول صفحہ ۵۸۳) اور اس کے انگریزی ترجمے (جلد دوم صفحہ ۳۸۱) اور نیز امپیریل گزیٹیر (جلد یازدہم صفحہ ۹۲) میں موجود ہے۔ گزیٹیر میں اس راجہ کے نام کا صحیح تلفظ "رنچن" بتایا ہے جسے فارسی مورخوں نے رنجن بنا دیا ہے۔

باب۔

کامل مذہبی آزادی ملی بلکہ جزیہ موقوف اور گاؤکشی بھی اسی سلطان بادشاہ نے اپنی مملکت میں ممنوع قرار دی اکثر ہندو خاندان جو بے دلی سے سلمان ہو گئے تھے، دوبارہ اپنی ملت میں جا ملے اور اسی طرح جو مندر سکندر نے جبراً تڑوائے تھے وہ ازسرنو تعمیر ہوئے اور سنسکرت زبان اور ہندو علم کا اس عہد میں احیا ہوا۔ اور زین العابدین کے حکم سے جو خود بھی سنسکرت کا عالم تھا متعدد سنسکرت کتابوں کا عربی فارسی میں ترجمہ کیا گیا[1]۔

معلیہ فتوحات

سلطان زین العابدین اور دوسرے سلمان بادشاہوں کی انتظامی اصلاحات عمدہ آئین و قوانین اور نئے شہر و عمارات کی تعمیر و رعایا پروری کے بہت سے واقعات کشمیر کی تاریخوں میں محفوظ ہیں۔ اس کتاب میں ان کے بہ تفصیل بیان کرنے کی گنجایش نہیں اور یہاں مختصر طور پر اسی قدر لکھنا کافی ہوگا کہ دسویں صدی ہجری کے آغاز ہی میں امرائے کشمیر کے باہمی حسد و نفاق کی وجہ سے یہ سلطنت اتنی کمزور بھی جانے لگی تھی کہ بابر نے تھوڑی سی فوج بھیج کر اس کی فتح کا ارادہ کیا اور گو اسے کامیابی نہ ہوئی لیکن ۹۴۷ھ ۱۵۴۱ء میں بابر کا خالہ زاد بھائی میرزا حیدر (دوغلات) صرف چار ہزار سواروں سے کشمیر کے حریفان ملکی کو شکست دے کر ملک پر قابض ہو گیا جس کا حال اجمالاً ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ ابوالفضل کا بیان[2] ہے کہ میرزا نے اپنی حکومت کے زمانے میں خطبہ و سکہ ہمایوں بادشاہ ہی کے نام کا جاری کیا تھا اور اسی بنا پر گو میرزا حیدر کے بعد پھر کشمیر پر وہاں کے امرا قابض ہو گئے اور مغلوں کو عرصے تک ادھر توجہ کرنے کی مہلت نہیں ملی تاہم غالباً اکبر اسے پہلے سے اپنا ملک سمجھتا تھا۔ چنانچہ جب پہلی فوج کشی کے وقت اس کے سپہ سالاروں نے باج گزاری کا اقرار اور کچھ علاقہ لے کر اہل کشمیر سے صلح کر لی تو بادشاہ نے اس معاہدے کو منظور نہیں کیا اور دوبارہ فوج روانہ کی۔ کشمیر کے لوگ راجپوتی نسل اور کوہستانی باشندے ہونے کے باوجود شجاعت و سپہ گری میں کوئی امتیاز نہیں رکھتے دوسرے انھیں باہمی تنازعات نے منتشر کر

---

[1] کشمیر کی قدیم تاریخ "راج ترنگنی" کی بھی اسی عہد میں تکمیل ہوئی۔ مذکورۂ بالا حالات کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو آئین اکبری جلد اول" سرکار کشمیر" تاریخ فرشتہ جلد ۲ مقالہ ۱۲ خلاصہ تواریخ کشمیر وغیرہ۔

[2] آئین اکبری صفحہ ۵۸۴ یعنی جہاں کشمیر یوں کا ذکر چلا تھا وہ اپنے ہی بادشاہ (نازک شاہ) کے نام کا خطبہ پڑھواتے تھے۔

دشمن کے مقابلے میں بھی متحد نہ ہونے دیا اور یہ خوبصورت ملک بہ آسانی فتح ہو کر سلطنت مغلیہ کا جزو بن گیا (۹۹۵ھ ۱۵۸۶ء)

دوسری فصل - ملکی آئین

سندھ قندھار و دکن

الحاق کشمیر ہی کے قریبی زمانے میں افواج اکبری نے کوہستان سلیمان کے جنگ جو افغانوں کی سرکوبی کو اور بہت سے نقصان و مصائب برداشت کرنے کے باوجود میدانی اور کھلے ہوئے قطعات پر بادشاہی تسلط قایم کر دیا۔ اگرچہ یہاں کے آزاد قبائل صحیح معنی میں نہ پہلے کبھی مغلوب و محکوم ہوئے تھے اور نہ آج تک کسی کے محکوم ہیں۔

سندھ کی تسخیر میں دو تین سال صرف ہوئے اور اسی زمانے (۱۰۰۰ھ ۱۵۹۲ء) میں گجرات و کشمیر کی خطرناک بغاوتوں کو بادشاہی امرا نے فرو کیا۔ مگر قندھار کو جس پر سلطنت ایران کا قبضہ تھا، خود وہاں کے امرا نے مرکز حکومت کی بے توجہی اور باہمی خانہ جنگی سے عاجز آ کر اکبر کے حوالے کر دیا (۱۰۰۳ھ ۱۵۹۵ء) اور اس قبضے سے مغلوں کے صوبۂ کابل کے استحفاظ و استحکام کو بالواسطہ بہت تقویت پہنچی۔

مالوہ اور ممالک شرقی کی تسخیر کے دوران میں گونڈوانے یا وسط ہند کے غیر آباد قطاع کو مغلوں کی سیادت تسلیم کرنی پڑی اور اکبر کے آخری عہد میں دکن کی اسلامی ریاستوں سے بھی شدومد کے ساتھ لڑائی چھڑ گئی تھی اور خاندیس کے علاوہ برار و احمد نگر کے علاقے سلطنت مغلیہ کے صوبے بن گئے تھے۔ لیکن ان دکنی لڑائیوں کے حالات کسی قدر تفصیل و تسلسل کے ساتھ ہم آئندہ باب میں ایک جگہ بیان کر دیں گے یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی اندرونی حالت پر جسے عہد اکبری میں نمایاں استقلال حاصل ہوا ایک اجمالی نظر ڈال جائیں۔

ذرایع معلومات

ان حالات کو جن میں نظم و نسق کے آئین و ضوابط، لوگوں کا تمدن، رسوم معاشرت مشاغل و خیالات، علوم و فنون سب کچھ داخل ہے، معلوم کرنے کے لیے بے شمار ذرایع موجود ہیں۔ متعدد عام تواریخ کے علاوہ، جن میں سب سے بہتر و مستند طبقات اکبری مانی گئی ہے،[1]

---

[1] یہ لاجواب تاریخ، جس کی خوبیوں کو قدیم و جدید علما بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں، اکبر کے ہر دلعزیز بخشی خواجہ نظام الدین احمد (بن خواجہ مقیم ہروی) نے تالیف کی تھی اور لفظ "نظامی" اس کا مادۂ تاریخ ہے اگرچہ مؤلف آیندہ ایک دو سال کے حالات بھی جب تک زندہ رہا (۱۰۰۳ھ) اس میں اضافہ کرتا رہا۔

تاریخ ہند جلد سوم درمیان صفحات (۶۲ و ۶۳)

باب ۲
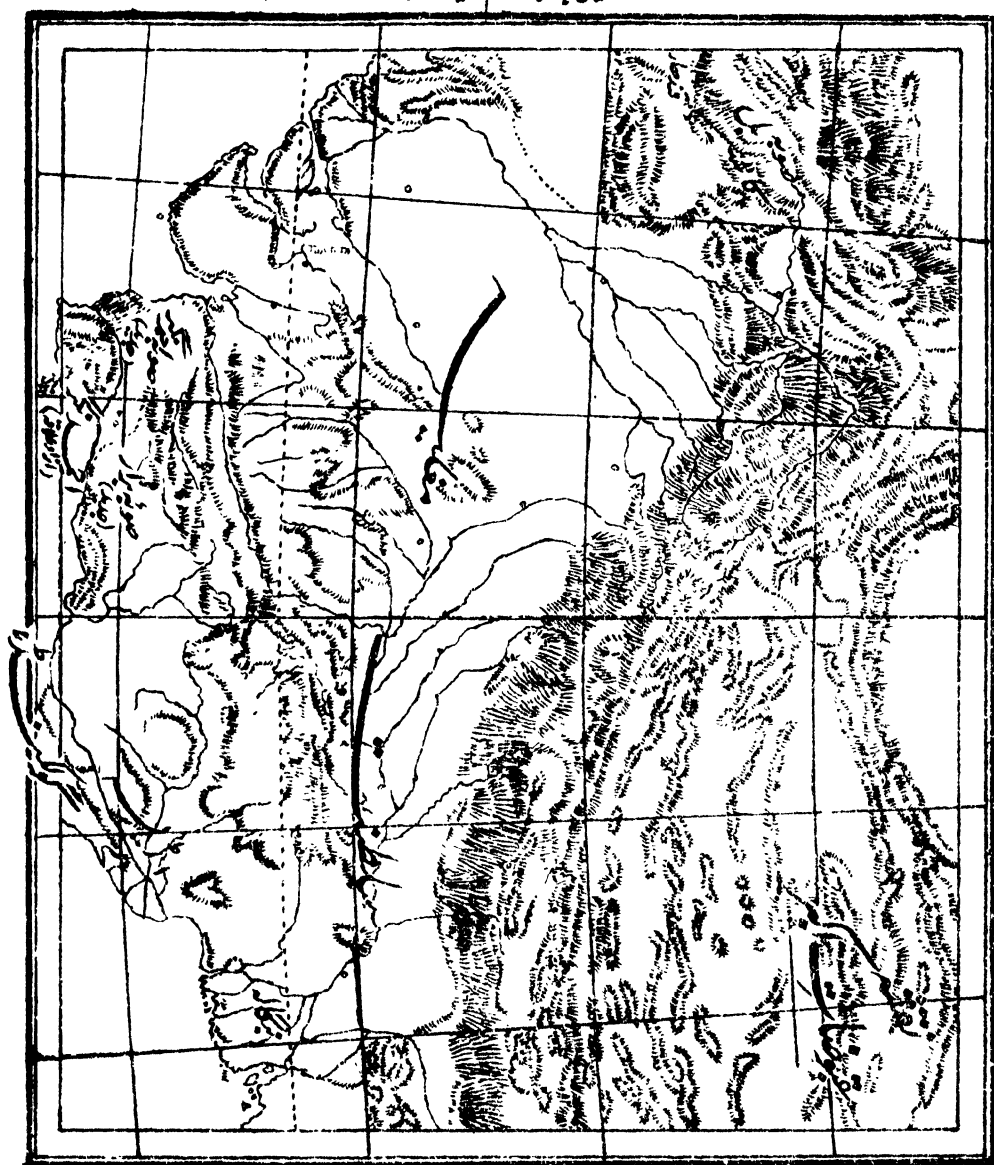
زیر نظر عہد کے اسلامی علما[1] اور مذہبی اور ادبی خیالات و مشاغل کے متعلق منتخب التواریخ کی آخری دو جلدیں دلچسپ معلومات کا خزانہ ہیں اور ملکی آئین و قوانین سرکاری محکمے عہدہ داروں کے فرائض و اختیارات، ملک کی انتظامی تقسیم و مختلف اقطاع اور بلاد کے جغرافی حالات، مالگزاری، پیداوار، فنون و مصنوعات، شاہی مالیات، جنگی ساز و سامان امرا اور اہل دربار خاص کر بادشاہ کے مشاغل و سوانح وغیرہ موضوع پر ابوالفضل کی مشہور کتابیں آئین اکبری[2] و اکبر نامہ معلومات کا ایسا ذخیرہ ہیں کہ گو ان میں بعض اعداد و حالات نہیں ملتے پھر بھی انھیں سامنے رکھ کر عہد اکبری کے آئین و تمدن پر ضخیم سے ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ لیکن ہم اس تاریخ میں محدود گنجائش اور اپنے اصول تحریر کی بنا پر اس دسویں صدی ہجری کے ہندوستانی تمدن کے صرف نمایاں خد و خال پیش کر سکیں گے۔ اور بالواسطہ ناظرین کو اس دھوکے میں پڑنے سے بھی بچائیں گے جو اس بارے میں بعض انگریزی تاریخوں کے مطالعے سے پیدا ہوتا ہے۔

ایک عام غلطی

یہ انگریزی تاریخیں اس عہد کے حالات کو اس طرح بیان کرتی ہیں کہ گویا ملکی نظم و نسق کے یہ آئین و ضوابط، یہ علوم و فنون اور تمدن کی ترقی محض اکبر بادشاہ کے ذاتی اوصاف کی وجہ سے یک بہ یک ہندوستان میں رونما ہو گئی تھی۔ اور اس سے پہلے نہ یہاں کے لوگوں میں کوئی علم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۲) تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو منتخب التواریخ جلد دوم صفحہ ۳۹، مآثر الامرا جلد اول صفحہ ۶۶۰ الیٹ جلد پنجم صفحہ ۱۷۷ وغیرہ وغیرہ)

[1] یہ مشہور تاریخ ملا عبد القادر بن ملوک شاہ بداونی (متوفی ۱۰۰۴ھ) کی تالیف ہے۔ ملا صاحب کے مختلف علوم و السنہ میں تبحر کو اکثر معاصرین و متاخرین نے تسلیم کیا ہے۔ تاریخی واقعات نہایت خوش اسلوبی اور صراحت سے بیان کرتے ہیں۔ بڑے راسخ العقیدہ مسلمان تھے جس بات کو بدعت یا الحاد سمجھ لیں پھر اس کے دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ اکبر کے دربار میں قاری کی خدمت پر مامور تھے اور ملتان کے علاقے میں بادشاہ کی طرف سے جاگیر بھی رکھتے تھے۔ اخیر زمانے میں دربار میں جانا چھوڑ دیا تھا ان کی تاریخ خود ان کی اور اکبر کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔

[2] اس کتاب سے کام لیتے وقت ہم نے اس کے مشہور انگریزی ترجمے سے بہ احتیاط مقابلہ کیا ہے جسے بلوخمین نے بڑی محنت اور اہتمام سے شروع کیا اور جیرٹ نے تکمیل کو پہنچایا ہے۔

اور تہذیب و تمدّن تھا نہ سلطنت میں نظم و نسق! اس میں شک نہیں کہ سلطنت مغلیہ سے قبل کی تہذیب و تاریخ کو قدامت نے دھندلا کر دیا ہے اور اس کے تحریری ماخذ جو زمانے کی دست و بُرد سے بچ گئے ہیں وہ تعداد میں کم اور عام طالب علم کی دسترس سے کسی قدر باہر ہیں لیکن اول تو جدید اصول و قواعد کے مطابق اہل علم کی تحقیقات موجودہ مواد سے بہت کچھ کام لے سکتی اور مذکورۂ بالا غلطی کو بآسانی دور کر سکتی ہے دوسرے انسانی تاریخ کا یہ عام کلیّہ بھولنا نہ چاہیئے کہ بڑی بڑی قوموں اور ملکوں کے تمدّن میں تغیر ہمیشہ تدریجی ہوا کرتا ہے اور اسی کے ساتھ نظم و نسق کے آئین بدلتے ہیں۔ کسی قوم کے نظام سلطنت میں یکایک انقلاب پیدا تو کیا جا سکتا ہے اور اکثر ممالک میں مختلف اسباب سے ایسا ہوا بھی ہے لیکن نئے آئین و قوانین اگر لوگوں کے موجودہ حالات و طبائع کے مناسب نہ ہوں تو بہت جلد بیکار ہو جاتے ہیں اور عملاً ان کا مفہوم و منشا ہی وہ باقی نہیں رہتا جو انھیں زبردستی رائج کرنے والوں نے قرار دیا تھا۔

ان عام نظریات سے قطع نظر ہمارے پاس اس امر کی صریح شہادتیں موجود ہیں کہ نووارد مغل نظم و نسق کے ان آئین کو جو عہد اکبری سے منسوب کیئے جانے لگے ہیں اپنے ملک سے لے کر نہیں آئے تھے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ خود اقبالمند اکبر فن سیاسیات و ملک داری کی واقفیت میں اپنے باپ دادا پر کوئی فوقیت نہ رکھتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ شمالی ہند میں گزشتہ دو صدی کی "لامرکزیت" اور طوائف الملوکی نے ملکی آئین کی یکسانی معدوم کر دی تھی اور ہر صوبے میں مقامی اور ہنگامی ضروریات کے باعث نظم و نسق کے طریقے مختلف ہو گئے تھے۔ لیکن غور سے دیکھئے تو انھی نئی ضروریات نے ہندوستان کے ارباب حل و عقد کو اصول ملک داری کے جزئیات سے اور نیز مقامی خصوصیت سے مزید مقامی واقفیت کا موقع دیا جو قدیم سلطنت دہلی کی مرکزی حکومت کو حاصل نہ ہوا تھا اور اس کے بعد اگر کسی بات کی کمی رہ گئی تھی تو وہ یہ تھی کہ کوئی ایسا قابل مدبّر میدان عمل میں آئے جو اس تمام معلومات کو پیش نظر رکھ کر از سر نو نظم و نسق کے اصول میں اصلاح و یکسانی پیدا کر دے۔ اور یہ لکھنا ضروری نہیں کہ اس خدمت کو انجام دینے کے لیے گویا سب سے مقدم کام ممالک ہند کی سیاسی شیرازہ بندی اور مرکزی حکومت کا احیا تھا۔

"مرکزیت" کی تجدید

خاص طور پر قابل لحاظ یہ بات ہے کہ "شہنشاہی ہند" کی اس تجدید کا اولوالعزمانہ منصوبہ

سوچنے سے بھی اہل ہند کے دل و دماغ عاری نہ تھے۔ بے شبہہ بابر کی آمد نے یہاں کے حکومت پیشہ طبقے، خاص کر ہندی افغانوں میں، جن کے ہاتھ سے مغل حکومت چھین رہے تھے ایک قسم کا قومی ہیجان پیدا کر دیا اور بعد میں ہمایوں کی فتوحات مالوہ و گجرات و بنگالہ نے تمام شمالی ہند کو ایک مرکزی حکومت کے ماتحت لانے کی علمی مثال بھی ان کے پیش نظر کر دی۔ بایں ہمہ اگر تاریخ شیر شاہی کے منقولہ روایات و اقوال جن کا ہم پچھلے باب میں حوالہ دے چکے ہیں، صحیح ہیں تو ماننا پڑتا ہے کہ عالی حوصلہ شیر شاہ بابر و ہمایوں کا مقلد نہ تھا بلکہ اس کے تصور میں عہد بلبن و علاء الدین کے نقشے کھنچے ہوئے تھے کیونکہ اس نے ہندوستان پر تسلط حاصل کرنے کے ساتھ ہی مالگزاری، محاصل تجارت، عدالت، ڈاک، حفظ راہ، اندرونی امن اور بیرونی دشمنوں سے مدافعت کے وہ مفصل آئین بنائے اور نافذ کیے جو پہلی تاریخ اور حالات حاضرہ سے بہت وسیع واقفیت اور عرصے تک غور و فکر ہی کا نتیجہ ہو سکتے ہیں اور جن کا نقشہ تیار کرنے میں گو وہ اکبر و جہانگیر کا استاد تھا لیکن بابر و ہمایوں کا شاگرد نہ تھا۔ اور اکثر اسی کا نظم و نسق دیکھے اور سیکھے ہوئے ہندوستانی لوگ تھے جنھوں نے عہد اکبری میں اسی نقش اوّل کے مطابق آئین سلطنت کو بنایا اور ملک میں رائج کیا۔

اس طرح ایک اعتبار سے یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ ہمایوں کا یہی افغان حریف شیر شاہ ہندوستان کے اس دور شہنشاہی کا بانی تھا جس کے نمونے پر سلطنت مغلیہ قایم ہوئی! مگر اسی کے ساتھ ہمیں سلاطین تیموری کی ان امتیازی خصوصیات کو فراموش نہ کرنا چاہیئے جنھیں مغل ہندوستان میں لائے تھے۔ واضح رہے کہ یہاں کے قدیم باشندوں میں "بادشاہ پرستی" کا جذبہ غالباً مدت دراز سے متوارث تھا۔ مطلق العنان بادشاہی کا طریقہ بھی اس زمانے میں دنیا کے قریب قریب ہر ملک میں مروج، اور گویا بہترین طرز حکومت سمجھا جاتا تھا اور جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں ہندوستان میں مسلمانوں کی ابتدائی "ترک شاہی" میں بھی اس مطلق العنان طرز حکومت کے عناصر موجود تھے چنانچہ "سلطنت دہلی" کے بعض فرماں روا مطلق العنانی کا بدترین نمونہ سمجھے جانے کے لائق ہیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ ایسے بادشاہ دیگر اسباب اور ذاتی اوصاف سے اقتدار حاصل کر لینے کے بعد اپنی جابرانہ خود رائی کا اظہار کرتے تھے اور ان کے ہمعصر طبقۂ اعلیٰ کے مسلمان کبھی خوف و مجبوری اور کبھی دنیاوی طمع سے ان کی اطاعت قبول کر لیتے تھے ورنہ معمولی غلام یا سرداروں کا

باب ۲

اپنی آنکھوں کے سامنے رتبۂ بادشاہی تک پہنچنا دیکھ کر ان کے دلوں میں بادشاہ کی عظمت و پرستش کا وہ جذبہ پیدا نہ ہو سکتا تھا جو بعد کے مغل امرا میں ہمیں نظر آتا ہے۔

مطلق العنان طرز حکومت کے اسباب تلاش کرنے مشکل نہیں ہیں چنگیز خانیوں کے ممالک اسلامیہ میں تہلکہ بپا کرنے کے زمانے ہی میں "کفار مغول" کی نسلی خصوصیات ظاہر ہو گئی تھیں اور ان کی خونخواری اور قساوت قلبی کی طرح ان کی "آقا پرستی" بھی ضرب المثل سمجھی جانے لگی تھی[1]۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ اسلام قبول کرنے کے بعد مغلوں کی عادات و اطوار میں نہایت عمدہ انقلاب ہوئے لیکن یہ انقلاب ایسا نہ تھا کہ ان کو اسلام کے ابتدائی طرز حکومت کی طرف راغب کر دیتا۔ وجہ یہ تھی کہ مغلوں نے ایسی حالت میں اسلام قبول کیا تھا جب کہ وہ صاحب حکومت تھے۔ علاوہ اس کے اس زمانے میں خود مسلمان حکمران قوموں میں مطلق العنان بادشاہی مدت سے پیدا ہو چکی تھی۔ اس لئے مغلوں کا اس طریقۂ حکومت کو اختیار کرنا کوئی عجیب بات نہ تھی۔

بے تعصبی

یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ابتدا سے مغلوں کی لڑائیاں زیادہ تر مسلمانوں کے ساتھ ہوئی تھیں اور اسلام لانے کے بعد بھی وہ وسط ایشیا کی اسلامی حکومتوں سے جدوجہد کرتے رہے پس غیر مسلموں سے مذہبی لڑائی کا تجربہ ان کو نہ ہوا اور نہ ان میں وہ جذبہ تھا جو مجاہدین میں ہوتا تھا۔ اس لئے جب بابر نے رانا سانگا پر فتح پا کر (جنگ کانوہ ۹۳۳ھ ۱۵۲۷ء) غازی کا لقب اختیار کیا یا اس لڑائی کو "جہاد فی سبیل اللہ" مشہور کرنا چاہا تو سمجھنا چاہئے کہ اس کا یہ فعل اس کے اصلی میلان طبع کے چنداں موافق نہ تھا[2]۔

مغلوں کی نسلی خصوصیات ان کی مطلق العنانی اور بے تعصبی کو اجمالی طور پر سمجھنے اور پھر ان کے ہر بادشاہ کے ذاتی سوانح اور تاریخی واقعات پر نظر ڈالنے سے ہم ہندوستان کے سلاطین تیموری کی خصوصیات کا بھی صحیح اندازہ کرنے میں غلط فہمیوں سے بچ سکتے ہیں۔ ان باتوں کے ذہن میں رکھنے کے بعد ہندوستان کا سب سے پہلا

[1] مثلاً ملاحظہ ہو طبقات ناصری آخری طبقہ حالات "کفار مغول" نیز راورٹی (جلد دوم) کے حواشی وغیرہ۔

[2] بابر تو اپنے مغل کہے جانے سے بھی برا مانتا تھا۔

مغل شہنشاہ بھی ایک معمولی انسان کی طرح ہمارے تصور کے سامنے آجاتا ہے جس کی ذاتی صفات، انھی موروثی اثرات، ابتدائی تعلیم و تربیت اور گرد و پیش کے حوادث و واقعات کے قدرتی اسباب کا نتیجہ ہیں، جو ہر شخص کی زندگی پر کم و بیش اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ سپاہیانہ شجاعت و جانبازی رفیقوں کی قدر دانی اور ان سے محبت و فیاضی کا برتاؤ، مغلوب دشمنوں کے ساتھ عفو و کرم، شوق جنگ و کشور کشائی، اور اپنے مرتبے اور خاندان کا پاس و غرور وہ شاہانہ جذبات ہیں جو اکبر کو اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملے تھے۔ علاوہ اس کے امور سلطنت کو سمجھنے اور سیاسی معاملات کو سرانجام دینے کی اس میں عمدہ قابلیت موجود تھی، اور اگر طفولیت میں کوئی کتابی تعلیم نہ ملنے یا زیادہ تر جنگ و سفر میں رہنے کی وجہ سے وہ جوانی میں محض ایک زود اعتقاد سیدھا سادا مسلمان سپاہی بن گیا تو اسی کے ساتھ انھی اسباب نے اس کو عیش پرستی اور تن آسانی کے اس گڑھے میں گرنے سے بچا لیا جو اکثر نوجوان شہزادوں کی ہلاکت کا باعث ہوا ہے، مگر اس جگہ خاص طور پر جو بات جتانی منظور ہے وہ یہ ہے کہ انھی مذکورہ بالا موروثی اثرات اور شوق حکومت نے اکبر کی ذاتی کم علمی اور سپاہیانہ سادگی سے مل کر وہ مذہبی بے تعصبی پیدا کی تھی جس کی تعریف بعض مورخوں نے بہت کی ہے۔

ہندوؤں سے تعلقات

دراصل قوم مغل کی جس "آقا پرستی" کا ہم اوپر حوالہ دے چکے ہیں، اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ مغل بادشاہ اپنی رعایا یا ماتحتوں سے کامل اطاعت کی توقع رکھتے تھے اور بادشاہ کی ذات سے وابستگی اور جاں نثاری ان کی سرکار میں درجۂ قبولیت پاتی تھی۔ اور "بادشاہ" کی تعظیم و تکریم وہ شے تھی جس میں ہندوستان کے ہندو باشندے مغلوں سے بھی دو قدم آگے تھے۔ بابر و ہمایوں کو اس بات کے سمجھنے کا پورا موقع نہیں ملا لیکن اکبر کو بیرام خاں کی معزولی کے زمانے سے راجپوتانے کے رئیسوں سے سابقہ پڑا اور جب بہارا مل مہاراجہ آنبیر (جے پور) کی راجکنواری بادشاہ کے محل میں آکر بادشاہ بیگم بنی (۹۶۹ھ / ۱۵۶۲ء) اور مہاراجہ کا فرزند بھگوان داس راجپوتوں کی ایک فوج کے ساتھ اکبر کے امرا میں شامل ہو گیا، تو نوجوان بادشاہ کو اس قوم کی سپہ گری، بہادری اور سب سے زیادہ اس آقا پرستی کے تماشے دیکھنے کا بار بار اتفاق ہوا جو تمام مطلق العنان بادشاہوں کی نظر میں قابل قدر ہوتی ہے چنانچہ اکبر اور اس کے جانشین اپنے راجپوت سپاہیوں کے دل سے قدر دان ہو گئے اور ان دونوں (راجپوت و مغل) سپاہی پیشہ قوموں میں درحقیقت کچھ اس قسم کی طبعی مناسبت تھی کہ مذہبی اختلاف کے باوجود

وہ بہت جلد ایک دوسرے کے ایسے رفیق بن گئے کہ شاید دنیا کی کسی اور دو غیر قوموں میں اتنی یک جہتی کی مثال نہ ملے گی۔

ہندو عہدہ دار

راجپوتوں سے ان تعلقات کا آغاز ہوتے ہی بادشاہ نے جزیہ اور وہ محصول جو ہندو جاتریوں سے وصول کیا جاتا تھا منسوخ کر دیا (۹۷۱ھ ۱۵۶۴ء) جس کی سلطان زین العابدین کشمیر میں نظیر قائم کر چکا تھا۔ اس فعل نے قدرتی طور پر ہندوؤں کو حکومت کا ممنون اور مغلوں کی خدمت گزاری پر مائل کیا اور ادھر اتفاق سے اول ہی اول جو ہندو سردار اکبر کی ملازمت میں داخل ہوئے ان میں راجہ بھگوانداس (یا بھگونت داس) اور اس کا متبنی بھتیجا راجہ مان سنگھ اور ٹوڈرمل اپنی انتظامی قابلیت کے اعتبار سے بھی کسی مغل سردار سے کمتر نہ تھے وہ سلطنت کے بڑے سے بڑے عہدوں پر فائز کئے گئے اور اعتبار و رسوخ پانے کے بعد ان کے بہت سے متوسلین بھی اعلیٰ خدمات و مناصب تک پہنچے۔ چنانچہ اکبر ہی کے وقت میں ۱۵۴ بڑے عہدہ داروں میں سے ۱۵ ہندو تھے[1]۔

منصبداری کی اصلاح

یہ تمام شاہی ملازمین بجز قضاۃ و علماء کے، خواہ وہ کسی کام پر لگا دیئے جائیں، ایک فوجی عہدہ دار کی حیثیت رکھتے تھے اور اس لئے ان کے مختلف مدارج کا اندازہ فوج کی اس

---

[1] عام فارسی تواریخ میں جابجا ان ہندو امرا کے حالات درج ہیں جنھیں صاحب مآثر الامرا نے سلیقے سے جمع کر دیا ہے (نیز دیکھو بلوخمین کا نوٹ، ترجمہ آئین جلد اول ۵۲۸)۔ مذکورۂ بالا سرداروں میں سے جے پور کے راجہ بھگوانداس (متوفی ۲۳ھ ۱۰ ۱۶۱۴ء) اور مان سنگھ (متوفی ۲۳ھ ۱۰ ۱۶۱۴ء) پنجہزاری منصبدار کے درجے تک ترقی کر گئے تھے جو سب سے ممتاز ارکین سلطنت اور شہزادوں کا منصب تھا۔ ٹوڈرمل ذات کا کھتری اور ان دونوں کے برخلاف اپنے مذہبی عقائد اور بت پرستی کا سختی سے پابند تھا، اور اسی لئے ابوالفضل اور ملا عبدالقادر (منتخب التواریخ جلد دوم صفحہ ۳۸۱) دونوں کا نشانۂ اعتراض ہوا اور ابوالفضل کا تو اس کے ساتھ ذاتی چشمک بھی رکھتا تھا۔ یہ قول مشہور ہے کہ ٹوڈرمل "در راستی و درستی و مردانگی و معاملہ شناسی و سرآہی ہندوستان یگانۂ روزگار بود۔ اگر تعصب پرستاری و تقلید دوستی و کینہ توزی نہ داشتے و برگفتہ خود نہ تنیدے، از معنوی بزرگاں بودے" (اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۵۶۹) مآثر الامرا میں بھی عالمگیر کی روایت سے اکبر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "تو ڈرمل در امور مالی و ملکی شعور تند و ذہن رسا دارد۔ اما استغنا و خود پسندی او خوش نمی آید" (مآثر جلد دوم ۱۲۷) منصب چہار ہزاری تک ترقی کی اور ۹۹۸ھ ۱۵۸۹ء میں وفات پائی لیکن ٹوڈرمل کی شہرت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ

جمعیت سے ہوتا تھا جو رسمی طور پر ان کے ماتحت سمجھی جاتی تھی مثلاً سب سے چھوٹا عہدہ دار "دہ باشی" یا دس سپاہی کا سردار کہلاتا تھا اور اسی طرح بیس تیس، سو، دو سو، ہزار، دو ہزار غرض اوّل اوّل پانچ ہزار اور بعد میں تیس ہزار تک ہر تعداد سپاہ کے سردار نامزد ہوتے اور "منصبدار" کہلاتے تھے۔ سپاہ کی جو تعداد منصب میں ظاہر ہوتی ہے کچھ ضروری نہ تھا کہ واقع میں منصبدار کے ماتحت ٹھیک اتنی ہی تعداد موجود ہو بلکہ اس تعداد کی تخصیص کا منشا صرف یہ تھا کہ اس عہدہ دار کی حیثیت اور درجہ نیز اس منصب کے مناسب حال تنخواہ مقرر ہو جائے۔ اسی کے ساتھ اسے لازمی طور پر فوج کی ایک مقررہ جمعیت کو فراہم اور احکام شاہی کی بجاآوری کے لئے مستعد رکھنا پڑتا تھا اور خزانہ شاہی سے منصبدار کو جو تنخواہ ملتی تھی اسی میں اس کے تمام مصارف اسپ و اسلحہ وغیرہ شامل ہوتے تھے جن کی تعداد سرکار سے مقرر اور معائنہ کی جاتی تھی۔ اور آئین اکبری کے نقشوں کو سامنے رکھ کر **بلوخ مین** صاحب نے حساب لگایا ہے کہ پنج ہزاری منصبدار کو جو تیس ہزار روپے ماہانہ سرکار سے ملتا تھا اس میں سے تقریباً بیس ہزار اسے انھی فوجی ضروریات میں دینا پڑتا تھا۔ اور اس طرح اس کی ذاتی تنخواہ دس ہزار روپے ماہانہ سے کچھ زیادہ رہ جاتی تھی[1]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۸) (عبدالمجید) آصف خاں اور مظفر خاں کی طرح "مالیات" کا ماہر سمجھا جاتا تھا اور ایک عرصے تک وزیر مال رہا۔ اگرچہ اس کے عہد وزارت میں محکمے کے لوگ بارہا ناخوش ہیں رہی لیکن "دہ سالہ" بندوبست کے قواعد و ضوابط اسی کی وزارت میں نافذ ہوئے اور اس لیے یہ "دستورالعمل" بعض اوقات اسی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے"

(یہاں یہ بیان کرنا مناسب ہے کہ صاحب مآثر الامراء نے ٹوڈرمل کو "لاہوری" لکھا ہے (جلد دوم ۱۲۳) لیکن یہ شاید کتابت کی غلطی ہے کیونکہ حال کی تحقیقات سے اس کی پیدائش لاہرپور (اودھ) کی ثابت ہوئی۔ بلوخمین ترجمہ آئین صفحہ ۶۲۰)

[1] ترجمہ آئین، صفحہ ۲۴۱۔ اسی طرح فاضل مترجم نے نمونے کے طور پر تین منصبوں کا حساب پیش کیا ہے:۔

(۱) پنج ہزاری (مشاہرہ جو خزانہ شاہی سے ملتا تھا = ماہانہ تیس ہزار روپیہ) تنخواہ بعد ادائے مصارف فوجی = ۱۰۶۳۷ روپے

(۲) ایک ہزاری (مشاہرہ جو خزانہ شاہی سے ملتا تھا ماہانہ آٹھ ہزار دو سو) تنخواہ

چہار صدی یا اس سے زیادہ کے منصبدار "طبقۂ امرا" میں داخل اور **خان** کے لقب سے ملقب ہوتے تھے مخصوص امرائے کبار کو **خان خاناں** کا لقب مل جاتا تھا۔ **میرزا** سرکاری طور پر صرف شاہی خاندان کے معزز افراد استعمال کر سکتے تھے اور انھیں بہ لحاظ مناصب مختلف امتیازات و اختیارات دیے جاتے تھے جن کی تفصیل یہاں موجب طوالت ہوگی۔ لیکن خاص طور پر یاد رکھنے کی یہ بات ہے کہ معمولی پٹواری، منشی، محرر، پیادہ و سوار یا ان سے بھی ادنیٰ کام کرنے والوں کے سوا (اور ان کی تعداد ظاہر ہے کہ بہت کثیر تھی) ہر بادشاہی عہدہ دار کوئی نہ کوئی منصب رکھتا تھا اور بادشاہ محض اپنی رائے اور پسند سے جو کام مناسب جانتا وہ اسے تفویض کر دیتا تھا۔ طبقۂ اعلیٰ کے منصب دار عموماً صوبے یا اضلاع کی حکومتوں پر مقرر کیے جاتے اور چھوٹے چھوٹے علاقے یا پرگنے بھی اکثر انھیں بطریق "جاگیر" دے دیے جاتے تھے کہ اس کا انتظام رکھیں اور مالگزاری وصول کریں۔ اس میں انھیں عام ملکی قوانین کی پابندی کرنی پڑتی تھی یعنی گو اپنی مقررہ فوجی جمعیت کی تنخواہیں اور مصارف غالباً وہ اسی مالگزاری سے وصول کر لیتے تھے مگر یہ لازمی نہ تھا کہ یہ پرگنے ان کی ذاتی یا موروثی جاگیریں ہوں یا وہ مالگزاری کو جس طرح چاہیں وصول و خرچ کریں۔ بلکہ درحقیقت وہ شاہی ملازم کی حیثیت رکھتے تھے اور خود انھیں تنخواہ خزانے سے نقد دی جاتی تھی۔

انتظامی عہدے۔ صوبہ دار

انتظامی عہدہ داروں میں سب سے اول صوبے کا حاکم ہے جسے عہد اکبری میں "سپہ سالار" کا لقب دیا گیا تھا مگر یہ (غالباً ابوالفضل کی منشیانہ) جدت قبول عام نہ پا سکی اور تھوڑے دن بعد اسے "ناظم" "نواب" "صوبہ دار" ہی کہنے لگے "نواب" جس کی معنی میں عجیب وسعت پیدا ہو گئی ہے نائب کی جمع ہے صوبہ دار پر "نواب" کا صیغۂ واحد میں استعمال کرنا بالکل موزوں تھا کیونکہ یہ عہدہ دار واقعی اپنے مقام پر بادشاہ کی بجائے کام کرتا تھا اور صوبے کے اندرونی معاملات میں اسے نہایت وسیع اختیار دے دیے جاتے تھے۔ لیکن یہ تاریخی بات خاص طور پر جتانے کے لائق ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے پہلے دور یا "سلطنت دہلی" کے زمانے میں صوبہ دار کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۹) بعد ادائے مصارف فوجی۔ ۱۵ ۳۰۱ روپے

(۳) "ایک صدی" یا "یوز باشی" (مشاہرہ جو خزانۂ شاہی سے ملتا تھا۔ ماہانہ سات سو) تنخواہ بعد ادائے مصارف فوجی۔ ۳۱۳ روپے

باب ۲

عدالتی مقدمات میں بہت کم اور انتظامی جنگی نیز مالی معاملات میں بہت زیادہ دخل ہوتا تھا۔ شیر شاہ نے مالگزاری کے جو قواعد و ضوابط نافذ کیے ان سے قدرتی طور پر صوبہ داروں کے مالی اختیارات محدود ہو گئے اور یہی صورت مغلوں کے زمانے میں رہی جس سے نظم و نسق میں ایک قسم کی یکسانی کے علاوہ رعایا کا ایک حد تک براہ راست بادشاہ سے تعلق پیدا ہو گیا۔ مگر اسی کے ساتھ اکبر کے زمانے میں قاضیوں اور مفتیوں کی جو ناقدری ہوئی اس نے مغل صوبہ داروں کا عدالتی تنازعات میں دخل بہت بڑھا دیا اور چونکہ اسلامی فقہ کے سوا اور کوئی مجموعہ قوانین ملک میں موجود نہ تھا اور یہ صوبہ دار اسلامی فقہ سے واقف نہ ہوتے تھے اس لیے اکثر اپنی عقل و رائے سے مقدموں کا فیصلہ کرتے تھے اور اس طریقے میں دو بڑی خرابیاں یہ تھیں کہ اول تو لوگوں کے سامنے جرائم کی نوعیت اور ان کے باہمی فرق کا کوئی قابل اطمینان معیار باقی نہیں رہتا تھا اور دوسرے یہ کہ حاکم کی ذات سے لوگ بہت خائف و مرعوب رہنے لگتے تھے جس سے اس کی مطلق العنانی کو اور تقویت پہنچتی تھی۔

فوجدار

صوبہ دار کے علاوہ مختلف اضلاع یا "چند پرگنوں" کے انتظام کے واسطے "فوجدار" بھی بادشاہ کی جانب سے مقرر ہوتے تھے جنھیں آج کل کی اصطلاح میں "ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ" کہنا غلط نہ ہوگا۔ صوبہ داروں کی طرح ان کا سب سے اہم کام یہ تھا کہ یہ سرکش زمینداروں یا دیہاتی گروہوں سے جبراً قانون کی پابندی کرائیں مگر حق یہ ہے کہ اس زمانے کے مفصل قواعد و ضوابط کے مقابلے میں ان عہدہ داروں کے فرائض و مدارج کو آئین اکبری میں ایسے طریقے سے بیان کیا ہے کہ بہت سی ضروری جزئیات کے متعلق ہم کوئی یقینی بات نہیں کہہ سکتے[1]۔

عدالت و کوتوالی

مقدمات کا فیصلہ قدیم رواج کے موافق گاؤں کی پنچایتیں کرتی تھیں اور شہر و قصبات نیز چھاؤنیوں میں سرکاری عدالتیں قایم کی جاتی تھیں جن میں قاضی تحقیقات کرتا اور فیصلہ سناتا تھا اور غالباً یہ عہد اکبری کا قانون ہے کہ ان فیصلوں کا نفاذ ایک دوسرے عہدہ دار "میر عدل" سے مخصوص کر دیا گیا تھا[2]۔ ہندوؤں کی اندرونی نزاعات میں پنڈتوں کی رائے قول فیصل

---

[1] ان انتظامی اور نیز مالی عہدہ داروں کے متعلق دیکھو آئین اکبری صفحات ۲۸۰ تا ۲۸۹۔ انگریزی ترجمہ (از جیرٹ) جلد دوم صفحات ۳۷ تا ۵۸۔

[2] آئین اکبری صفحہ ۲۸۳۔

مانی جاتی تھی۔ اور ان صدر عدالتوں کے علاوہ دیوانی اور مال کے اکثر مقدمات کا منصف اور عامل یا عمل گزار (یعنی کلکٹر) فیصلہ کرتے تھے جن کا مرافعہ قاضی کی عدالت میں ہو سکتا تھا ؎

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ بعض جرائم (جیسے چوری، جعلسازی، استحصال بالجبر) کے انسداد کے لئے کوتوال شہر کو تفتیش کے علاوہ سزا کا بھی کسی قدر اختیار تھا لیکن اس کی اصلی خدمت شہر میں محاصل تجارت کی وصولی مجرمین کی تفتیش و سزا دہانی اور عام امن و انتظام قائم رکھنا ہی سمجھنی چاہئیے اور دیہات میں یہی کام تھانہ دار انجام دیتے تھے اور ان کی عام نگرانی عاملوں کے ذمے تھی۔ واضح رہے کہ ان عہدہ داروں کی ماتحت جمعیت (یا پولس فورس) کی حیثیت ایک بیقاعدہ فوج کی سی ہوتی تھی اور ابوالفضل نے جس "سپاہ زمیندار" کی کل تعداد چوالیس[1] لاکھ سے بھی کچھ زیادہ بتائی ہے وہ اسی قسم کے بے قاعدہ اور نیم مسلح پیادہ سوار ہوتے تھے جنھیں بوقت ضرورت فراہم کرکے اس زمانے کی اصطلاح میں "جنگی پولس" یا "ٹندارمہ" کا کام لیا جاسکتا تھا ؎

فوج باقاعدہ

باقاعدہ فوج کی جو ہر وقت فوجی چھاؤنیوں میں رہتی تھی صحیح تعداد کسی مورخ نے نہیں لکھی اور غالباً وہ مستقل طور پر کبھی معین نہیں کی گئی۔ لیکن منصبداروں کی جدول پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً ایک لاکھ سوار ان کے ماتحت تھے جنھیں خزانۂ شاہی سے تنخواہ ملتی تھی اور خاص بادشاہ کے ماتحت بارہ ہزار بندوقچی اور تیرانداز و شمشیر باز پیادوں کی تعداد کثیر کے علاوہ چند ہزار احدی سواروں کی بھی ایک فوج لازم تھی جو منصبدار (یا فوجی سردار) نہ تھے مگر پانچ پانچ گھوڑے رکھتے اور نہایت معزز سپاہی سمجھے جاتے تھے چنانچہ ان میں سے اکثر پانچسو روپے مہینہ تنخواہ پاتے تھے ؎

ہاتھی بندوق و توپ

اکبر کو ہاتھیوں کا اور اپنے باپ دادا کی طرح جدید آتشی اسلحہ کا نہایت شوق تھا، اور شاہی فیل خانے میں پانچہزار سے زیادہ ہاتھی جمع ہو گئے تھے، توپوں اور بندوقوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہو سکتی[2] لیکن آئین اکبری میں لوہے کے صاف کرنے پگھلانے اور طرح طرح کی توپ و بندوق ڈھالنے کے حالات پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگی صنعت جیسے شمالی ہند میں آ بر رہنے

---

[1] آئین اکبری صفحہ ۱۷۵ ؎

[2] آئین اکبری میں صرف صوبۂ بنگالہ کے حالات میں لکھا ہے کہ مقامی فوج کے پاس چار ہزار دوسو ساٹھ توپیں تھیں (صفحہ ۳۹۳) اور اس سے ہم کثرت اتواپ کا قیاس کر سکتے ہیں ؎

باب ۲

رواج دیا تھا' عہد اکبری میں حیرت انگیز ترقی کر گئی تھی اور بڑی بڑی توپوں سے جنھیں کھینچنے کے لیے کئی کئی ہاتھی اور ہزاروں بیل لگائے جاتے تھے' سات من وزن تک کا گولہ چلایا جاسکتا تھا[1]!

یہ اطلاع بظاہر ناقابل یقین نظر آتی ہے کیونکہ آج کل بھی درآں حالیکہ دور گولہ پھینکنے اور آتش باری میں توپوں کو بہت ترقی دی گئی ہے۔ بہت کم بڑی توپیں ایسی ہوں گی جو اتنے وزن کا گولہ پھینک سکیں۔ اسی طرح یہ ایجاد بھی جسے ابوالفضل "کار آگہی کشور خدیو" کا نتیجہ بتاتا ہے قابل حیرت ہے کہ عہد اکبری کی نئی بندوقیں "بے فتیلہ آتش" صرف گھوڑا گرانے سے چل جاتی تھیں[2]! مگر تعجب ہے کہ مختلف قسم کی اصلاح یافتہ بندوقوں کے ذکر میں ابوالفضل "دونالی" بندوق کے متعلق کچھ نہیں لکھتا حالانکہ ہمیں یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ جنگ چوسہ (۹۴۶ھ) کے وقت ہی ہمایوں بادشاہ کے پاس ایسی بندوق موجود تھی[3]۔

مالیات:۔ تشیر شاہی آئین"

ہماری مذکورۂ بالا معلومات زیادہ تر آئین اکبری سے ماخوذ ہے اور گو جدید ضروریات تاریخی کے اعتبار سے یہ کتاب انتظامی اور فوجی محکموں کے حالات بیان کرنے میں کسی قدر ناکافی نظر آتی ہے تاہم اس نے عہد اکبری کے مالی انتظامات کو جس تفصیل و اہتمام کے ساتھ تحریر کیا ہے اس کی مثال فارسی زبان کی اور کسی تاریخی کتاب میں نہیں ملتی۔ ان آئین کے متعلق یہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ وہ شیر شاہی آئین کا نقش ثانی تھے اور ہر چند اس کے حاشیہ نشینوں میں

۱۔ آئین اکبری' صفحہ ۱۲۴۔ اصل کتاب میں بارہ[1] من لکھا ہے لیکن اکبری من' مسٹر مورلینڈ کی تازہ ترین تحقیقات کے بموجب آج کل کے (۵۶ پونڈ) ۲۵ سیر کے قریب وزن رکھتا تھا (انڈیا ایٹ دی ڈیتھ اوف اکبر' صفحہ ۵۳) جس کے حساب سے ابوالفضل کے "دوازدہ من" ہمارے سات ساڑھے سات من کے برابر ہوئے۔

۲۔ دسویں صدی ہجری میں یورپ میں بھی اسی قسم کی بندوقیں بننے لگی تھیں جن میں سنگ چقماق کے گھوڑے لگائے جاتے تھے کہ بندوق چلانے میں آگ دکھانے کی ضرورت نہ پڑے۔ لیکن ان کا عام رواج نہیں ہوا تھا (انسائی کلوپیڈیا جلد دوم صفحہ ۵۹۰) اور اس قسم کی کوئی شہادت یا قرینہ ہمارے سامنے موجود نہیں کہ ہم اس ایجاد کو ہندوستان میں اہل یورپ کا آوردہ خیال کریں۔

۳۔ یہ صاحب تذکرۃ الواقعات' جوہر کی روایت ہے جو ہمایوں کا "آفتابچی" اور خلوت و جلوت میں اس کے پاس رہتا تھا۔ وہ نہایت معتبر راوی مانا جاتا ہے اور اس کی کتاب میں ہمایوں کی ذاتی سوانح اور حالات کی بہت سی جزئیات محفوظ ہیں (دیکھو ترجمۂ ایلیٹ جلد پنجم صفحات ۱۴۰ و ۱۴۲)۔

باب ۲

کوئی ابوالفضل جیسا منشی نہ تھا کہ "آئین اکبری" سے پہلے "آئین شیر شاہی" یادگار چھوڑ جاتا۔ تاہم یہ اجمالی طور پر ہم کو اتنا معلوم ہے کہ سب سے اول اسی افغان بادشاہ نے شمالی ہند کے تمام دیہات کی یکساں اصول پر پیمائش اور تشخیص کرائی یعنی ہر مزروعہ زمین کی حیثیت و پیداوار کے مطابق اس پر مالیہ لگایا جو زیادہ سے زیادہ کل پیداوار کا ایک چوتھائی ہوتا تھا۔ اس انتظام کے لیے معمولی پٹواری، کارکن، قانون گو اور عامل کے علاوہ، معلوم ہوتا ہے کہ اسی نے چند "پرگنوں" کو ملا کر ایک "سرکار" کے ماتحت کر دیا تاکہ سرکار کے اعلیٰ عہدہ دار، سررشتہ مالگذاری کے چھوٹے ملازمین پر نگرانی رکھ سکیں اور ان کے مقامی اختلافات یا اغلاط کا بادشاہ یا صوبہ دار کی بجائے، قریب کے قریب ایک مالی عہدہ دار فیصلہ کر دیا کرے[1]۔

اکبری انتظامات

عہد شیر شاہ کے پرگنوں اور سرکاروں کی صحیح تعداد اور کل مالگزاری ہمیں معلوم نہیں اور اس کے بندوبست کے عملی نتائج میں سے صرف یہ دلچسپ اطلاع محفوظ رہ گئی ہے کہ اس کی سلطنت میں ایک لاکھ تیرہ ہزار دیہات تھے[2] لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں نظر آتا کہ عہد اکبری میں انہی اصول و قواعد کو اختیار کر کے رفتہ رفتہ زیادہ واضح اور مفصل بنا لیا گیا تھا اور ان کے نفاذ کے عملی نتائج آئین اکبری (جلد اول) کے تیسرے دفتر میں کافی شرح و بسط کے ساتھ ابوالفضل نے قلم بند کر دیے ہیں۔

اس تمام معلومات کا ضروری خلاصہ یہ ہے کہ صرف شمالی ہند کے ان بارہ صوبوں میں جن کے نام اور مقام پچھلے نقشے میں ہم پڑھ چکے ہیں ایک سو پانچ سرکاریں یا اضلاع تھے اور ہر سرکار کو بالاوسط پچیس پچیس پرگنوں یا محالات میں تقسیم کر دیا جاتا تھا جن کے لئے آج کل تحصیل یا تعلقے کی اصطلاح رائج ہو گئی ہے۔ مگر عہد اکبری کی سرکاریں اس زمانے کے (انگریزی) اضلاع سے رقبے میں بڑی اور پرگنے آج کل کی تحصیلوں سے چھوٹے ہوتے تھے اور مذکورۂ بالا بارہ صوبوں یا ایک سو پانچ سرکاروں میں ایسے پرگنوں کی کل تعداد دو ہزار سات سو سینتیس تھی۔

عہدہ دار

اول اول عہد اکبری میں عبدالمجید آصف خاں وزیر نے "نو زدہ سالہ"

---

[1] دیکھو تاریخ شیر شاہی مترجمۂ الیٹ، جلد چہارم صفحات ۴۱۳ و ۴۱۴۔

[2] دیکھو تاریخ شیر شاہی مترجمۂ الیٹ، جلد چہارم صفحہ ۴۲۲ (نیز حاشیۂ زیریں)۔

بندوبست کے قواعد تیار کیے تھے لیکن اس میں بہت سی خامیاں تھیں اور صیغۂ مالگذاری کی اصلی اصلاح **مظفر خاں** (تربتی) نے کی جو ۹۸۱ھ میں خطاب **جملۃ الملکی** سے سرفراز ہوا "و زمام حل و عقد امور چہار دانگ ہندوستان بید اقتدار اش تفویض یافت" پھر جب وہ معتوب ہوا تو یہ خدمت راجہ **ٹوڈرمل** اور خواجہ **شاہ منصور** وزیر کے سپرد ہوئی (۹۸۵ھ ۱۵۷۷ء) جنھوں نے اس "دہ سالہ بندوبست" کی تکمیل کردی جو وقتی ترمیم اور اصلاح کے بعد اصولاً آج تک ہندوستان میں نافذ ہے ؎

اس بندوبست میں ہر کھیت کی باقاعدہ پیمایش کے بعد اس کی اوسط پیداوار کے مطابق ایک حیثیت قرار دے کر سرکاری مالگزاری معین کی جاتی تھی لیکن قانون گو ہر فصل کی حالت کا معائنہ کر کے "خسرہ گرد آوری" علٰحدہ مرتب کرتا تھا اور "بتکچی" کی تصدیق کے بعد اسی فصلی اطلاع کے مطابق کاشتکاروں سے مالیہ وصول کیا جاتا تھا۔ یہ "بتکچی" جسے آج کل کی اصطلاح میں تحصیلدار سمجھنا چاہیے، نیا (ترکی) نام ہے اور پہلے کی تاریخوں میں نظر نہیں آتا بہت ممکن ہے کہ عامل یا عمل گزار (کلکٹر) کی امداد کے لیے عہد اکبری میں یہ نیا عہدہ بڑھایا گیا ہو مگر ابوالفضل نے اس کی کوئی صراحت نہیں کی اور شبہہ ہوتا ہے کہ کہیں اسی نے محض اپنی منشیانہ جدت سے کسی پرانے عہدے کا نام بدل کر یہ نئی اصطلاح نہ بنادی ہو! بہر حال ہر سرکار میں تشخیص و وصول مالگزاری کا اصلی ذمہ دار عامل یا عمل گزار ہوتا تھا اور جیسا کہ اشارۃً ہم اوپر لکھ چکے ہیں اسے بعض انتظامی اختیارات بھی دے دیئے جاتے تھے اور خزانے کا علٰحدہ دفتر بھی اس کی نگرانی میں رہتا تھا ؎

کل مالگزاری۔ اس دہ سالہ بندوبست کے بعد سرکاری طور پر شمالی ہند (اور کابل) کے بارہ صوبوں کی کل مالگزاری کوئی پونے چار ارب دام یا نو کروڑ روپے سے کچھ زیادہ قرار پائی تھی اور زراعت و آبادی کی ترقی، نظم و نسق کی اصلاح اور خوبی نیز دکن کی فتوحات سے اس میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا تھا جس کے متعلق حال میں بڑی موشگافیاں کی گئی ہیں اور امید ہے اس بارے میں آگے چل کر ہمیں بھی کچھ لکھنے کا موقع ملے گا۔ لیکن سب سے مقدم اور ضروری بات یہ ہے کہ ہم اس زمانے کے روپے کی اصلی قیمت کا صحیح اندازہ کریں تاکہ یہ بھی معلوم ہو جائے کہ

۱؎ ملاحظہ ہو مآثر الامرا جلد سوم صفحات ۲۲۳، ۲۲۵، نیز آئین اکبری، ۳۴۸ ؎

اس وقت کا ایک کرور عملاً ہمارے کتنے کرور کے مساوی ہوتا تھا!

سکہ اور اسکی قوت خرید

یوں تو اکبر کے عہد میں بائیس تیئیس قسم کی اشرفیاں، اور چاندی اور تانبے کے متعدد سکے رائج کئے گئے تھے جن پر دلچسپ اشعار اور طرح طرح کے نقش و نگار کندہ کئے جاتے تھے اور مجموعی طور پر یہ صنعت نمایاں ترقی کر گئی تھی۔ لیکن سکے کی اصلاح کا اصلی بانی شیر شاہ افغان ہے جس نے دور لامرکزیت کی بے شمار خرابیوں کو دور کر کے تمام شمالی ہندوستان میں، معدنی قیمت کے مناسب چاندی اور تانبے کے سکے کی قیمت مقرر کی اور وہ "روپیہ" اور "دام" یا "پیسہ" رائج کیا جن کے نام کو اکبر کی زبردستی بھی لوگوں سے ترک نہ کرا سکی۔ چنانچہ اکبر کا جلالہ یعنی روپیہ اور اس کی ذریات (درب = اٹھنی، چرن = چونی، پانڈو = ⅕ روپیہ، اشٹ = دونی وغیرہ) کے اب کوئی نام بھی نہیں جانتا مگر شیر شاہ کا "روپیہ" تا حال سلامت ہے۔

یہ روپیہ موجودہ روپے ہی کے برابر، ساڑھے گیارہ ماشے کا ہوتا تھا اور اس زمانے میں چاندی اور تانبے کی قیمت کا باہمی تناسب بھی (ایک تولہ چاندی = ۶ء ۲۷ تولہ تانبا) قریب قریب وہی تھا جو آج کل ہے چنانچہ گو اس وقت روپے کے چالیس دام یا پیسے ملتے تھے مگر وہ پیسہ موجودہ پیسے سے وزن میں کچھ زیادہ ہوتا تھا۔ البتہ چاندی کی افراط کی وجہ سے آج کل سونے کے مقابلے میں اس کی قیمت سولھویں صدی عیسوی کی نسبت تقریباً ایک تہائی رہ گئی ہے[۱]۔

عام فراغت و آسودگی

بایں ہمہ جب ہم پڑھتے ہیں کہ اس وقت میں فی روپیہ تقریباً دو من گیہوں تین تین من جو اور چنے، پندرہ بیس سیر ترکاری، پندرہ سیر عمدہ گوشت گوسفند، آٹھ سیر گھی، من بھر دودھ، ۶ سیر مصری، ۲ سیر قند سفید، اور قریب قریب اسی ارزانی کی مناسبت سے کابل و کشمیر کے خشک و تر میوے مل جاتے تھے، تو پھر مورلینڈ کا یہ قول بھی صحیح نہیں نظر آتا کہ سولھویں صدی عیسوی کے اخیر کا ایک روپیہ ۱۹۱۲ء کے سات روپے کے مساوی ہوتا تھا[۲]۔ کم سے کم اب ۱۹۲۰ء میں تو

[۱] آئین اکبری کے علاوہ، سکے اور اس کی قیمت وغیرہ کا صحیح اندازہ کرنے میں ہم نے اڈورڈ ٹامس کی قابل تحسین تحقیقات سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے (کرانکلز صفحات ۴۰۴ تا ۴۱۰) اور مورلینڈ کی تازہ کتاب "انڈیا ایٹ دی ڈیتھ اوف اکبر" بھی پیش نظر ہے۔

[۲] "انڈیا ..... اوف اکبر" صفحہ ۵۶۔ مورلینڈ صاحب کا یہ کہنا کہ ہندوستان میں اس وقت سفید شکر یا بورے کے سوا آج کل کا سا "قند" نہ ہوتا تھا ایسی طفلانہ ناواقفیت کا ثبوت ہے جو شاید صرف انگریز "مصنفین" کی

(انگریزی) روپے کی قوت خرید اکبری روپے کا ایک تیرھواں حصہ رہ گئی ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ
اکبر کی نو کروڑ روپے مالگزاری آج کل کے حساب سے تقریباً سوا ارب روپیہ یعنی اس زمانہ کے
تمام انگریزی علاقہ ہند کی (زرعی) مالگزاری سے کم از کم تین گنی تھی! حالانکہ یہ انگریزی علاقہ اکبر کے
دوازدہ صوبوں سے رقبے اور آبادی میں کہیں زیادہ ہے اور مزروعہ زمین کا رقبہ بھی پہلے کی
نسبت بہت بڑھ گیا ہے۔ لیکن یہ ملک جو پہلے دولتمندی میں ضرب المثل تھا اب افلاس
ومحتاجی میں شہرۂ آفاق ہے چنانچہ یہاں والوں کی محنت کا روپیہ یہیں رہنے کی بدولت
اس وقت عام کسان بھی اتنے خوشحال تھے کہ شیر شاہ نے سرکاری مالگزاری کی شرح پیداوار
کا ایک ربع اور اکبری وزراء نے زیادہ سے زیادہ ایک ثلث قرار دی تھی اور آج کل اس شرح کی
تین چوتھائی رقم بھی سرکار وصول نہیں کر سکتی بلکہ جو کچھ وصول کرتی اس کی نسبت بھی شکایت
ہوتی ہے کہ اس نے کسانوں کو نہایت نادار کر دیا ہے۔

تیسری فصل - مذاہب اور علوم

اکبر کی حکومت کا بیشتر زمانہ سولھویں صدی عیسوی میں گزرا۔ اس زمانے میں ہندوستان میں اسلام کی
اشاعت اور مسلمانوں کو آباد ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ اور مسلمانوں اور ہندوؤں کی باہمی بود و باش سے
ایک دوسرے کے مذہبی خیالات و رسم و رواج پر بھی کسی قدر اثر پہنچا تھا۔ ہندوؤں میں برہمنی تعلیم کے اس
جوش و خروش میں اب فرق آچلا تھا جو راجہ ہرش کے عہد حکومت میں تھا۔ کبیر اور نانک کے ماننے والے اب
جن باتوں کی تعلیم ملک میں پھیلاتے تھے وہ اسلامی عقائد سے کسی قدر مشابہ تھیں۔ اسلامی اثر کے پھیلنے میں کسی قدر
آسانی اس وجہ سے بھی ہوتی رہی کہ ہندو مذہب اپنے اعلیٰ مدارج میں ایک قسم کا دقیق فلسفہ تھا جو ہر خاص و عام
کی ضروریات کو ایک ہی طریقے پر اس طرح آسانی سے رفع نہیں کر سکتا تھا جیسے کہ ایک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۶) تحریریں ہی میں نظر آئے گی۔ غریب یورپ کو تو لفظ "شوگر" بھی اہل مشرق سے ہاتھ لگا ہے
مگر مورلینڈ صاحب کو یقیناً اس بات کا گمان بھی نہ ہوگا کہ نصف صدی پہلے تک شمالی ہندوستان میں جو
قند و مصری عام طور پر بنائی جاتی تھی وہ شیرینی اور خالص ہونے کے اعتبار سے آج کل کی ولایتی قند (شوگر)
سے کہیں بہتر ہوتی تھی۔ مذکورۂ بالا نرخ اجناس کے لئے دیکھو آئین اکبری صفحہ ۶۰ وغیرہ ۱۲
۲ یہ فصل صفحہ (۱۳۱) تک مولوی عنایت اللہ صاحب سابق ناظم دارالترجمہ نے تحریر فرمائی ہے۔

تبلیغی مذہب کر سکتا ہے۔ اسلام کی مثل وہ غیر مذہب والوں کی دعوت نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے ضرور تھا کہ اسلامی حقائق کی اشاعت میں مسلمان واعظوں کی کوششیں سر سبز ہوتی رہیں۔ اور علاوہ ایسے لوگوں کے جو دائرۂ اسلام میں آچکے تھے ہندوؤں کے بعض گروہوں کے معتقدات پر بھی اسلام کا اثر پہنچے۔ مگر اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے عقائد پر بھی ہندوؤں کے اخلاق و رسم و رواج کا اثر اس طرح نظر آیا کہ جہاں کہیں داعیان اسلام کی تعلیم نومسلموں میں کسی وجہ سے ناتمام رہی وہاں قدیم مذہب کے آثار کسی قدر باقی رہ گئے اور چونکہ مسلمان خواہ باہر کے ہوں خواہ اسی ملک کے نومسلم ہوں سب ایک جگہ ملے جلے رہتے تھے اس لئے بہ حیثیت مجموعی یہی نظر آیا کہ مسلمانوں کے عقائد پر بھی ہندو مذہب ایک حد تک اپنا اثر کر رہا ہے۔ البتہ یہ سچ ہے کہ جہاں کہیں مسلمانوں نے ہندوؤں کے علوم و مذاہب سے علمی واقفیت پیدا کرنی چاہی وہاں ان کے فلسفۂ مذہب کی ایسی باتیں جو اسلامی عقائد سے مشابہت رکھتی تھیں قدر کی نگاہ سے دیکھی گئیں۔ بہرکیف یہ ضروری بات ہے کہ جب ایک عرصے تک ایک ہی ملک میں دو مختلف مذاہب کے لوگ دوستی و آشتی کے تعلقات رکھ کر بود و باش رکھیں تو ان کے مذہبی خیالات میں ایک قسم کی آمیزش نظر آنے لگے ہ

لیکن علاوہ اس خلط ملط حالت کے جو ہند و مسلمانوں کے تعلقات نے اس ملک میں پیدا کر رکھی تھی ان ملکوں میں جو بہت عرصے سے خصوصیت کے ساتھ اسلامی تھے خود مسلمانوں میں بہت سے اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ اسلام اپنے وطن سے جس سادہ اور نورانی شکل میں توحید و اعمال حسنہ کی تعلیم دینے نکلا تھا گو اس کی تعلیم میں نہ کبھی فرق آیا ہے اور نہ آئے گا لیکن جب اسلامی فتوحات نے مسلمانوں کو ایشیا کے شایستہ ترین ملکوں میں آباد کر دیا تو ان کو دین کی اشاعت کے لیے بہت سے ایسے پرانے مذہبوں کی چھان بین کا موقع ملا جو ایک زمانے سے علوم عقلیہ بالخصوص فلسفۂ یونان سے متاثر چلے آتے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کو بھی ان علوم کی طرف توجہ ہوئی۔ اس سے قبل کسی قدر اصولی اختلافات پر چند مشہور فرقے مثلاً شیعہ۔ خارجی۔ سنی۔ مسلمانوں میں قایم ہو چکے تھے اور فروعی اختلافات نے ان میں سے ہر ایک کو خاص خاص فرقوں و جماعتوں میں منقسم کر دیا تھا لیکن جب یونان کے فلسفے کا رواج مسلمانوں میں ہوا تو اختلافات بڑھ کر فرقوں کی تعداد میں اور اضافہ ہو گیا۔ اور جن اہل تصوف کے عقائد میں فلسفہ کا دخل تھا ان میں اختلافات نے اپنا رنگ جمایا۔ مسئلۂ وحدت وجود کے پردے میں شاعروں اور آزاد خیال لوگوں نے

ایسے خیالات ظاہر کیے جو ملحدانہ سمجھے گئے۔ ایک زمانہ آیا کہ مہدویت کی تحریک نے زور پکڑا اور پرانی پیشین گوئیوں کے اعتقاد پر کسی نے خفیہ اور کسی نے علانیہ مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ چونکہ ان پرانے اسلامی ملکوں سے ہندوستان میں مسلمانوں کی ہمیشہ آمد و رفت رہتی تھی۔ اس لئے جو مختلف فرقے اور عقائد وہاں پیدا ہوئے وہی یہاں بھی پیدا ہو گئے۔

اکبر کا زمانہ جب آیا تو مسئلۂ وحدت وجود کے ماننے والے اس ملک میں بکثرت موجود تھے مہدویت کی تحریک نے بھی ملک میں ہل چل ڈال رکھی تھی۔ سلیم شاہ سوری کے زمانے میں مہدویت کے زبردست حامی شیخ علائی کا دور دورہ رہ چکا تھا۔ یہ سید محمد جونپوری کے خلفاء میں سے تھے۔ سید محمد جونپوری اپنی علمی قابلیت ذاتی اوصاف اور فصاحت بیان کی وجہ سے قابل ذکر ہیں۔ ہزاروں آدمی ان کے گرویدہ ہو گئے۔ مہدویت کی تحریک سے ان کا مطلب صرف یہ تھا کہ دین کے بارے میں جو اختلافات اور فاسد خیالات پیدا ہو گئے ہیں ان کی کسی طرح اصلاح کی جائے۔ شیخ علائی نے اس خدمت کے انجام دینے میں ایسی سختی کی کہ سنی علماء ان کے دشمن ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلیم شاہ سوری نے ۹۵۵ھ ۱۵۴۸ء میں شیخ علائی کو قتل کرا دیا۔

خلاصہ یہ کہ دور اکبری جس وقت شروع ہوا ہے تو اس ملک میں مختلف اسلامی و غیر اسلامی فرقوں کے معرکے گرم تھے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ بادشاہ وقت کو ہر ایک فرقے کے عقائد کی تحقیق و تفتیش کا شوق فطری طور سے تھا جس نے بعض مورخوں کی نظروں میں مذہبی اعتبار سے اس ملک میں ایک طوفان بے تمیزی برپا کر دیا۔

اکبر کی تخت نشینی پر سلطنت کا کل انتظام اس کے اتالیق بیرم خاں کے سپرد تھا۔ جب یہ معزول ہوا تو پھر انھی اہل دربار کا اقتدار بڑھا جنھوں نے سلیم شاہ سوری کے زمانے میں شیخ علائی کو مہدویت کے الزام میں قتل کرایا تھا۔ اب پھر مہدوی فرقے کے لوگوں پر سختیاں شروع ہوئیں۔ اور انھی سختیوں کا شکار اب ایک ایسا شخص ہوا جس کی اولاد کو آئندہ اکبر کے دربار سے بہت قریب کا تعلق ہونے والا ہے۔ یہ مشہور صاحب علم و فضل شیخ مبارک بن خضر تھا۔ شمالی راجپوتانہ کے شہر ناگور میں پیدا ہوا تھا۔ اور کچھ عرصے سے دارالحکومت آگرہ میں سکونت پذیر تھا۔ علمائے دربار کو اس کی طرف سے مہدویت کا شبہ ہوا۔ بادشاہ [illegible] شکایت کی گئی اور شیخ مبارک جان کے خوف سے آگرے سے فرار ہوا۔ انتہائی سختی و مصیبت [illegible]

مبتلا ہو کر برسوں خانہ برباد رہا۔ آخرکار بادشاہ کے ایک عزیز کی سفارش سے یہ بدگمانی رفع ہوئی
اور اس کے دو فرزند ابوالفیض فیضی اور ابوالفضل آئندہ اکبر کے دربار کے نامی گرامی شاعر اور
ندیم ہوئے۔

ابوالفیض فیضی شاعری میں یکتائے روزگار مانا گیا۔ اس کے قصائد غزلیں اور مثنوی
نل دمن فارسی کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہیں۔ قرآن مجید کی بے نقط تفسیر سواطع الالہام
اس کی حیرت انگیز یادگار ہے۔ فیضی کے علم و فضل کی شہرت نے بیس اکیس برس ہی کی عمر میں
اسے اکبر کے دربار تک پہنچا دیا (۹۷۴ھ / ۱۵۶۶ء) اس کا چھوٹا بھائی ابوالفضل علامی بھی علم و فضل میں
برابر رتبہ رکھتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اپنے حسن لیاقت و کارگزاری سے اکبر کا مشیر خاص
بن گیا اور عہدۂ وزارت پر سرفراز ہوا (۹۸۳ھ / ۱۵۷۵ء)۔ جو مورخ اکبر کو لامذہب اور اسلام سے
قطعاً منحرف سمجھتے ہیں ان کے خیال میں اس بادشاہ کے مذہب میں جس قدر خرابیاں پیدا ہوئیں
وہ خاصکر ان ہی دو بھائیوں[1] یعنی فرزندان شیخ مبارک کی وجہ سے ہوئیں مگر یہاں یہ دیکھنا ہے
کہ اکبر کے مذہبی خیالات کی نسبت جو اکبر کی تاریخ کا ایک اہم مضمون ہے معاصرین نے
کیا رائے زنی کی ہے۔

ہندوستان کے شاہان مغل سنی المذہب تھے۔ اکبر بھی ان میں سے تھا۔
پس ان کی رعایا میں سنیوں کے جس قدر گروہ تھے وہ بادشاہ وقت کو اپنے ہی طریقے کا
پابند دیکھنا پسند کرتے تھے۔ چونکہ مسلمانوں میں سلطنت ہمیشہ دین کے مطابق ہونی چاہیے
اس لئے مشیران دولت میں علمائے دین کا موجود ہونا ضروریات سے تھا اور چونکہ اسلامی شریعت

---

[1] فیضی نے ۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۶ء میں وفات پائی۔ ابوالفضل شہزادہ سلیم کے اشارے سے ۱۰۱۱ھ / ۱۶۰۲ء میں قتل کر دیا گیا۔
ابوالفضل کے قتل کا قصہ یہ ہے کہ خاندیس اور احمد نگر کی فتوحات کے بعد اکبر اس کو دکن میں چھوڑ آیا تھا
تاکہ وہاں کی انتظامی مشکلات کا تصفیہ کرے۔ شہزادہ سلیم کو ایک عرصے سے خیال ہو گیا تھا کہ ابوالفضل کے
کہنے سننے سے باپ اس سے ناراض رہتا ہے۔ اب جس وقت وہ دکن سے واپس آئے گا تو میری اور شکایتیں
کرے گا۔ چنانچہ جس وقت ابوالفضل دکن سے تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ آگرے واپس آنے لگا تو شہزادہ سلیم نے
بندھیل کھنڈ کے ایک رئیس بیرسنگھ کو لکھا کہ ابوالفضل کا راستے میں کام تمام کر دے۔ چنانچہ اس رئیس نے
ابوالفضل کو اسی سفر میں قتل کر دیا۔

بادشاہ سے بالاتر ہے اس لئے بادشاہ کو قابو میں رکھنا علما اپنا فرض سمجھتے تھے تاکہ سلطنت کی کشتی
دین کے مطابق ان کے فتووں سے چلائی جائے۔ وہ اپنے طریقے سے بادشاہ کا سر موتجاوز کرنا
ہرگز گوارا نہ کر سکتے تھے۔ اکبر کی طبیعت میں شروع ہی سے مذہب کے متعلق کسی نہ کسی بات کی
تلاش و جستجو ضرور رہتی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ابتدا میں اس کی مذہبی تعلیم یا تو بالکل ہی نہیں ہوئی تھی
یا اگر ہوئی تھی تو وہ ایسے طرز کی نہ تھی کہ آئندہ کسی وقت میں غیروں کے عقائد سن کر اس کی طبیعت
متاثر نہ ہوتی۔ اسی عدم تعلیم یا تعلیم کی خاص نوعیت یا طبیعت کے ایک خاص رنگ نے جو
پیدائشی تھا اس میں تحقیق مذہب کا شوق ایسا بڑھایا کہ وہ اپنی حد سے گزر گیا۔ اور حالت یہ ہوئی کہ
نہ صرف مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے عقائد کی چھان بین میں مصروف ہوا بلکہ غیر مسلموں کے
عقائد کی طرف بھی متوجہ ہوا اور ان میں بہت سی خوبیاں مان کر ان پر عمل کرنے لگا نتیجہ یہ ہوا کہ
جو رعایا بادشاہ وقت کو شروع میں اپنا ہم مذہب سمجھتی تھی وہ اس سے بدگمان ہونے لگی۔
اپنوں سے تغافل اور غیروں پر لطف ہی شکایت کے لئے کچھ کم نہ تھا۔ چہ جائیکہ غیروں کے
مذاہب سے ان کی باتوں کا انتخاب و التقاط کر کے ان پر یقین ظاہر کرنا اور اپنے علماء کے
اثر و قابو سے باہر ہو کر ان کو آنکھیں دکھانا۔ غرض کہ اس طبقے کو کچھ زمانے کے بعد اکبر کے
اقوال و افعال میں وہ چیزیں نظر آنے لگیں جو ان کے اعتقاد کے مطابق اس کو نہایت آسانی سے
بے دین اور اسلام سے برگشتہ بلکہ اس کا دشمن ثابت کرنے کے لئے کافی تھیں۔ اس قسم کی شکایتوں
اور اعتراضوں کے جمع اور آشکارا کرنے والے اکبر کے دربار کے مشہور قاری و مورخ
ملا **عبدالقادر** بدایونی صاحب منتخب التواریخ ہیں یا یہ سمجھئے کہ اس ملک کے مورخوں میں
وہی ایک خاص ذریعہ ہیں جس سے اکبر کے کفر و الحاد کی باتیں اکبر کے مرنے کے بعد دنیا پر
ظاہر ہوئیں۔ ملا صاحب نے اکبر کے مذہبی خیالات کی نیرنگی و بے ثباتی اور ان کے اسباب کو
نہایت شرح و بسط سے بیان کیا ہے اور جو لوگ اکبر کے خیالات میں ان تبدیلیوں کا باعث
ہوئے تھے ان کو کبھی کاذب و طامع کبھی ملحد و کافر کبھی بے دین و بدبخت کے جملوں سے
یاد کیا ہے۔ اکبر کے آئین و قوانین نقل کر کے بتایا ہے کہ کس طرح یہ چیزیں اسلام کی توہین اور
مسلمانوں کی ذلت اور نقصان جان و مال کا باعث ہوئیں۔ گر شہنشاہ کی کل رعایا ایسی ہی
راسخ العقیدہ نہ تھی۔ کثرت سے غیر مسلم قومیں اور ایسے مسلمان بھی موجود تھے جو حکیمانہ مذاق رکھتے تھے
اور مطلق العنان بادشاہوں کی خاص ضروریات کو محسوس کر کے مذہبی رواداری کو جائز سمجھتے تھے

ان لوگوں نے مذاہب غیر کے متعلق اکبر کے طرز خیال و عمل کو شاہانہ خصائل کا ایک زیور سمجھا اور ایک ایسے بادشاہ کی عزت ان کے دل سے کم نہیں ہوئی جو اپنی تمام رعایا کے مروجہ مذہبوں میں کوئی نہ کوئی خوبی دیکھ کر سب کی عزت کرتا ہے اور سب کے ساتھ رواداری کا مسلک رکھتا نظر آتا ہے۔ اس طبقے کے خیالات کا ظاہرا پیدا کرنے والا اکبر کے دربار کا مشہور ندیم شیخ ابوالفضل صاحب اکبر نامہ و آئین اکبری ہے جس نے اکبر کی حمایت و ستایش میں اپنی پوری لیاقت صرف کی ہے۔ اگر بخیال خود دین و شریعت کی آڑ لے کر ملا عبدالقادر نے اکبر پر اپنا ترکش خالی کیا ہے تو حکیمانہ ستایش کے رنگ میں ابوالفضل نے اکبر کو آسمان پر چڑھایا ہے۔ ممکن ہے کہ دونوں نے زیادتی کی ہو اور حقیقت حال کچھ اور ہی ہو۔

اکبر کا عہد حکومت ۹۶۳ھ (۱۵۵۶ء) میں شروع ہوا اور تقریباً پچاس برس رہا۔ شروع زمانے میں یعنی ۹۸۳ھ سے پہلے اکبر کے عقائد پر ان مسلمانوں کو کسی اعتراض کا موقع نہیں ملا جو اپنے ہم مذہب بادشاہ پر درصورت اختلاف اعتراض کرنے کا اپنی دانست میں حق رکھتے تھے۔ البتہ ۹۸۳ھ سے ۹۸۷ھ کی مدت میں اکبر کے مذہبی خیالات نے وہ وہ رنگ پلٹے جس سے اس کی سنی رعایا نے بالعموم سمجھ لیا کہ بادشاہ اس کے طریقے کا قطعی مٹانے والا پیدا ہوا ہے۔ ۱۰۰۲ھ تک یہی حالت نظر آتی ہے۔ اس کے بعد اکبر کے انتقال تک جو زمانہ تقریباً دس برس کا گزرا اس میں اس کے مذہبی خیالات کا کچھ حال نہیں کھلتا۔ کیونکہ جو مورخ علانیہ یا درپردہ اس کے حالات قلمبند کر رہے تھے انھوں نے اپنی کتابیں اسی زمانے میں ختم کر دی تھیں اور ان کتابوں کے علاوہ پھر کوئی ذریعۂ معلومات پیدا نہ ہوا۔

ـــ ۱ یورپ کے چند پادریوں نے جو مغربی ساحل ہند پر اس وقت موجود تھے اکبر کے حالات میں کتابیں لکھی ہیں۔ اس مضمون سے ان لوگوں کو دلچسپی کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ شروع میں اکبر کو عیسائی مذہب میں شامل کر لینے کا پورا یقین رکھتے تھے۔ مگر اخیر میں ان کو مایوسی ہوئی۔ گو وہ خود لکھتے ہیں کہ اکبر نے دربار عام میں اسلام باضابطہ طور پر ترک کیا۔ مگر یہ خیال ان کی روح کی تسکین کے لیے کافی نہ تھا۔ حال کے انگریزی مورخوں نے ان پادریوں کے بیانات کی تائید کہیں ملا عبدالقادر کے بیان سے کی ہے اور کہیں ملا عبدالقادر کے بیان کی تائید ان پادریوں کے کلام سے کی ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ ملا عبدالقادر صاحب نے جس زور قلم سے اکبر کے کفر کو بیان کیا ہے وہ عیسائی پادریوں کو بھی نصیب نہیں ہوا۔ اس لیے اکبر کی زندگی کے اس پہلو کے دکھانے میں

۹۸۳ھ ۱۵۷۵ء سے پہلے بادشاہ کو فتوحات عظیمہ پے در پے حاصل ہوئی تھیں۔ دائرہ مملکت روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ مراد کے موافق کام بر آتے تھے۔ اطمینان خاطر حاصل تھا سمجھتا تھا کہ اب جہاں میں کوئی مخالف باقی نہیں ہے۔ اکثر اوقات خدا اور رسولؐ کے ذکر میں بسر کرتا۔ تصوف کے مسائل حکمی وفقہی بحثیں سنتا۔ راتوں کو عبادت الٰہی میں مصروف رہتا۔ خدا کی نعمتوں کے شکر میں بطریق نیازمندی روز صبح کو ایک چوڑی سی سل پر بیٹھ کر مراقبہ کرتا۔ منعم حقیقی کی تعظیم نے اس کے دل میں جگہ پکڑ لی تھی۔ تھوڑا عرصہ ہوا تھا کہ پٹنے کی مہم سے کامیاب واپس آکر قصر شاہی کے باغ میں جہاں پہلے شیخ عبداللہ نیازی کا حجرہ تھا ایک عالیشان عمارت تیار کرائی تھی۔ اور اس کا نام عبادت خانہ رکھا تھا۔ غرض اس عبادت سے یہ تھی کہ عقائد اسلامیہ اور مسایل حکمیہ پر بحث کرنے کے لیے منتخب لوگ جمع ہوا کریں اور بادشاہ کی موجودگی میں بلا خوف وخطر گفتگو کریں۔

اس عمارت یعنی عبادت خانے میں وقتاً فوقتاً جو صحبتیں اہل علم وفضل کی رہیں وہ اکبر کے شوق تحقیق یا جنون تحقیق پر اچھی روشنی ڈالتی ہیں۔ ہر جمعے کی نماز کے بعد یہاں بادشاہ ایک مجلس کرتا جس میں مشائخ وعلماء وسادات وچند منتخب امرا کے سوا کوئی دوسرا طلب نہ ہوتا۔ کچھ عرصے کے بعد یہ مجلس شب جمعہ کو ہونے لگی۔ کل مکان بڑے اہتمام سے آراستہ کیا جاتا۔ بادشاہ کے شوق کا یہ حال تھا کہ تمام تمام رات مجلس میں بیٹھتا۔ شروع میں اہل مجلس جہاں جگہ پاتے تھے وہاں بیٹھ جاتے تھے۔ مگر آگے چل کر مقام نشست وتقدیم وتاخیر پر جھگڑے کھڑے ہو گئے۔ بادشاہ نے اس قصیے کو رفع کرنے کے لیے مشائخ وعلماء وسادات وامرا کی نشست کے لئے عبادت خانے میں ایک ایک سمت علیحدہ مخصوص کر دی جس وقت مجلس میں سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر آجاتے تو بادشاہ ان کی صفوں میں باری باری پھرتا اور ہر ایک جماعت سے باتیں اور مقاصد کی تحقیق کرتا۔

کچھ دنوں یہی حالت رہی۔ مگر پھر کسی قدر ایسے اثر بادشاہ کی طبیعت پر پڑنے لگے جو علماء کے نزدیک سنی عقائد کے مطابق نہ تھے۔ ۹۸۳ھ ۱۵۷۵ء ہی میں گیلان سے حکیم ابو الفتح جو مذہب میں ایک آزاد خیال سا آدمی تھا بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو کر اپنی لیاقت کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۲) ہمارے لئے ملا صاحب ہی کی کتاب کافی ہے۔ اور کسی ذریعہ معلومات سے مدد لینے کی ضرورت نہیں۔

زور سے مقربین میں شامل ہوا اس کے کچھ عرصے بعد ملا محمد یزدی ایران سے آیا یہ شیعہ تھا۔ اپنے عقیدے کے مطابق خلفائے ثلاثہ پر طعن کرتا۔ اور بادشاہ کو اپنے طریقے پر لانا چاہتا تھا۔ اس نے بھی دربار میں رسوخ پایا۔ اسی زمانے میں ہگلی سے چند عیسائی بادشاہ کے پاس آئے جن سے بادشاہ نے عیسوی مذہب کی باتیں دریافت کیں لیکن یہ عیسائی پادری پیشہ نہ تھے اس لئے بادشاہ کے سوالات کا خاطر خواہ جواب نہ دے سکے پھر بھی جو عقائد انھوں نے بیان کئے ان میں سے بادشاہ نے جن کو اپنی عقل کے مطابق سمجھا پسند کیا۔ ۹۸۴ھ میں شریف آملی ملکوں ملکوں پھرتا پھراتا مالوہ پہنچا یہاں دیپال پور میں بادشاہ کا لشکر پڑا تھا۔ بہت سے ایرانی امرا ہمرکاب تھے۔ شریف ان ایرانیوں میں پہنچا اور ظاہر کیا کہ میں دسویں صدی کا مجدد ہوں یعنی اسلام میں ایک ہزار برس گزرنے کی وجہ سے جس قدر خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ ان کی اصلاح کے لئے ظاہر ہوا ہوں۔ اس کی خبر بادشاہ تک پہنچی۔ فوراً شریف طلب کیا گیا اور بادشاہ اس کی باتوں کو سن کر ایسا خوش ہوا کہ اس کو بھی اعیان دولت میں جگہ مل گئی۔ علمائے اہل سنت وجماعت میں سے عبادت خانے کی مجلسوں کے دو بڑے زبردست رکن مولینا عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی تھے مولٰنا عبداللہ سلیم شاہ کے وقت سے مرجع خاص وعام تھے۔ اکبر کے باپ ہمایوں نے ان کو مخدوم الملک اور شیخ الاسلام کا خطاب دیا تھا۔ اسلامی سلطنتوں میں شیخ الاسلام کے رتبے کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ کسی بادشاہ کا صاحب تخت وتاج ہونا نہ ہونا اسی کے فتوے پر منحصر ہوتا تھا۔ مولٰنا عبدالنبی بھی اپنے وقت کے بڑے عالم تبحر تھے۔ ان کو اکبر نے ۹۷۱ھ میں صدرالصدوری کا عہدہ دیا تھا۔ صدرالصدور کے اختیارات اکبر کے زمانے میں بھی ایک عرصے تک نہایت وسیع رہے۔ ملک کے تمام قاضیوں اور میران عدل پر اس کو افسری حاصل تھی۔ بے دینوں اور اہل بدعت پر موت کا فتویٰ جاری کرسکتا تھا۔ مسلمانوں میں فقیروں یا درویشوں یا دیگر اہل استحقاق کو بادشاہ کی طرف سے جو زمینیں بطور معافی کے دیجاتی تھیں ان کی تقسیم وتفویض کے متعلق اس کو کامل اختیارات حاصل ہوتے تھے۔

جس مجمع میں بڑے بڑے صاحب فضیلت جمع ہوں اور وہاں مختلف المشرب لوگ بھی حاضر ہوں اور بحث ومناظرے کے لئے مشکل وپیچیدہ مسائل پیش ہوں اور فریقین میں ہر شخص اپنے تئیں کامل فن سمجھتا ہو تو پھر حالت اختلاف میں جوش وخروش کا پیدا ہوجانا

کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ لامحالہ بحثوں میں حدت بڑھی۔ علماء نے تعارض و تقابل کی تلواریں سونت لیں اور تقریر کرنے والے جوش و خروش کے ساتھ تقریریں کرنے لگے۔ ایک مرتبہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک عالم نے دوسرے عالم کو بدبخت و ملعون کہہ کر مارنے کو عصا سنبھالا اور کچھ دور پیچھے دوڑا بھی۔ شہنشاہ کو جو ان موقعوں پر موجود رہتا تھا یہ حرکتیں ناگوار گزرنے لگیں۔ ایک مرتبہ اس کو غصہ بھی آگیا مگر ملا عبد القادر کے ایک لطیفے[1] نے بادشاہ کے غصے کو ٹھنڈا کر دیا۔ رفتہ رفتہ شیخ عبد النبی کے خلاف سنی و شیعی حنفی و شافعی بحث اپنی حد سے گزر گئی۔ مخدوم الملک نے شیخ صاحب کی نسبت ایک رسالے میں طرح طرح کی تہمتیں لگا کر جن میں بعض ان کے فرائض منصب صدر الصدوری سے متعلق تھیں ان کے پیچھے نماز پڑھنی ناجائز قرار دی۔ اس پر شیخ صاحب نے مخدوم الملک کی تجہیل و تضلیل کی اور اس طرح کچھ لوگ اس طرف اور کچھ لوگ اس طرف ہو کر دو مختلف گروہ بن گئے اور تنازع اس حد کو پہنچا کہ مصالحت دشوار ہوی۔ غرض جب حالت یہ ہوئی کہ علما کا ایک فریق جس بات کو حق بتائے دوسرا اس کو باطل ٹھیرائے تو بادشاہ سمجھا کہ دونوں غلطی پر ہیں چنانچہ رفتہ رفتہ وہ ان عالموں سے بدعقیدہ ہوتا گیا اور ان کی باہمی مخالفت سے سمجھ گیا کہ جس چیز کی اس کو تلاش ہے وہ ان کی بحث و تکرار میں نہ ملے گی۔ اس فیصلے کی وجہ کسی قدر یہ بھی تھی کہ اس پر ایسے عقائد کا عمل شروع ہو گیا تھا جو اہل سنت وجماعت سے اختلاف رکھتے تھے۔ اور یہ غضب اور ہوا تھا کہ بعض مسائل کی تحقیق میں جن کے نتیجے کا اثر بادشاہ کے ذاتی افعال پر پڑتا تھا خاطر خواہ جواب نہ ملنے پر علما کی طرف سے کدورت پیدا ہو گئی تھی۔ بادشاہ کے مقربین جن میں علمائے دین کے علاوہ امرا و ندما بھی شامل تھے گو سب بڑے پائے کے لوگ تھے مگر آپس میں دوست نہ تھے پرانی کاوشیں دل میں بھری تھیں[2] ایک دوسرے کو بے دین و بد باطن

---

[1] اکبر نے ایک روز ملا عبد القادر سے کہا کہ آئندہ جو شخص اس جماعت میں کوئی نامعقول بات کہے تو اس کی مجھے اطلاع دی جائے میں اس شخص کو مجلس سے اٹھادونگا۔ ملا عبد القادر نے یہ حکم سن کر آصف خاں سے آہستہ سے کہا کہ اس طرح تو اکثر علما مجلس سے اٹھادئے جائیں گے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ ملا کیا کہتا ہے۔ آصف خاں نے جو کچھ سنا تھا عرض کیا۔ بادشاہ ملا صاحب کی بات سن کر خوش ہوا اور اس کا ذکر اپنی مجلس میں اپنے مقربین سے کیا

[2] ابو الفضل کو مخدوم الملک سے کاوش تھی۔ کیونکہ انھوں نے ابو الفضل کے باپ شیخ مبارک کی شکایت

زمانہ ساز اور خوشامدی سمجھتا تھا۔ علما کی طرف سے بادشاہ کی نظریں پھری دیکھتے ہی سب نے شیخ عبدالنبیؒ اور مخدوم الملک پر الزاموں کے طومار پر طومار باندھ دیئے اور ان پر ایسا عرصہ تنگ ہوا کہ ۹۸۷ھ (۱۵۷۹ء) کے اواخر میں دونوں صاحبوں کو اکبر کے حکم سے مکۂ معظمہ جانا پڑا۔ بادشاہ نے شیخ صاحب کو میر حاج مقرر کر کے کچھ روپیہ دیا کہ حرمین شریفین میں مستحقین کو تقسیم کر دیں۔ شیخ صاحب غالباً ۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء) میں صدر الصدوری کے عہدے سے علحدہ ہو چکے تھے۔

۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء) میں عبادت خانے کی مجلسوں کا کچھ اور ہی رنگ ہو چلا۔ شروع میں یہاں صرف مسلمان ہی بحث کے لئے طلب کیے جاتے تھے۔ اور مسائل بھی جس قدر بحث کے لئے پیش ہوتے تھے وہ اسلامی ہوتے تھے۔ گو بادشاہ پر غیر مسلم عقائد کا اثر پڑتا جاتا تھا۔ لیکن اثر غالب ابھی تک شیعی۔ اور فیلسوفانہ خیالات کا تھا۔ ۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء) سے غالباً عبادت خانے کے جلسوں میں غیر مسلم بھی باریاب ہونے لگے مگر جب ان کی کثرت ہوئی اور علمائے دین اس مجمع سے کشیدگی اختیار کرنے لگے تو پھر اس قسم کے مناظرے خاص قصر شاہی یا خلوت خانے میں ہونے لگے اور عبادت خانے کی مجلسیں غالباً بند ہو گئیں۔ ہندوؤں کے رسم و رواج سے تو طبیعت کسی قدر ہمیشہ سے مانوس تھی کیونکہ محل میں ہندو رانیاں موجود تھیں مگر اب ہندو مذہب کے متعلق بھی بادشاہ نے برہمنوں سے سبق لینا شروع کیا۔ پرکھوتم برہمن جس نے سنگھاسن بتیسی کی شرح لکھی تھی اور دیبی برہمن کو بادشاہ سے خلوت ہونے لگی۔ یہ لوگ راتوں کو بادشاہ کی خوابگاہ کے سامنے جو فصیل سے ملی ہوئی تھی جھولے میں بیٹھے معلق حاضر رہتے۔ علاوہ ان برہمنوں کے بیان ہوا ہے کہ شیخ تاج الدین دہلوی (تاج العارفین) بھی اسی طرح بادشاہ کے پاس پہنچتے اور ایسی باتیں جو خلاف شریعت تھیں بادشاہ کو سمجھاتے۔ قرآن اور حدیث میں تاویلات کرتے۔ انھوں نے بادشاہ کو انسان کامل بنا کر اس کی ذات کو اقدس ٹھیرایا اور اس کے لیے سجدہ تجویز کیا۔ دیبی برہمن نے بتوں اور آگ اور سورج کے ساتھ اساطین مذہب ہنود یعنی برہما۔ شیو۔ اور وشنو اور مہامائی کے احترام کے طریقے سکھائے۔ بادشاہ کو خالق کا اوتار بتایا غرض جس زمانے میں لوگ سمجھ رہے تھے کہ بادشاہ انواع و اقسام کی مذہبی تعلیم حاصل کر رہا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۵) اکبر سے اس کی ہمدردیت کے بارے میں کی تھی۔ اور شیخ مبارک کو مدت تک مصیبت کی حالت میں دربدر پھرنا پڑا تھا۔

اسی زمانے میں بادشاہ کو عیسائیوں پارسیوں اور جینیوں کی طرف بھی خاص توجہ ہوئی ۔

گوا میں پرتگیزی عیسائیوں کی حکومت تھی ۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء) میں بادشاہ نے ان کے پادریوں کو دربار میں طلب کیا۔ چنانچہ ان کی ایک جماعت دور و دراز کا سفر طے کر کے غالباً ۹۸۷ھ (۱۵۷۹ء) میں فتح پور سیکری پہنچی۔ اکبر نے فوراً ان سے ملاقات کی اور ان کی خاطر و مدارات پر ابوالفضل کو مقرر کیا۔ پادریوں نے انجیل کا ایک نسخہ جو چار زبانوں میں تھا بادشاہ کو پیش کیا۔ بادشاہ نے انجیل کی بہت تعظیم کی اور اس کو بوسہ دیا۔ شہزادہ مراد کو جس کی عمر اس وقت دس برس کی تھی انجیل کی عبارت پڑھنے کے لئے کہا۔ پادریوں کا بیان ہے کہ بادشاہ نے ان کو حکم دیا کہ شہزادے کو پرتگیزی زبان اور مسیحی اخلاق سکھائیں۔ پادریوں کی درخواست پر بادشاہ نے ان کو علانیہ وعظ کہنے کی اجازت دی۔ مگر خود عیسائی مورخ لکھتے ہیں کہ یہ پرتگیزی عیسائی اس درجہ متعصب و پلید زبان رکھتے تھے کہ ایک پادری کی تقریر سن کر بادشاہ بھی ناراض ہو گیا۔ شہر کے لوگوں کا یہ حال تھا کہ اگر بادشاہ ان پادریوں کی خاص طور پر حفاظت نہ کرتا تو ان کو اپنی جان بچانی مشکل ہو جاتی۔ یہ پادری سمجھتے تھے کہ اکبر کو عیسائی کر لیں گے مگر جب قطعی مایوسی ہوئی تو اپنے دل کو یہ صبر دے کر کہ عیسائی نہ ہوا تو کیا ہے مسلمان تو نہ رہا اپنے گھروں کو واپس گئے۔ اکبر نے کچھ زمانے کے بعد ان پادریوں کے تحفے اور انجیل کا نسخہ جو انھوں نے نذر دیا تھا واپس کر دیا ۔

۹۸۷ھ (۱۵۷۹ء) میں جب کہ بادشاہ کی جلوت و خلوت میں غیر مسلموں کا ہجوم ہو چکا تھا چند واقعات ایسے پیش آئے کہ سنی المذہب رعایا کو بالعموم اور بھی برانگیختگی ہوئی اسی سال کے ماہ جمادی الاول میں ایک دن جمعے کو فتح پور سیکری کی جامع مسجد میں منبر پر بیٹھ کر بادشاہ نے خطبہ پڑھا۔ یہ خدمت پہلے خطیب جامع مسجد کے سپرد تھی۔ لیکن یہ سن کر کہ ائمۂ ہدیٰ اور خلفائے راشدین نے اس خدمت کو اپنے ذمے رکھا تھا بادشاہ نے بھی یہی طریقہ اختیار کرنا چاہا۔ اور منبر پر بیٹھ کر شیخ ابوالفیض (فیضی) کا لکھا ہوا خطبہ جو فارسی نظم میں تھا پڑھا۔ اول تو خلاف دستور خطبہ فارسی نظم میں پڑھا اور پھر وہ بھی فیضی کا لکھا ہوا جس کو مسلمانوں کا ایک خاص طبقہ لامذہب سمجھتا تھا اور ایسے بادشاہ کا پڑھنا جس کے مذہب میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہو چلے تھے مسلمانوں کو سخت ناگوار گزرا ۔

اسی سنہ میں یعنی ۹۸۷ھ (۱۵۷۹ء) میں ایک محضر تیار ہوا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ سلطان عادل

کا مرتبہ مجتہد سے بڑھ کر ہے۔ اکبر چونکہ بڑا عادل و عاقل و خدا ترس بادشاہ ہے اس لیے کسی مسئلے میں اگر مجتہدوں کو اختلاف ہو تو بادشاہ کا فیصلہ ناطق سمجھا جاوے۔ بشرطیکہ یہ فیصلہ احکام قرآن کے خلاف نہ ہو۔ کہتے ہیں اس محضر کا مسودہ شیخ ابوالفضل کے باپ شیخ مبارک کا لکھا ہوا تھا جس نے کئی برس پہلے سے بادشاہ کے دل میں یہ خواہش پیدا کر دی تھی کہ ریاست دنیوی کے ساتھ جو بادشاہ ہونے کی وجہ سے حاصل تھی ریاست دینی بھی اپنی ذات میں مجتمع کر لے۔ اور اس طرح مسلمانوں کے دین و دنیا دونوں کا ہادی و سردار بنجاوے۔ اس محضر کی تیاری کے وقت مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی مکہ معظمہ نہیں گئے تھے۔ چنانچہ ان دونوں بزرگوں نے بھی اور لوگوں کے ساتھ اس پر اپنی مہریں کر دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں سنی عالم اکبر میں ایسی قابلیت نہیں سمجھتے تھے کہ وہ مسلمانوں کا امام عادل بنایا جاوے۔ اس لئے ضرور کسی مجبوری سے انھوں نے اپنی مہریں کی ہوں گی۔ بہرکیف اگر یہ محضر کوئی اثر رکھتا تھا تو ان کی تصدیق سے بادشاہ کو یہ اختیار ضرور مل گیا کہ جب مجتہدین کسی مسئلے میں اختلاف کریں تو بادشاہ اپنی عقل سے مگر نص قرآنی کے مطابق اس مسئلے کا فیصلہ کر دے اور اس کی تعمیل سب مسلمانوں پر فرض ہو۔ اس قسم کے اختیار کو ایسے مسلمان جو اکبر سے بدظن ہو گئے تھے اس کے ہاتھ میں دیکھنا کب پسند کر سکتے تھے۔

اسی زمانے میں بادشاہ کو زردشتیوں کے عقائد کی طرف توجہ ہوئی۔ گجرات میں شہر نوساری موبدان زردشتی کا صدر مقام تھا۔ اس وقت ماد بارجی رانا آتش پرستوں کا سب سے بڑا دستور تھا۔ غالباً ۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء) میں یہ اکبر کے دربار میں حاضر ہوا۔ اور آتش پرستی کے رموز بادشاہ پر ظاہر کیئے۔ اس کی تعلیم کا بادشاہ کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ محل شاہی میں ایک آتشکدہ بنوا کر اس میں آگ روشن کرائی۔ اور ابوالفضل کو حکم ہوا کہ آگ بجھنے نہ پائے۔ اس واقعہ کے چند سال بعد کچھ تو ماہ یارجی کی تعلیم سے اور کسی قدر راجہ بیربل کے اثر صحبت سے ہندی و زردشتی (دونوں قسم کی آتش و آفتاب پرستی کو اکبر نے اپنی عبادت میں شامل کیا اس میں کسی قدر اثر ہندو رانیوں کا بھی تھا جو محل میں ہوم کی رسم ادا کیا کرتی تھیں۔ اس رسم کو بھی آتش پرستی سے تعلق تھا۔

اس کے کچھ عرصے بعد بادشاہ کو جین مت والوں کی طرف توجہ ہوئی جینیوں کے گرو ہیراوجی سوری اور دو اور گرو گجرات سے پیادہ پا بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بادشاہ کو جیو رکھشا کے بہت سے سبق پڑھائے۔

جب اکبر کی اس فراخ مشربی اور عموم مہر افزائی کا حال تمام ملک میں مشہور ہوا

تو مسلمانوں میں بالخصوص بنگال و بہار کے رہنے والوں میں ایک شورش پیدا ہو گئی۔ گو چند دنیاوی امور بھی اس شورش کی اصلی وجہ تھے۔ غرض اکبر سخت ملامتوں اور مذہبی الزاموں کا نشانہ بنایا گیا۔ جن میں خاص خاص الزام یہ تھے کہ پہلے تو محض بادشاہ تھا پھر پیغمبری کا مدعی ہوا۔ مجتہد تو بنا ہی تھا پھر اپنے تئیں مہدی زماں بھی سمجھنے لگا۔ اپنا کلمہ جاری کیا ہے جس میں خدا کا خلیفہ بنا ہے۔ صرف پیغمبری کا نہیں بلکہ نعوذ باللہ خدائی کا بھی دعویٰ کرتا ہے "اللہ اکبر" کا جملہ سلام کی جگہ زبان ہی سے ادا نہیں کیا جاتا بلکہ ہر قسم کی تحریروں کی پیشانی پر بھی لکھا جاتا ہے جس کے احتمالی معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ "اکبر خدا ہے"۔ تاج العارفین کی تعلیم سے انسان کامل بن کر تقدس حاصل کیا ہے اور اپنے لئے سجدہ تجویز کیا ہے جو محض خدا کے لئے ہے اور اس کا نام بدل کر زمین بوس رکھا ہے۔ ایک مجموعی الزام یہ تھا کہ دین احمدی سے منکر ہوا ہے بت پرستوں اور عیسائیوں کا معتقد بنا ہے جو رسول عربی کے دشمن ہیں۔ آپ کی شان میں بے ادبی کے الفاظ سننے گوارا کر لیتا ہے۔ عربی کی تعلیم کو تضیع اوقات سمجھکر اس کی جگہ ریاضی و ہندسہ و نجوم و حکمت کو رواج دینا چاہتا ہے۔ سنہ ہجری جو آنحضرت صلعم کے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تشریف لیجانے کی یادگار ہے اس کی جگہ اپنا سنہ جلوس جاری کیا ہے اور اس کا نام تاریخ الٰہی رکھا ہے۔ یہ سمجھ کر کہ اسلام کو عنقریب ایک ہزار برس منقضی ہونے والے ہیں اور اب اس دین کی مدت ختم ہوتی ہے اسلام کی ایک تاریخ ہزار سالہ لکھوائی ہے جس کی ابتدا نبی پاک کی وفات سے رکھی ہے گویا آپ کی سیرت مبارک کا ذکر ہی اس تاریخ سے خارج ہے۔ ایک اعتراض یہ تھا کہ سنی نہیں رہا مذہب تشیع اختیار کیا ہے۔ خلفائے ثلاثہ پر طعن بڑے شوق سے سنتا ہے۔ ایرانی امرائے شیعی پر خاص نظر عنایت ہے۔ ایک اور الزام یہ تھا کہ برہمنی و زردشتی مذہب کا معتقد اور جین مت والوں کا حامی بنا ہے۔ آگ اور روشنی کو پوجتا ہے۔ زنار باندھتا ہے۔ قشقہ کھینچتا ہے۔ آتش پرستوں کی عیدین مناتا ہے۔ نور کی تعظیم کے لئے جس وقت چراغ جلتے ہیں تو کھڑا ہو جاتا ہے۔ زردشتیوں کے دنوں اور مہینوں کے نام اختیار کر لئے ہیں۔ گاؤ کشی ممنوع قرار پائی ہے جو ایسا کرے وہ واجب القتل ٹھیرے۔ سال میں سو دن گوشت خواری کی ممانعت ہوئی ہے۔ ہندوؤں کی دلجوئی اور خاطر طرح طرح سے منظور ہے۔ جزیہ موقوف کیا ہے۔ ڈاڑھی منڈاتا ہے ہندوؤں کی طرح قریب کے رشتہ داروں میں شادی بیاہ کرنے کی مسلمانوں کو بھی ممانعت کی جاتی ہے۔ اور سب میں بڑھ کر یہ ہے کہ اپنا ایک مذہب ہی نیا ایجاد کیا ہے جس کا نام دین الٰہی یا توحید الٰہی رکھا ہے۔

اس میں توحید کو مان کر باقی جس قدر احکام کسی مذہب کے متعلق ہو سکتے ہیں ان کا وضع و جاری کرنے والا خود بنا ہے۔ جو لوگ اس مذہب میں شامل ہوتے ہیں وہ بادشاہ کو اپنا مرشد مانتے ہیں اور بادشاہ اپنے مریدوں کو جوگیوں کی اصطلاح میں چیلا کہتا ہے۔ جس طرح ہندو اپنے محبوب پر تن من دھن وارتے ہیں اسی طرح اپنی وفاداری کے لئے چہارگانہ مراتب اخلاص مقرر کئے ہیں۔ یعنی جو شخص بادشاہ کی خیر خواہی میں جان و مال و دین و ناموس ترک کرے اس کو ان چاروں چیزوں میں سے ہر ایک کے لئے ایک درجہ دیا جاتا ہے بادشاہ کے بعض خاص مریدوں نے دین الٰہی میں شامل ہونے کی پہلی شرط یہ قرار دی ہے کہ اسلام پر تبرا بھیجیں۔ چنانچہ انھوں نے اس مضمون کے خطوط بادشاہ کو بھیجے ہیں۔ غرض یہ اور ان سے بھی بڑھ کر الزام محض الزام کے طور پر نہیں بلکہ مصدقہ جرائم کی صورت میں ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ میں لکھے ہیں جس کے ماننے والے اب تک موجود ہیں ؎

اب دوسرے پہلو پر نظر کیجئے تو اکبر نامہ میں بادشاہ کے مذہبی خیالات کا چربہ ابوالفضل نے بھی اتارا ہے۔ مگر ابوالفضل کا نقطۂ نظر ملا عبدالقادر سے بالکل جدا ہے۔ ملا صاحب نے ملت بیضاء و شریعت غرا کی براہین سے اکبر اور اکبر کے بگاڑنے والوں پر ایسا وار کیا ہے کہ ایک تسمہ لگا نہیں چھوڑا۔ ابوالفضل نے ان حملوں کی یا تو کچھ پرواہی نہیں کی یا کہیں کہیں محض عقل و حکمت کی سپر سے ان کو روکنا چاہا ہے۔ دونوں کا اندازہ ہر شخص اپنی عقل اور اعتقاد سے کرسکتا ہے اکبر کے مذہبی تخیلات پر جو لوگ معترض ہوئے ان میں سے ابوالفضل بعض کو تو تیرہ رائے۔ آشفتہ عقل۔ ہرزہ درا فتنہ اندوز لکھتا ہے اور بعض کو تقلید و تعصب میں مبتلا سمجھتا ہے۔ بادشاہ کی نسبت لکھتا ہے کہ اس نے مختلف مذاہب و مشارب کی دلائل و براہین کی تنقیح کے لئے اور اس غرض سے کہ کسی طرح کھرا کھوٹے سے علٰحدہ ہو جائے اہل علم و عمل اور اہل وطن سے استفادہ چاہا صوفی متکلم فقیہ سنی شیعہ۔ برہمن جینی عیسائی۔ زردشتی اس کی مجلسوں میں جمع ہونے اور خودپرستی اور رعونت سے علٰحدہ ہو کر حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتے جو لوگ ان مجلسوں میں کسی اور نیت سے شریک ہوئے ان کو سوائے رسوائی کے کچھ حاصل نہ ہوا بعض لوگ ایسے بھی شریک ہوئے جنھوں نے باوجود قائل و معقول ہونے کے زبان درازی اور سینہ زوری اختیار کی۔ مگر ایسے لوگوں کو اخیر میں شرمندہ ہو کر علٰحدہ ہونا پڑا۔ ان لوگوں کا منشا یہ تھا کہ جیسے پہلے بادشاہوں کے زمانے میں مسائل علمی کی تشخیص کمتر کیجاتی تھی اور اس سے ان لوگوں کی بات قائم رہتی تھی۔ اسی طرح اب بھی سینہ زوری سے وہ اپنا کام نکال لیں گے مگر ایسا نہ ہوا۔ بادشاہ نے

شمع تحقیق روشن کی سب کے خیالات کسوٹی پر چڑھائے گئے۔ اور جس کو جو فائدہ پہنچنا تھا وہ پہنچا۔
ابوالفضل نے اکبر کے ایسے اقوال بھی نقل کئے ہیں جن سے ظاہر ہو کہ وہ خدا پرست تھا جس مذہب میں جو خوبی اس کی عقل تسلیم کرتی تھی اس کو اختیار کرتا خدا پرستی کا ایک حصہ سمجھتا تھا آفتاب کی تعظیم کرتا تھا مگر اس لئے نہیں کہ آفتاب خدا ہے بلکہ خدا کی ایسی بنائی ہوئی چیز ہے جس سے دنیا میں ہزاروں نعمتوں کا ظہور ہے اور اس کی تعظیم کرنی فی الحقیقت خدا کے کاموں کی تعریف کرنی ہے۔
جب بعض خوشامدی یا سریع الاعتقاد بادشاہ کے کوائف اور حقیقت حال کو دیکھ کر اس کو مظہر حق سمجھنے لگے اور یہ کیفیت دیکھ کر دوسروں نے اعتراض شروع کئے کہ اکبر پیغمبری اور خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تو بادشاہ ان اعتراضوں کو سن کر بار بار کہتا تھا کہ "سبحان اللہ! ان نادانوں کے دل میں یہ بات کیونکر آتی ہے کہ میں ایک امکانی حادث درماندہ طبیعت خدائی کا دعویٰ کروں۔ انبیا کا گروہ کہ ہادیان آفاق ہے جس نے اپنے اعجاز دکھا کر نبوت کا اظہار فرمایا ہو۔ جس پر ایک زمانہ گزر چکا ہو اور جس کی ہدایتیں دنیا میں مدت سے چلی آتی ہوں اور ہمیشہ ترقی پر ہوں پھر کوئی پوچھے کہ میرے دل میں گروہ انبیا سے ہونے کا خیال کیونکر آ سکتا ہے۔ معلوم نہیں کہ ان ظاہر بینوں کے دل میں یہ بدگمانی کیونکر پیدا ہوئی مگر جو لوگ صاف باطن ہوتے ہیں ان کو ایسے طعن و تشنیع سے اور فروغ ہوتا ہے اور وہ ان تیرہ رایوں کی سرزنش نہیں کرتے۔ جہاں اکبر کے الزام دینے والے کہتے تھے کہ دین و علمائے دین کی عزت اس کے دل سے اٹھ گئی ہے اور ان کی تذلیل و تحقیر کر کے غیر مسلموں کی توقیر کرتا ہے۔ وہاں بادشاہ کے خیر خواہ جواب دیتے تھے کہ "پہلے بادشاہوں کا دستور تھا کہ علمائے تعصب آمیز کے فتووں پر غیر مسلموں کو ایذا اور نقصان پہنچانا باعث ثواب سمجھا جاتا تھا۔ ان فتووں کی بنا پر بیگانوں سے ان کا مال و اسباب۔ عیال و اطفال کو چھین لینا ایک قسم کی عبادت جانتے تھے۔ مگر فی الحقیقت وہ عبادت نہ تھی بلکہ ایک قسم کی نفس پرستی تھی اکبر نے جس کو طریقہ معاش و معاد میں عقل خدا داد حاصل تھی صلح کل کی بساط بچھائی اور خلائق کے ہر طبقہ و جماعت کو یکساں شمار کیا۔ اس کا قول تھا کہ خالق نے ہر مذہب و ملت کی مخلوق پر اپنا در فیض کھولا ہے۔ اس کا لطف عام سب پر شامل ہے۔ پس بادشاہ جو ایزد متعال کا سایہ ہے اس پر واجب ہے کہ وہ تخالف و تنازع دینی کو منظور نظر نہ رکھے اور خدا کے بندوں کو ایک ہی نظر سے دیکھے اور اپنی عنایت کے پرتو کو آفتاب کے نور کی طرح نیک و بد پر یکساں چمکائے۔ اور ہندو مسلمان گبر و ترسا اور دیگر

تمام مذاہب کے ماننے والوں سے صلح اختیار کرے۔"

خلاصہ اس مضمون کا یہ ہے کہ ملا عبدالقادر بدایونی کی تحریر سے یہ استنباط ہوتا ہے کہ اول شہنشاہ اکبر اپنے تئیں ان تمام حقوق کا مستحق سمجھا جو بادشاہ کے خدا کی طرف سے مقرر ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں کا مجتہد بنا اور پھر پیغمبری کا دعویٰ کیا اور پھر خدا بنا اور پھر اپنا ایک نیا مذہب بھی دین الٰہی یا توحید الٰہی کے نام سے ایجاد کیا۔ یہ تمام حرکتیں ایسی تھیں جنھوں نے اکبر کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا اور وہ ایک بے دین اور ظالم بادشاہ مسلمانوں کے حق میں ثابت ہوا۔ ابوالفضل کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے نہ کبھی خدا ہونے کا دعویٰ کیا نہ پیغمبر ہونے کا۔ اور ان دونوں باتوں کے باطل ہونے کو خود اکبر کے اقوال سے ثابت کیا ہے۔ مجتہد البتہ وہ اپنے تئیں اس معنی میں جانتا تھا کہ اگر مسلمان غلط کام کریں تو احکام قرآن کے بموجب وہ سیدھے راستے پر لائے جائیں۔ غرض ابوالفضل کے نزدیک اکبر اپنی مسلم غیر مسلم دونوں قسم کی رعایا میں ایک ہر دل عزیز بادشاہ تھا جس نے ہندوستان میں ہندو مسلمان کبر و صغیر سب کو ایک ہی سلسلۂ اخوت میں باندھنا چاہا۔ بزرگان دین کی عقیدت اس کے دل میں ہمیشہ رہی چنانچہ حضرت خواجہ معین چشتیؒ اور حضرت خواجہ سلیم چشتی قدس سرہٗ کے ساتھ جو ارادت اس کو تھی وہ اظہر من الشمس ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اکبر ہمیشہ حق کی تلاش کے سوالات کیا کرتا تھا مگر کبھی اس کو جواب ایسا نہ ملا کہ اس کے دل کو تشفی ہو جاتی۔ گو اس کا دماغ حق پژوہ تھا مگر وہ ہرگز ایسا قوی نہ تھا کہ ان برگزیدہ نفوس کے سائے تک پہنچ سکتا جنھوں نے دنیا میں اپنی حق یابی سے حق پرستی کا لاکھوں دلوں میں نقش جما دیا ہو۔ اکبر کا دین الٰہی کوئی مستقل مذہب نہ تھا۔ جوگیوں اور فقیروں کے ایک معمولی پنتھ سے زیادہ اس کی حقیقت نہ تھی اور پنتھ بھی ایسا جو زیادہ دن نہ چل سکا۔ چند شاعروں یا طامع مسلمانوں یا خوشامدی نوکروں کے سوا کسی نے اس کو اختیار نہیں کیا۔ یہ قلت اشاعت ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس طریقے کی تبلیغ میں بادشاہ نے اپنے شاہی اقتدارات سے ہرگز زیادہ کام نہیں لیا۔ نہ ان کی اشاعت میں کچھ کوشش کی نہ اپنے اختیارات کو کام میں لایا اور نہ کسی کو اس مذہب کے اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ اکبر کے مرتے ہی اکبر شاہی دین الٰہی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔[1]

---

[1] ختم تحریر مولوی عنایت اللہ صاحب۔

باب ۲

صوفی اور محدث

جس وقت فتح پور سیکری کے شاہی محلوں میں مذہب پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں ہو رہی تھیں پرانی دلی کے کھنڈروں میں بیٹھ کر ایک پردیسی درویش نے آتش توحید کو یکایک ایسا بھڑکایا کہ اس کا اثر دور دور پہنچ گیا۔ ہماری مراد خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ سے ہے جو اسی دسویں صدی کے آخری یا گیارھویں صدی کے ابتدائی سنین میں کابل سے دہلی تشریف لائے۔ اور صوفیہ کرام کے سلسلۂ نقشبندیہ کے طریقے میں معارف اور حقائق اسلامی کی تعلیم دینی شروع کی جس سے صدہا طالبین حق کے سینے منور ہو گئے۔ ۱۰۰۰ھ/۱۶۰۰ء میں شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمۃ (۹۷۲ھ/۱۵۶۴ء ولادت - ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء وفات) نے خواجہ باقی باللہ کی جانشینی کا شرف حاصل کیا۔ آپ کو مسلمانوں کی جماعت کثیر نے مجدد الف ثانی تسلیم کیا۔ آپ نے علمائے ظاہر و باطن کو ایک ہی نقطۂ اتحاد پر جمع کیا اور مدلل طریقے پر بار بار اس اصول کو واضح کیا کہ اسلامی تصوف شریعت کا خادم ہے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمۃ کے ہی آستانے کے فیض یافتہ اور حضرت مجدد شیخ احمد سرہندیؒ کے ہمعصر شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۹۵۸ھ/۱۵۵۱ء - ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء وفات) تھے اور یہ آپ ہی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ علوم اسلامیہ کی درس و تدریس کو جو اکبر کے زمانے میں سست پڑ گئی تھی پھر ترقی ہوئی۔ آپ کے کسی قدر بعد کے لوگوں میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اس عہد کے مشہور فاضل گزرے ہیں۔

دیگر اہل قلم

سولھویں صدی عیسوی کے ہندی مسلمانوں میں دیگر اہل علم اور ادیبوں کی بھی حیرت انگیز کثرت نظر آتی ہے جس کا ایک سبب یہ ہے کہ ان کی بعض تصانیف اور حالات ہمارے زمانے تک محفوظ ہیں۔ اس علمی فصل کی پیداوار میں گو تخم ریزی کا نہیں لیکن آبیاری کا شرف اوّل اوّل اسی اکبر بادشاہ کو حاصل ہوا اور اس کی علم نوازی اور شوق تاریخ و قصص نے بہت سے لائق اہل قلم کو دربار اکبری میں جمع کر دیا جن کے مفصل حالات اور علمی کمالات بیان کرنے کے لیے ایک علحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔ یہاں مختصر طور پر اتنا لکھنا کافی ہوگا کہ ارباب علم کے اسی گروہ میں ملا عبدالقادر بدایونی، شیخ سلطان تھانیسری، حاجی ابراہیم سرہندی اور ملا شیری سیالکوٹی اور ابوالفیض فیضی جیسے نامور ادیب اور سنسکرت داں تھے جنھوں نے اس ہندی زبان کے متعدد قصص اور علمی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اسی گروہ میں ملا نظام الدین احمد، نقیب خاں (قزوینی) اور مولانا شاہ محمد شاہ آبادی وغیرہ فن تاریخ کے ماہر و مصنف تھے جن کی مشترکہ سعی و محنت سے بہت سی تاریخیں فارسی میں تصنیف

یا ترجمہ ہوئیں ۔

فارسی شعرا

فارسی شاعری کو بھی جو فروغ اس سولھویں صدی میں حاصل ہوا نہ کبھی پہلے ہندوستان میں ہوا تھا نہ بعد میں نصیب ہوا۔ اور جتانے کے لائق بات یہ ہے کہ ان دو سو کے قریب مشاہیر شعرائے عصر میں جن کے مختصر حالات اور کلام کا نمونہ منتخب التواریخ (جلد سوم) اور آئین اکبری (دفتر دوم) میں محفوظ ہے، اچھا شعر لکھنے والے ہندوستانی تھے اور انھی میں سے دو یعنی قاسم کاہی اور فیضی کو دربار شاہی سے خطاب "ملک الشعرا" حاصل ہوا تھا۔ ان ایرانی شعرا میں جو آج کل فارسی شاعری کے مسلم الثبوت استاد مانے جاتے ہیں ظہوری اور ملک قمی دکن میں اور نظیری و شکیبی خان خاناں عبدالرحیم[1] خان کی دریا دل سرکار میں پہنچ گئے تھے عرفی شیرازی جس کا جوش انگیز کلام اس کی جوانی ہی میں عراق سے بنگالے تک تبرک کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جانے لگا تھا، اکبر کے دربار میں پہنچا مگر کچھ اپنے غرور و استغنا اور کچھ فیضی کی رقابت کے باعث اس کی یہاں قدر نہیں ہوی اور اس کے کمال کو بھی خان خاناں ہی کی جوہر شناسی نے خرید لیا ۔

ہندی شاعری

ادب فارسی کی طرح "برج بھاشا" کی شاعری کے عروج کا وہ زمانہ جسے "وسطی ہندی" سے منسوب کرتے ہیں، یہی سولھویں صدی عیسوی ہے۔ اسی صدی کے بالکل آغاز میں ولبھ اچاری نے دکن سے آکر "گوکل" یعنی متھرا کے قریب چھاونی چھائی اور کرشن و رادھا کے قصۂ عشق پر

---

[1] مرزا عبدالرحیم خاں بیرام خاں اتالیق کا بیٹا ایک میواتی بیوی سے تھا، ۹۶۴ھ میں پیدا ہوا اور باپ کے قتل کے بعد بادشاہ کی سرپرستی میں پرورش پائی؛ جب مظفر شاہ گجراتی نے نظر بندی سے فرار ہو کر گجرات میں فتنہ و فساد برپا کیا تو میرزا عبدالرحیم ہی نے اس شورش کو فرو کیا اور اپنی جنگی مستعدی اور خوش انتظامی سے اس کی قوت توڑ دی۔ اسی خدمت جلیلہ کے صلے میں اسے خطاب "خان خاناں" اور منصب پنجہزاری عطا ہوا۔ بعد میں بھی بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز ہوتا رہا۔ آخر میں زیادہ وقت دکن کی مہمات ہی میں بسر ہوا لیکن وفات سے تھوڑے دن پہلے دربار میں آگیا تھا۔ اور دہلی میں وفات پائی (۱۰۳۶ھ) اس کے علم و فضل اور سخاوت و فیاضی کے اکثر قصے آج تک مشہور ہیں۔ عربی، فارسی، ترکی اور ہندی (یا سنسکرت) زبان میں کامل مہارت رکھتا تھا بالخصوص ہندی کا بہت مقبول شاعر ہوا ہے اور اشعار کے علاوہ تزک بابری کا فارسی ترجمہ اسی کے شوق تصنیف کی یادگار ہے۔ (مفصل حالات کے لئے ملاحظہ ہو مآثر الامرا جلد اول صفحہ ۶۹۳)۔

اپنی مذہبی تعلیمات کی بنا رکھی ۔ اس کے مقلدوں کی بدولت یہاں کی مقامی ہندی یا "برج بھاشا" کی شاعری قریب قریب تمام شمالی ہند میں شایع ہوئی ؛ اس شاعری کے آٹھ اساتذہ ("اشٹ چھاپ") میں سورداس سب سے زیادہ مشہور ہے جو اکبر کے عہد میں تھا ۔ اس کی کتاب "سور ساگر" میں روایت عام کی بموجب ساٹھ ہزار شعر ہوں یا نہ ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ برج بھاشا کی شاعری کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے اور اس سے کوئی ہندی کلام افضل مانا جاتا ہے تو وہ تلسی داس کی تصانیف ہیں جو مسلمہ طور پر ہندی زبان کا بہترین شاعر گزرا ہے ؛ وہ ہمایون کے پہلے عہد حکومت میں پیدا ہوا اور جہانگیر کے زمانے تک زندہ اور نہایت مقبول و باثر مذہبی شاعر سمجھا جانے لگا تھا ۔ ۱۰۳۲ھ (۱۶۲۴ء) میں وفات پائی اور اپنی سب سے مشہور یادگار وہ "رام چرت مانس" چھوڑی جو عام طور پر "رامائن تلسی داس" کہلاتی ہے اور نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی سب سے مقبول و دلکش منظوم کتابوں میں شمار ہونے کی مستحق ہے ۔

باب ۳

سلطنت مغلیہ کا انتہائی عروج

پہلی فصل:- دکن کی سیاسی حالت

اگرچہ سنہ ۱۴۹۰ء سے سلطنت بہمنی کا شیرازہ بکھرنے لگا تھا اور طوایف الملوکی شروع ہوگئی تھی لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس سلطنت کا خاتمہ عین اس وقت ہوا جب کہ مغل ہندوستان میں آئے۔ یعنے سنہ ۱۵۲۶ء میں جنگ پانی پت ہوئی اور شمال میں مغلوں کی عملداری قائم ہوگئی اور ادھر سنہ ۱۵۲۷ء میں خاندان بہمنی کا آخری بادشاہ کلیم اللہ امیر برید کی دست درازیوں سے عاجز آکر بیدر سے بھاگا اور احمد نگر میں جاکر پناہ لی اور اس طریقے سے سلطنت بہمنی کی تمام باقیات ختم ہوگئیں اور اس کی جگہ پانچ سلطنتیں قائم ہوگئیں۔ بیدر پر بریدی خاندان قابض ہوگیا۔ برید ذات کے ترک اور بیدر کے سرنوبت یعنی کوتوال تھے۔ قاسم برید نے محمود شاہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر چپکے چپکے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں کرلیے اور محمود شاہ اور اس کے تمام جانشین بریدیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہوگئے تھے۔ سنہ ۱۵۰۴ء تک قاسم برید کی حکومت رہی اور اس کے مرنے کے بعد امیر برید کی سیادت قائم ہوگئی۔

جب ۱۵۲۶ء میں کلیم اللہ بیدر سے بھاگا تو پھر خاندان بہمنی کا کوئی تسمہ لگا نہیں رہا۔ اور بیدر کی سلطنت پوری بریدی ہوگئی۔ یہ بیدر کا بریدشاہی خاندان کہلاتا ہے جس کے آٹھ بادشاہ گزرے ہیں۔ لیکن ان کی طاقت اس قدر مختصر تھی کہ آس پاس کی بڑی سلطنتوں کے مقابلے میں ان کا زندہ رہنا بہت مشکل تھا۔ بڑے سیاسی جوڑ توڑ سے یہ اپنی ہستی قایم رکھتے تھے یعنے اپنے بچاؤ کے لئے دکھنی سلطنتوں کو آپس میں لڑا دیتے تھے اس لئے یہ دکن کی لومڑی کہلاتے ہیں اور اس طریقے سے ان کو تاریخ میں اچھی جگہ نہیں مل سکی۔ بالآخر ۱۶۱۹ء میں بیجاپور کی سلطنت نے اس کو ضم کرلیا۔ برار کی سلطنت کا بھی کچھ یہی رنگ تھا اس سلطنت کا قایم کرنے والا فتح اللہ عمادالملک ہے جو دکن میں ایک برہمن خاندان کا آدمی تھا اور برار کا صوبہ دار تھا اور ۱۴۹۰ء میں جب کہ سلطنت بہمنی کا شیرازہ بکھرنے لگا تو یہ بھی خودمختار ہوگیا۔ فتح اللہ کے خطاب سے یہ عمادشاہی خاندان کہلاتا ہے۔ برار کی سلطنت بیدر سے زیادہ چھوٹی تھی۔ اس خاندان کے صرف پانچ بادشاہوں نے صرف ۱۵۷۴ء تک حکومت کی اور بالآخر احمدنگر نے اس کو ضم کرلیا ایلچپور اس کا پایۂ تخت تھا جہاں اب بھی اس خاندان کے آثار قدیمہ پائے جاتے ہیں۔

ان کے قطع نظر احمدنگر بیجاپور اور گولکنڈے کی سلطنتیں زیادہ دیر پا ثابت ہوئیں اور انھوں نے ایک طویل تاریخ چھوڑی جو تاریخ دکن کا بڑا سرمایہ ہے۔ احمدنگر کی سلطنت کا قایم کرنے والا ملک احمد نظام الملک ہے جو مشہور ملک حسن بحری کا بیٹا تھا۔ محمود گاواں کے قتل کے بعد ملک حسن مقتدر ہوگیا تھا لیکن محمود شاہ بہمنی سے اس کی اَن بَن ہوگئی چنانچہ یہ شاہی خزانے کو سمیٹ کر جنیر بھاگنا چاہتا تھا کہ قتل کردیا گیا۔ یہ ملک حسن صوبۂ جنیر کا گورنر تھا اور اس کا بیٹا احمد اپنے باپ کی طرف سے صوبہ مرہٹواری کی گورنری کرتا تھا۔ جب ملک حسن کا خاتمہ ہوگیا تو ۱۴۹۰ء میں ملک احمد نے جنیر میں خودمختاری حاصل کرلی۔ اس صوبے کا مستقر پہلے جنیر تھا لیکن ملک احمد نے دریائے گوداوری کی وادی میں احمدنگر کے نام سے ایک اور پایۂ تخت بنایا جو اپنے موقع محل کے اعتبار سے بہت اچھا تھا اور آج یہ ایک بارونق شہر ہے۔ چونکہ نظام الملک ان کا خاندانی خطاب تھا اس لیے یہ نظام شاہی خاندان کہلاتا ہے یوں تو اس خاندان کے کم و بیش گیارہ سلاطین گزرے ہیں لیکن پہلے تین سلاطین ملک احمد نظام شاہ اور اس کا بیٹا اور پوتا برہان نظام شاہ اور حسین نظام شاہ بڑے طاقتور اور اقبالمند بادشاہ گزرے ہیں۔ ان کے زمانے میں یہ احمدنگر کی نظام شاہی سلطنت غیر معمولی طاقتور ہوگئی تھی اور تمام مہاراشٹر پر چھائی ہوئی تھی حسین نظام شاہ کے بعد جس کا انتقال ۱۵۶۵ء میں ہوا تھا اس سلطنت کو بہت ہی کمزور سلاطین سے سابقہ پڑا اور یہ سلطنت

روز بروز کمزور ہوتی گئی اور اکبر کے آخری عہد سے اس پر مغلوں کے حملے شروع ہو گئے اور شاہجہاں کے عہد میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔

بیجاپور مرہٹواڑی اور کرناٹک کا سنگم ہے۔ جب محمود گاواں نے بہمنی صوبوں کی جدید تقسیم کی تو مغرب میں بیجاپور کو کن کا ایک جدید صوبہ قرار دیا گیا تھا۔ یوسف عادل خاں جو محمود گاواں کا آفریدہ تھا محمود شاہ بہمنی کے عہد میں یہاں کا صوبہ دار تھا۔ یہ شخص غلام کی حیثیت میں سلطنت بہمنی کا متوسل ہوا تھا لیکن محمود گاواں کی فرقہ پرستی کے زور سے اس نے غیر معمولی ترقی کرلی۔ فوج کا سرلشکر اور بیجاپور کا صوبہ دار ہو گیا۔ محمود گاواں کے قتل ہونے پر سب سے پہلے اسی نے انحراف کیا اور محمود شاہ بہمنی کے عہد میں ۱۴۹۰ء میں بیجاپور کی خود مختار سلطنت قائم کرلی۔ یہ بیجاپور کا عادل شاہی خاندان کہلاتا ہے۔ اس خاندان نے تقریباً دو سو سال تک حکومت کی اور اپنے پاکیزہ تمدن اور معاشرت کی بڑی تاریخ چھوڑی ہے۔ اس خاندان کے نو سلاطین گزرے ہیں ان کے منجملہ اکثر جلیل القدر ہیں جو اپنی سیاسی قابلیت اور تمدنی ذوق کی وجہ سے مشہور ہیں۔ چنانچہ ان کی سرپرستی میں بیجاپور نے علم وفن میں بڑی ترقی کی۔ یوسف عادل شاہ کے بعد اس کا پوتا ابراہیم عادل شاہ اول جو ۱۵۳۴ء میں تخت نشین ہوا تھا اور اس کا پرپوتا علی عادل شاہ اول جو ۱۵۵۷ء میں تخت نشین ہوا اس خاندان کے طاقتور حکمران تھے جن کی سرپرستی میں بیجاپور بہت بڑی سلطنت ہو گئی تھی علی عادل شاہ کا جانشین ابراہیم عادل شاہ ثانی جو ۱۵۸۰ء میں تخت نشین ہوا تھا علوم وفنون کی سرپرستی کی وجہ سے غیر معمولی شہرت رکھتا ہے اور "جگت گرو" کے لقب سے مشہور ہے اس کے انتقال کے بعد ۱۶۲۶ء میں مغلوں کی یورشیں ہونے لگیں اور جب شاہجہاں کے عہد میں احمد نگر کا بالکل خاتمہ ہو گیا تو ۱۶۳۶ء میں بیجاپور کی سلطنت بھی مغلوں کی باجگزار ہو گئی اس کے پچاس سال کے بعد اورنگ زیب نے اس کا بالکل خاتمہ کر دیا۔

گولکنڈہ صوبہ تلنگانہ کا مستقر تھا۔ یہاں سلطنت بہمنی کے صوبہ دار معمولی طور تک تمام تلنگانہ پر حکومت کرتے تھے۔ اس سلطنت کا بانی سلطان قلی نامی ایک ایرانی تھا جو محمود شاہ بہمنی کے عہد میں ہمدان سے آکر سلطنت بہمنی کا ملازم ہوا تھا۔ پہلے یہ تلنگانہ کے شر و فساد کو فرو کرنے کے لئے مقرر کیا گیا اور قطب الملک دکھنی کے انتقال کے بعد جو تلنگانہ کا صوبہ دار تھا اس کو قطب الملک خطاب دے کر صوبہ دار بنایا گیا۔ جب ۱۴۹۰ء میں احمد نگر اور بیجاپور کے صوبہ دار خود مختار ہو گئے تو سلطان قلی کو بھی موقع تھا چنانچہ مذکورۂ بالا صوبہ داروں نے اس کو ترغیب بھی دی تھی

لیکن سلطان قلی اپنے جذبۂ وفاداری سے مجبور تھا چنانچہ اس نے محمود شاہ بہمنی کے انتقال تک جو ۱۵۱۸ء میں ہوا تھا اعلان خود مختاری نہیں کیا گو عملی طور پر اس کو سب کچھ اختیارات حاصل تھے اس طرح گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت سب سے دیر میں قائم ہوئی۔ یہ قطب شاہی خاندان کہلاتا ہے جس کے سات بادشاہ گزرے ہیں جن میں سے اکثر اقبال مند تھے۔ سلطان قلی نے جو سلطنت کا بانی تھا بڑی عمر پائی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں اس کو اچھی طرح مضبوط کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد تھوڑی سی خانہ جنگی ہوئی لیکن جب اس کا چھوٹا بیٹا ابراہیم قطب شاہ ۱۵۵۰ء میں تخت نشین ہوا تو اس سلطنت کی پھر ترقی شروع ہوگئی اور ابراہیم کے جانشین محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں اس کو غیر معمولی عروج حاصل ہوگیا۔ محمد قلی قطب شاہ نے ایک جدید شہر حیدر آباد کے نام سے آباد کیا جو اب تک موجود ہے اور روز افزوں ترقی پر ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے بھتیجے کے عہد میں جو محمد قطب شاہ کے لقب سے ۱۶۱۲ء میں تخت نشین ہوا تھا سلطنت کی ترقی برابر جاری رہی عظیم الشان تعمیری کام ہوئے اور علم و فن کی سرپرستی ہوئی۔ لیکن جب ۱۶۲۶ء میں اس کا انتقال ہوا تو سلطنت کو زوال شروع ہوگیا اور بیجاپور کے ساتھ یہ سلطنت بھی مغلوں کی باجگزار ہوگئی اور بیجاپور کے ساتھ پچاس سال کے بعد اس کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

اگر مجموعی طور پر ان سلطنتوں پر نظر ڈالی جائے تو ان کے کئی دور قرار دیے جا سکتے ہیں ان کا ابتدائی دور جب کہ احمد نگر میں احمد نظام شاہ اور برہان نظام شاہ بیجاپور میں یوسف عادل شاہ اور ابراہیم عادل شاہ اول اور گولکنڈے میں سلطان قلی اور ابراہیم قطب شاہ حکومت کرتے تھے ان سلطنتوں کی تاسیس اور استحکام کا زمانہ ہے۔ اس میں ان سلطنتوں کی بنیادیں پڑیں اور ان کو اندر اور باہر سے مستحکم کیا گیا۔ اس ابتدائی زمانے میں تمدنی ترقی نہیں ہو سکتی تھی لیکن جب ان کے جانشین یعنی احمد نگر میں حسین نظام شاہ اور بیجاپور میں علی عادل شاہ اول اور ابراہیم عادل شاہ دوم اور گولکنڈے میں محمد قلی قطب شاہ اور محمد قطب شاہ تخت نشین ہوئے تو ان سلطنتوں کو انتہائی عروج حاصل ہوگیا۔ نہ صرف یہ سلطنتیں وسیع ہوگئیں بلکہ ان میں غیر معمولی تمدنی ترقیاں ہوئیں جن پر اہل دکن فخر کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اول تو یہ سلاطین بڑے متمدن اور اولوالعزم تھے ان فرماں رواؤں نے اپنی سلطنتوں کی کامیاب سیاسی رہنمائی کے علاوہ علوم و فنون کی سچی سرپرستی کی تھی۔ ان کے درباروں میں ہمیشہ اہل علم و فن جمع رہتے تھے۔ نہ صرف شعر و سخن اور ادب و حکمت پر کتابیں لکھی گئیں بلکہ عمارت سازی، مصوری اور نقاشی، موسیقی جیسے فنون لطیفہ میں بھی غیر معمولی کام ہوا جن کی یادگاریں

اب تک موجود ہیں بیجاپور اس خصوص میں زیادہ پیش پیش تھا۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی علمی و فنی سرپرستی تو ضرب المثل ہے اور اسی وجہ سے اس کو دکن میں غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی اور لوگ اس کو "جگت گرو" کہتے تھے۔

وجیانگر کا عروج

سلطنت بہمنی کے انتشار و شکستگی اور مسلمانان دکن کی مذکورہ بالا لامرکزیت و خانہ جنگی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ جنوب میں ہندو ریاست وجیانگر کو نہ صرف مسلمانوں کے حملوں سے نجات ملی بلکہ خود اس نے بعض شمالی اضلاع پر قبضہ حاصل کر لیا اور اپنے راجاؤں کے تیسرے خاندان کے عہد میں جو سولھویں صدی عیسوی کے اوائل میں برسر اقتدار ہوا تھا، بڑی قوت بہم پہنچائی چنانچہ اسی خاندان کے تیسرے راجہ کرشن دیو (۹۱۵ھ ۱۵۰۹ء تا ۹۳۶ھ ۱۵۲۹ء) کا زمانہ وجیانگر کے انتہائی عروج کا زمانہ سمجھا جاتا ہے جب کہ اس ریاست میں جنوبی ہند کا قریب قریب وہ تمام علاقہ داخل تھا جو اب "احاطۂ مدراس" ریاست میسور اور دیگر دیسی ریاستوں میں شامل ہے۔

بایں ہمہ یہ ریاست اپنی خانہ جنگیوں میں کبھی کبھی مسلمان سلاطین دکن سے مدد لیتی تھی اور دربار بیجاپور و گولکنڈہ سے آئے دن یہاں کے ہندو امراء ساز باز کرتے رہتے تھے۔ اسی ضمن میں جب حکومت کی اصلی باگ وجیانگر کے وزیر رام راج کے ہاتھ میں آئی (۹۴۹ھ ۱۵۴۲ء) تو وہ خوشی سے اس جتھے میں شریک ہوگیا جسے برہان نظام شاہ والی احمد نگر نے ۹۵۰ھ ۱۵۴۳ء میں ریاست بیجاپور کے خلاف متحد کیا تھا۔ اتحادیوں کو اول اول نمایاں کامیابی ہوئی لیکن دربار بیجاپور کے مشہور امیر اسد خاں (لاری) نے کچھ جنگی دلیری اور زیادہ تر اپنی ریشہ دوانی سے حلیفوں میں نفاق ڈلوا کر "عادل شاہی" سلطنت کو تباہ ہونے سے بچا لیا اور وجیانگر کو اپنے ساتھ متحد کر لیا۔ یہ سیاسی اتحاد بیس بائیس برس تک بحال رہا اور کئی مرتبہ وجیانگر کی فوج بیجاپوریوں کی مدد کے لئے شمالی علاقوں میں بلائی گئی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ صریح عہد و پیمان کے باوجود یہاں کے ہندو سپاہی شدید تعصب کا اظہار کرتے تھے اور فارسی تواریخ میں جا بجا ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ ہندو اتحادیوں نے اسلامی شہروں میں گھس کر مساجد کو آگ لگادی اور شہری مسلمانوں پر طرح طرح کی ناروا زیادتیاں کیں۔

جنگ تالی کوٹ

ان واقعات نے ریاست بیجاپور کے مسلمانوں میں اسد خاں لاری کی حکمت عملی کے خلاف عام جوش پیدا کر دیا۔ احمد نگر، بیدر، نیز گولکنڈے کی اسلامی حکومتیں پہلے ہی وجیانگر کی رقیب و دشمن تھیں۔

---

۱ مثلاً دیکھو فرشتہ جلد دوم ۳۶ و ۳۷ وغیرہ نیز آکسفورڈ ہسٹری ۳۰۵ وغیرہ۔

دکن کی ریاستیں
سترھویں صدی عیسوی کے اوائل میں

باب ۲
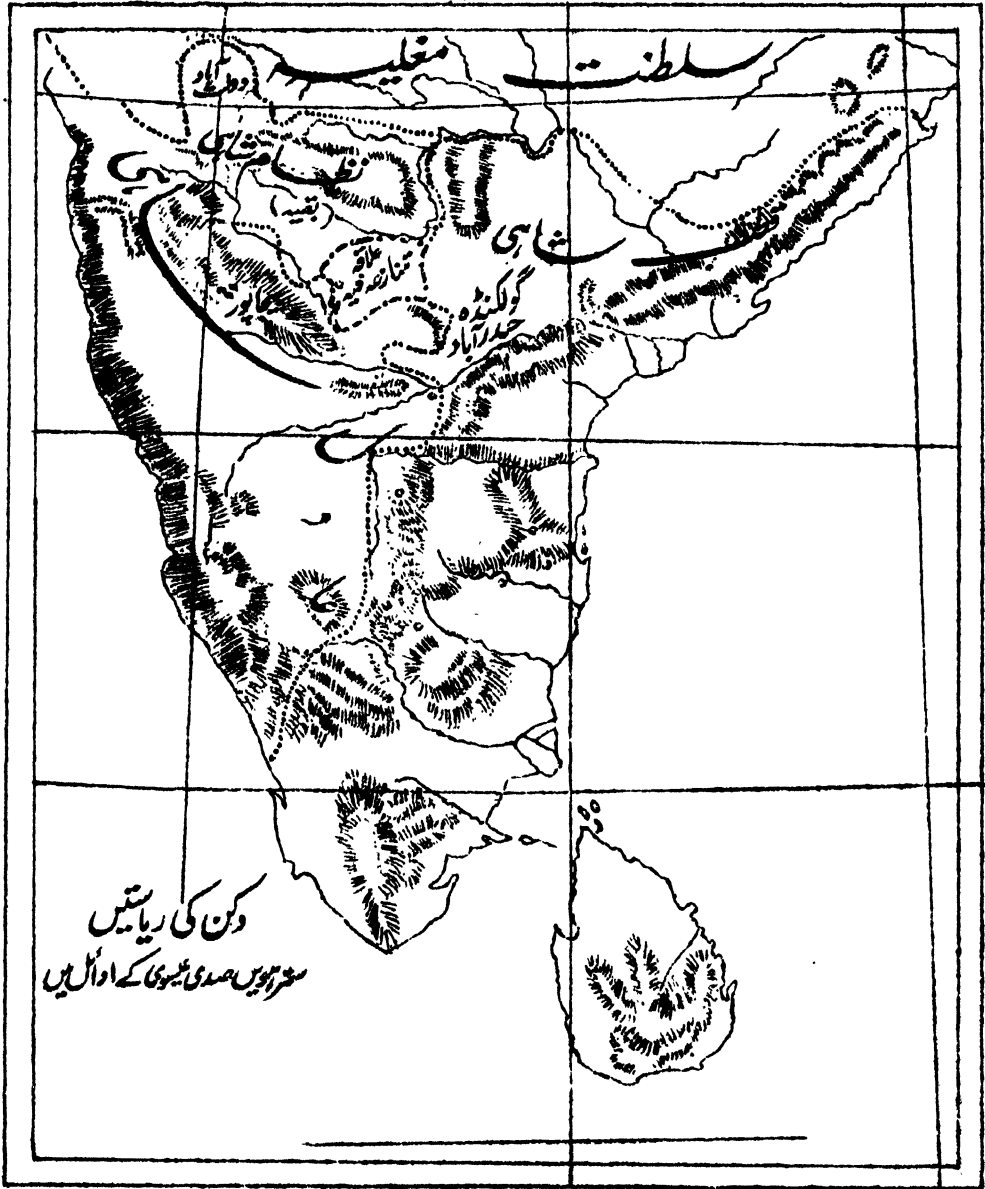
غرض سیاسی اغراض اور مذہبی حمیت نے ایک مرتبہ پھر اسلامی دکن کو متحد کر دیا[۱] اور گویا اتحاد پائدار نہ تھا لیکن مسلمان اتحادیوں کے پہلے ہی مقابلے میں سلطنت وجیانگر کا تار و پود بکھر گیا اور پایۂ تخت اور وجیانگر کی کامل بربادی کے ساتھ ایک طرف پینا ندی اور دوسری طرف کالی کٹ تک اس کے علاقے فتحمند مسلمانوں نے آپس میں تقسیم کر لیے[۲] (۹۷۲ھ / ۱۵۶۵ء)

ترقی تمدن

اس فتح عظیم نے دکن کی اسلامی ریاستوں، خاص کر بیجاپور و گولکنڈے کی قوت و عظمت کو پہلے سے کہیں زیادہ بڑھا دیا۔ بہت سامال غنیمت اور علاقہ ہاتھ آنے کے علاوہ انھیں ایک دشمن سخت سے نجات مل گئی جس کے خلاف آئے دن کی لڑائیاں ان کی زیر باری اور جنوبی اضلاع کی خرابی کا موجب تھیں۔ پس مجموعی طور پر ان دکنی ریاستوں کے انتہائی فروغ کا یہی زمانہ ہے جس میں بیجاپور، حیدرآباد اور احمدنگر کے شہر دولت و مدنیت کے اعتبار سے دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں شمار ہونے لگے جن کے بازاروں میں ممالک عالم کی بہترین مصنوعات فروخت ہونے آتی تھیں نیز جا بجا وہ قلعے اور عمارات اسی عہد میں تعمیر ہوئیں جن کے آثار قدیمہ آج بھی دکن کے ہر حصے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

ان اسلامی ریاستوں کی یہ خصوصیت بھی قابل بیان ہے کہ غالباً یہاں کے مسلمان اپنے ہندو ہمسایوں کے ساتھ سب جگہ سے زیادہ مختلط ہوتے جاتے تھے اور بعض رسوم معاشرت کو براہ راست اختیار کر لینے کے علاوہ انھوں نے خود اپنی رسموں میں بھی ہندوپن کی شان پیدا کر لی تھی۔

---

[۱] یہ اتحاد زیادہ تر سید مصطفےٰ خاں اردستانی کی کوشش سے صورت پذیر ہوا تھا جس نے بیجاپور و احمدنگر کی قدیم عداوت کو صلح سے مبدل کر دکھایا اور احمدنگر کی شہزادی چاند سلطان کی علی عادل شاہ بیجاپور کے ساتھ شادی نے (۹۷۲ھ / ۱۵۶۵ء) اسے مزید تقویت پہنچائی۔

[۲] یہ زبردست لڑائی مدگل کے قریب ہوئی (جمادی الثانی ۹۷۲ھ مطابق جنوری ۱۵۶۵ء) مگر جنگ تالی کوٹ کے نام سے، جہاں مسلمانوں کا اجتماع ہوا تھا، موسوم ہے۔ فارسی تواریخ کے علاوہ، حال میں اس جنگ اور وجیانگر کے حالات کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے جن میں سویل کی کتاب "دی فورگوٹن امپائر" سب سے زیادہ مشہور ہے بیان کرتے ہیں کہ لڑائی میں رام راج پانچ لاکھ سے زیادہ جنگ آزما ہمراہ لایا تھا اور بظاہر یہی سبب ہے کہ اسی ایک ہزیمت نے وجیانگر کی قوت کو بالکل کمزور کر دیا اور اس کے دولت مند پایۂ تخت کو پہلے بنجاروں اور لمباڑوں نے لوٹا اور اس کے بعد فتحمند حملہ آوروں نے تاراج و منہدم کیا۔ (سویل کی

چنانچہ شادی بیاہ کی رسموں سے قطع نظر عیدین اور محرم کے تہواروں کو جس طرح دکن میں منایا جاتا تھا وہ بہت کچھ ہندوؤں کے میلوں سے مشابہ تھا اور اس مشابہت کے بعض پہلو آج بھی نمایاں ہیں۔ ان رسوم معاشرت کو لینے کے ساتھ انھی اور دکنی درباروں میں سب سے اول ہندوؤں کی زبان کو دفتری کاروبار میں استعمال کرنے کی اجازت دی گئی اور یہیں ہندو مسلمانوں کی اس مشترکہ زبان کی تحریر کا سب سے پہلے رواج ہوا جسے اب "اردو" کہنے لگے ہیں۔

جنگی استعداد

درباری تزک و احتشام اور امیرانہ عیش و تکلفات کی فراہمی میں سلاطین دکن فوجی تیاریوں کو فراموش نہ کر سکتے تھے۔ باوجود ہم مذہب ہونے کے ان کی باہمی رقابت ہر وقت ہمسایوں کا علاقہ دبانے کی تاک میں رہتی تھی اور اس مسلسل جنگ وجدال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اپنی جگہ پر ہر ریاست زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر افواج مرتب کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ پس بیجاپور، گولکنڈہ اور احمد نگر میں پانچ لاکھ جنگجو پیادہ و سوار کی تعداد کو اسلامی دکن کی کل فوجی قوت کا کم سے کم تخمینہ سمجھنا چاہیے[۱] جس میں عربوں اور حبشیوں کی ایک بڑی جمعیت شامل تھی۔ اور اسی ایک واقعے سے ان افواج کی آراستگی کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ تالی کوٹ کی جنگ میں صرف احمد نگر کا سلطان چھ سو میدانی توپیں ہمراہ لایا تھا[۲]۔ لیکن اپنے آخری دور میں مذہبی دورنگی کی وجہ سے یہ سلطنتیں بہت کمزور ہو گئیں۔ کیونکہ احمد نگر بیجاپور اور گولکنڈے کے سلاطین نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا جس نے انھیں اپنی سنی رعایا سے بیگانہ بنا دیا تھا۔

سلاطین کے نام اور سنین

باہمی لڑائیوں کے علاوہ اسی دسویں صدی ہجری کے اواخر میں اہل دکن کی سلطنت مغلیہ سے جنگ چھڑ گئی تھی اور اس نئے خطرے نے سلاطین دکن کی جنگی استعداد و کوشش کو یقیناً بہت بڑھا دیا ہوگا۔ لیکن ان معرکوں کا حال بیان کرنے سے پہلے ان دکنی سلاطین کے نام اور سنین جلوس کا اجمالی نقشہ پیش کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱) مذکورۂ بالا کتاب کے علاوہ دیکھو (اوکس فورڈ ہسٹری صفحہ ۲۹۴، ۳۰۶)۔

[۱] یہ قول مورلینڈ کے تازہ ترین نتائج تحقیقات پر مبنی ہے اور گو راقم الحروف ان کی تحقیقات کو چنداں قابل سند نہیں سمجھتا تاہم کم سے کم تخمینہ کرتے وقت اسے پیش کرنے میں مضائقہ نہیں ("انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر" صفحہ ۱۸)

[۲] اوکسفورڈ ہسٹری، صفحہ ۳۰۶۔ نیز دیکھو الفنسٹن ۴۲۹۔

احمد نگر کا نظام شاہی خاندان	بیجاپور کا عادل شاہی خاندان	گولکنڈہ کا قطب شاہی خاندان
(۱) احمد نظام شاہ بن نظام الملک بحری۔ نو مسلم برہمن زادہ تھا اور گو اس نے علانیہ لقب بادشاہی اختیار نہیں کیا لیکن ۸۹۶ھ / ۱۴۹۰ء میں سلطان محمود بہمنی کو شکست دینے کے بعد احمد نگر کو پائے تخت بنا کر خود مختار ہو گیا تھا۔ (۲) برہان نظام شاہ ۹۱۵ھ / ۱۵۰۹ء تا ۹۶۱ھ / ۱۵۵۳ء (۳) حسین نظام شاہ ۹۶۱ھ / ۱۵۵۳ء تا ۹۷۲ھ / ۱۵۶۵ء (۴) مرتضیٰ نظام شاہ تا ۹۹۶ھ / ۱۵۸۶ء (۵) میران حسین نظام شاہ ۹۹۶ھ / ۱۵۸۶ء (دو ماہ چند روز) (۶) اسمٰعیل بن برہان نظام شاہ تا ۹۹۹ھ / ۱۵۹۰ء (۷) برہان (ثانی) بن حسین نظام شاہ تا ۱۰۰۳ھ / ۱۵۹۵ء (۸) ابراہیم بن برہان نظام شاہ (ثانی) چند ماہ تا ۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۵ء اس کے بعد اگرچہ آئندہ چالیس برس تک امرائے احمد نگر سلطنت مغلیہ سے الجھتے اور وقتاً فوقتاً خاندان شاہی کے افراد کو بادشاہ بناتے رہے لیکن یہ برائے نام بادشاہ تھے اور اسی رہی سہی حکومت کا بھی ۱۰۴۳ھ / ۱۶۳۳ء کے اواخر میں خاتمہ ہو گیا۔	(۱) یوسف عادل شاہ جو اپنے آپ کو عثمانی سلاطین ترکی کی اولاد میں بتاتا تھا۔ غلام کی حیثیت سے دربار بہمنی میں بکا اور بتدریج ترقی کر کے بیجاپور کا خود مختار بادشاہ بن گیا (۸۹۵ھ / ۱۴۸۹ء تا ۹۱۵ھ / ۱۵۱۰ء) (۲) اسمٰعیل عادل شاہ ۹۱۵ھ / ۱۵۱۰ء تا ۹۴۱ھ / ۱۵۳۴ء (۳) ملو عادل شاہ چھ مہینے تخت نشین رہا ۹۴۱ھ / ۱۵۳۴ء (۴) ابراہیم عادل شاہ تا ۹۶۵ھ / ۱۵۵۷ء (۵) علی عادل شاہ بن ابراہیم تا ۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء (۶) ابراہیم عادل شاہ ثانی تا ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء (۷) محمد عادل شاہ تا ۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۷ء (۸) علی عادل شاہ (ثانی) تا ۱۰۸۳ھ / ۱۶۷۲ء (۹) سکندر عادل شاہ تا انتزاع سلطنت ۱۰۹۷ھ / ۱۶۸۶ء	(۱) سلطان قلی قطب شاہ سلطان محمد بہمنی کے ترک ملازموں میں داخل تھا اور گو پندرھویں صدی کے اواخر میں قریب قریب آزاد ہو چکا تھا پھر بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس خود مختار بادشاہی کا اعلان ۹۱۸ھ / ۱۵۱۲ء میں ہوا۔ (۲) جمشید قطب شاہ ۹۵۰ھ / ۱۵۴۳ء تا ۹۵۷ھ / ۱۵۵۰ء (۳) سبحان قطب شاہ طفل ہفت سالہ تھا، چند روز تخت نشین رہا ۹۵۷ھ / ۱۵۵۰ء (۴) ابراہیم قطب شاہ تا ۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء (۵) محمد قلی قطب شاہ تا ۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۱ء (۶) محمد قطب شاہ برادر زادہ محمد قلی۔ تا ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۶ء (۷) عبداللہ بن محمد قطب شاہ تا ۱۰۸۳ھ / ۱۶۷۲ء (۸) ابو الحسن تا انتزاع سلطنت ۱۰۹۸ھ / ۱۶۸۷ء

دوسری فصل :- اکبر کی فتوحات دکن

واضح رہے کہ مالوے کی فتح نے مغلیہ سلطنت کی حدیں بہت دن پہلے **خاندیس** کی آزاد ریاست فاروقیہ سے ملادی تھیں اور یہ ملک **دکن** کا وہ شمالی قطعہ ہے جو وادی نربدا کے ختم ہوتے ہی ست پڑا کی پہاڑیوں سے شروع ہوتا ہے اور دریائے تاپتی کے زرخیز طاس کو وسط میں چھوڑ کر جنوب میں برار کی پہاڑیوں سے آملا ہے جن کا سلسلہ خاندیس کی مشرقی حد بناتا ہوا شمال میں وادی نربدا کی مشرقی پہاڑیوں تک چلا گیا ہے۔ لیکن مغرب میں سورت وبروچ کے ساحلی اور کوہستانی اضلاع خاندیس میں داخل نہیں اور فاروقی حکومت کے عہد میں بھی سلطنت گجرات کے تابع تھے۔ اس طرح سولھویں صدی عیسوی کے شروع ہی سے ہم اس چھوٹی سی سلطنت کو گجرات ومالوہ اور برار واحمد نگر کے حریفوں میں گھرا ہوا پاتے ہیں اور بے شبہہ یہ واقعہ وہاں کے حکمرانوں کی بڑی قابلیت کا ثبوت ہے کہ پشت ہا پشت تک نہ صرف خاندانی ورثے کو بچائے رہے بلکہ اکثر اپنے قوی تر ہمسایوں کے معاملات میں انھوں نے شریک غالب کی حیثیت سے حصہ لیا اور مغلوں کو بھی ایک عرصے تک جد وجہد کے بغیر اپنے ملک پر قابض نہ ہونے دیا۔

مگر ظاہر ہے کہ مغل کشورستانوں کے ساتھ ان کی جنگ برابر والوں کی طرح نہ ہو سکتی تھی اور اس بات کا اندازہ ان کے نویں فرمانروا **میراں مبارک شاہ** نے اکبری فتوحات کے آغاز ہی میں کر لیا تھا چنانچہ ۹۷۱ھ (۱۵۶۴ء) میں جب اکبر یکایک مالوے آیا اور اس کے صوبہ دار عبداللہ خاں ازبک نے گجرات کی راہ لی اور بادشاہ کو از سر نو صوبۂ مالوہ کا انتظام کرنا پڑا تو میراں مبارک شاہ نے بطور خود اکبر کی سیادت وشہنشاہی تسلیم کر لی اور اس کی بیٹی کو بادشاہ نے زوجیت میں لے کر اس اتحاد کی تصدیق کی۔ نیز کچھ روز بعد اسی میراں مبارک شاہ کے ایک فرزند راجہ **علی خاں** کو ہم بادشاہی ملازمت میں منسلک پاتے ہیں جو اپنے بھائی کے بعد ۹۸۴ھ (۱۵۷۶ء) میں خاندیس آکر وہاں کا فرماں روا ہو گیا تھا۔

راجہ علی خاں

اس کی حکمت عملی بھی وہی تھی کہ مغلوں کی سیادت کو تسلیم کرنے کے باوجود انھیں دکن کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا روادار نہ تھا اور جس وقت مرتضیٰ نظام شاہ والی احمد نگر کے چند امرا اپنی حکومت سے بگڑ کر آگرے کی جانب فرار ہوئے کہ اکبر کو تسخیر دکن پر ابھاریں،

تو راجہ علی خاں نے ان کو راستے میں روکا اور سمجھایا کہ مغلوں سے اپنے اندرونی معاملات میں مدد لینے کا وہی نتیجہ ہوگا جو ابراہیم لودھی کے عہد میں سلطنت دہلی کا ہوا تھا۔ اور یہ غداری دکن کی آزادی کا خاتمہ کر دے گی۔ پھر ان وطن فروش امرا نے اس کی نصیحت نہ مانی اور چھپ کر برہان پور سے چلدیے تو راجہ علیخاں نے ان کو گرفتار کرنا چاہا لیکن یہ لوگ لڑ بھڑ کر جس طرح ممکن ہوا دریائے نربدا سے پار ہوگئے (۹۹۲ھ / ۱۵۸۴ء)

احمد نگر پر حملہ

واضح رہے کہ مرتضیٰ نظام شاہ کا بھائی **برہان** ابن حسین نظام شاہ پہلے سے دربار اکبری میں پناہ گزیں تھا ان امرائے احمد نگر کے آگرے پہنچتے ہی اکبر کو "کہ ہمیشہ در کمیں تسخیر دکن بود و فرصت انتظاری نمود" نظام شاہی ریاست پر فوج کشی کا نہایت عمدہ موقع مل گیا اور ۹۹۴ھ / ۱۵۸۶ء میں خان اعظم میرزا عزیز (کوکہ[1]) نامزد کر دیا گیا کہ ان پناہ گزینوں کو ساتھ لے کر احمد نگر پر پیش قدمی کرے۔ خاندیس کا ملک افواج اکبری کے راستے میں تھا اور راجہ علی خاں سے برابر پیام سلام ہو رہے تھے کہ اس حملے میں "شہنشاہ" کی معاونت کرے لیکن یہ دور اندیش سردار خوب سمجھتا تھا کہ احمد نگر کی فتح کے بعد فاروقیوں کی خیر نہ ہوگی لہذا مغلوں کے اس پہلے حملے میں اس نے علانیہ احمد نگر کا ساتھ دیا اور کچھ ان ریاستوں کی متحدہ قوت کچھ اپنے بعض ماتحت سرداروں سے بدگمانی کی بنا پر میرزا عزیز کو جم کر بڑی لڑائی لڑنے کی ہمت نہ پڑی اور وہ برار میں ایلچ پور تک بڑھ کر مغربی خاندیس (نندر بار یا نذر بار) کے راستے گجرات چلا آیا کہ از سر نو فوج اور جنگی سامان فراہم کرے[2]۔

اندرونی فساد

لیکن ان تیاریوں اور ارادوں کا عرصے تک کوئی عملی نتیجہ نہیں نکلا اور اس اثنا میں

---

[1] میرزا عزیز (متوفی ۱۰۳۳ھ / ۱۶۲۴ء) اکبر کا رضاعی بھائی اور مشہور سپہ سالار ہے۔ گجرات و بنگال میں بڑی بڑی لڑائیاں لڑا اور پنجہزاری کے منصب تک ترقی کی۔ اس کی دو بیٹیاں خاندان شاہی میں منسوب تھیں اور اکبر کی وفات کے وقت وہ اپنے داماد شہزادہ خسرو بن جہانگیر کی تخت نشینی کا خواہاں تھا اسی بنا پر جہانگیر اور نیز شاہ جہاں اس سے خوش نہ تھے، اور اپنی بے باکی کی بدولت اسے کئی مرتبہ قید معزولی کی سزا ملی۔ بایں ہمہ خاندان شاہی سے اس کے دیرینہ تعلقات نیز جنگی اور ملکی قابلیت کی بدولت پھر منصب پر بحال کر دیا جاتا تھا۔ اکبری تاریخوں میں جا بجا اس کے حالات تحریر ہیں نیز دیکھو مآثر الامرا جلد اول صفحہ ۶۷۵ لغ

[2] اس پہلے حملے کی ناکامی کا اکبری تاریخوں میں بہت مجمل بیان ملتا ہے۔ گر سولہویں صدی کے اخیر بلکہ ۱۰۲۲ھ / ۱۶۱۳ء تک

حسین نظام شاہ ثانی کی وفات (۹۹۷ھ / ۱۵۸۹ء) اور دو ڈھائی سال کے سیاسی خلفشار کے بعد

تاریخ فرشتہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۵) شمالی دکن کی تاریخ کا بہترین ماخذ تاریخ فرشتہ (مقالۂ سوم و ششم) ہے جس کا مولف محمد قاسم ہندو شاہ استرآبادی المعروف بہ فرشتہ اس وقت بیجاپور میں اپنی مشہور کتاب تالیف کر رہا تھا اس کی ولادت کا سنہ (۹۵۵ھ / ۱۵۵۰ء) کسیقدر مشتبہ ہے لیکن اتنا خود اس کی کتاب سے ثابت ہے کہ وہ اپنے وطن استرآباد (ایران) سے باپ (غلام علی ہندو شاہ) کے ہمراہ بچپن ہی میں احمدنگر آگیا تھا اور سلطان مرتضی نظام شاہ کے آخر عہد نیز کچھ عرصے بعد تک اسی سرکار میں ملازم رہا۔ اس کی اصلی قدردانی بیجاپور آکر ہوی جہاں ابراہیم عادل شاہ نے اسے ہندوستان و دکن کے اسلامی سلاطین کی تاریخ لکھنے کا حکم دیا۔ یہ ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۱ء) یا کچھ پہلے کا واقعہ ہے اور جیسا کہ مولف نے دیباچے میں تحریر کیا ہے اس کی تاریخ جس کا اصلی نام "گلشن ابراہیمی" یا "نورس نامہ" تھا، ۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء) میں پوری ہوگئی تھی لیکن بعد میں جب تک وہ زندہ رہا جا بجا اصلاح و اضافہ کرتا رہا۔ اس کی وفات کا سنہ ٹھیک معلوم نہیں۔ قرینہ کہتا ہے کہ ۱۰۳۲ھ (۱۶۲۳ء) یا اس کے کچھ بعد اس کا انتقال ہوا ہو۔ یہ کتاب سولھویں صدی عیسوی کے اخیر تک اسلامی سلاطین ہند کی سب سے جامع فارسی تاریخ اور طبقات اکبری کا نقش ثانی ہے بلکہ ریاست ہائے دکن کے حالات جس تفصیل سے فرشتہ نے لکھے ہیں، طبقات میں موجود نہیں۔ اس کے قبول عام کی دوسری وجہ تحریر کی خوبی اور شستگی ہے اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ مورخ جس طرح قدیم اصول تاریخ نویسی کے مطابق واقعات کو جمع کرنے کا سلیقہ رکھتا ہے اسی طرح نہایت ہنرمند انشاپرداز ہے۔ تیموری حملے سے پہلے کے حالات لکھنے میں اس نے بعض بعض غلطیاں کی ہیں اور یہ جتانے بغیر بھی چارہ نہیں کہ کہیں کہیں عبارتیں کی عبارتیں طبقات اکبری سے نقل کرلی ہیں۔ بایں ہمہ مجموعی طور پر اس کی تاریخ اس موضوع پر بہترین کتابوں میں داخل ہے اور اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانے کی انگریزی تاریخیں بالعموم اسی کے انگریزی ترجموں سے ماخوذ ہیں۔

انگریزی ترجمے

مگر ان نام نہاد مترجمین کی تحریروں کو "ترجمہ" کہنا درحقیقت لوگوں کو صریح فریب دینا ہے اور مورخ گبن سے لے کر میجر راورٹی تک خود ان مغربی اہل تحقیق نے جنھیں اسلامی تاریخ یا فارسی زبان کی واقفیت ہے، ان ترجموں کو نہایت ناقابل اعتبار سمجھا ہے، بالخصوص راورٹی نے اپنے فاضلانہ ترجمہ "طبقات ناصری" کے حواشی میں ان انگریزی ترجموں کی بخوبی قلعی کھولی ہے اور جا بجا اصل عبارتیں نقل کرکے دکھایا ہے کہ مترجم نہ صرف اصل مطلب نہیں سمجھتے بلکہ بعض اوقات بالکل الٹے معنی بیان کرتے ہیں اور انھوں نے اپنی ناقابلیت چھپانے کے لئے یا محض بہ اقتضائے تعصب، صریح کذب و افترا بھی

اسی برہان (ثانی) بن حسین نظام شاہ نے جس کی دستگیری میں اکبری حملہ بیکار ثابت ہوا تھا، راجہ علی خاں فاروقی کی مدد سے ریاست احمد نگر پر قبضہ حاصل کرلیا اور اس کے جیتے جی مغلوں کو احمد نگر کا رخ کرنے کی جرأت یا فرصت نہ ہوئی۔ لیکن چند ہی سال میں اس کا انتقال ہوگیا (۱۰۰۲ھ/۱۵۹۴ء) اور نظام شاہی ریاست میں اسی قسم کی بلکہ زیادہ شدت کے ساتھ فرقہ بندی اور خانہ جنگی شروع ہوگئی جس نے پہلے مغلوں کو حملے کا موقع دیا تھا، اور خود وہاں کے بعض امرا پھر اکبر کی امداد کی درخواست کرنے لگے۔ اس اندرونی فساد نے ریاست احمد نگر کو ایک بڑا نقصان یہ پہنچایا کہ اس کا دوراندیش حلیف راجہ علی خاں نظام شاہیوں کے مستقبل سے مایوس ہوگیا اور اب اسے اپنی سلامتی اسی میں نظر آئی کہ خود بھی مغل حملہ آوروں کی اس فوج کے ساتھ مل جائے جو اکبر کے منجھلے بیٹے شہزادہ مراد اور میرزا عبدالرحیم خان خاناں کے ماتحت گجرات و مالوے سے احمد نگر پر بڑھ رہی تھی (۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء)

اس فوج کی کل تعداد تیس ہزار سوار بتائی گئی ہے (فرشتہ جلد دوم صفحہ ۱۵۹)

اور اس قلت کا اصلی سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کو مزاحمت یا کسی بڑی جنگ کی توقع نہ تھی وہ محض احمد نگر کے امیر میاں منجھو کی امداد کے حیلے سے آئے تھے اور اس شخص کو جو ظاہری طور پر ایک لڑکے کو بادشاہ بنا کے خود ریاست کا مختار بن بیٹھا تھا، دربار کے بعض حبشی سرداروں نے محصور کر رکھا تھا، اور اسی نے مغلوں سے امداد کی درخواست کی تھی۔ لیکن ان کے آتے آتے یہ جھگڑے ایک حد تک آپس ہی میں طے ہوگئے۔ میاں منجھو کو مغلوں کے بلانے سے پشیمانی ہوئی اور اب شہر کو شہزادی چاند سلطان کے سپرد کرکے وہ بیجاپور و گولکنڈہ جا رہا تھا کہ وہاں کے بادشاہوں کی مدد لے کر اس بلا کو دفع کرے جو خود اس کی بلائی ہوئی تھی۔ کیونکہ مغلوں نے امداد کا بہانہ چھوڑ کر اب علانیہ احمد نگر کی تسخیر کا سامان کیا اور شہر پناہ کے باہر بعض محلوں پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کام لیا ہے، اب قیاس کرنا چاہئے کہ ہندوستان کی جو "تاریخیں" ایسے عجیب "ماخذ" پر مبنی ہوں گی، وہ کیسی ہوں گی؟

(ان ترجموں میں سب سے اول میجر ڈاؤ نے صرف سلاطین دہلی کے حالات کا ترجمہ شائع کیا تھا (۱۷۶۸ء) بعد میں اضافے ہوتے رہے اور آخر میں مکمل اور سب سے اچھا ترجمہ وہ سمجھا جاتا تھا جسے جرنل برگز نے ۱۸۲۹ء میں شائع کیا۔ مگر جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا یہ سب ترجمے اغلاط سے مملو اور ناقابل اعتبار ہیں اور سر ہنری ایلیٹ جنہوں نے ان مترجموں کی ایک حد تک وکالت و حمایت کی ہے (جلد ششم صفحہ ۲۰۷) خود انھی کی مد میں شامل ہیں)

قابض ہو گئے!

بایں ہمہ شہزادی چاند سلطان یا "چاند بی بی" نے ہمت نہ ہاری وہ احمد نگر کے تیسرے بادشاہ **حسین نظام** کی بیٹی تھی اور ہم حاشیے میں بتا چکے ہیں کہ اس کی شادی علی عادل شاہ بیجاپور سے ہوئی تھی اس بادشاہ کی وفات ۹۸۸ھ (۱۵۸۰ء) کے بعد یہ بیجاپور میں رہی اور چونکہ اس کا بھتیجا ابراہیم عادل شاہ ثانی کمسن تھا اس لیے اسی کو ملک کی سیاسی رہنمائی کرنا پڑی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احمد نگر کے آخری فسادات کے وقت یہ نظام شاہی پائے تخت میں موجود تھی۔ ایسے نازک وقت میں تمام فریقوں کا اسے حکَم اور سردار مان لینا ہی چاند سلطان کی مشہور و مسلمہ قابلیت کی دلیل ہے۔ عنان اختیارات ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے اس نے (اپنے بھتیجے) ابراہیم نظام شاہ کے بچے بہادر کی بادشاہی کا اعلان کرادیا اور اس کے بعد اتنی دلیری اور خوش انتظامی کے ساتھ محاصرین کا مقابلہ کیا کہ ان کے دل چھوٹ گئے اور کچھ سامان رسد کی کمی اور کچھ بیجاپور کی کمک آنے کی خبر سن کر وہ مصالحت پر آمادہ ہو گئے۔

(۳) الحاق برار

بے شبہہ چاند سلطان کی مردانہ حبّ وطن اور قابلیت نے شہر احمد نگر کو دشمنوں سے بچا لیا۔ لیکن اہل وطن کی اصلی کمزوری کا وہ کوئی علاج نہ کرسکتی تھی اور اسی لئے اسے شرائط صلح میں اضلاع برار سے دست بردار ہونا پڑا جہاں کے امرا پہلے ہی دربار احمد نگر سے منحرف تھے۔ اس معاہدے سے ریاست احمد نگر کا نہ صرف شمالی علاقہ مغلوں کے قبضے میں آگیا بلکہ بیجاپور اور گولکنڈے کی امدادی فوج سے لڑنے کے لیے وہ گوداوری کو عبور کر کے سرکار عالی کے موجودہ ضلع ناندیڑ تک بڑھ آئے اور کہنا چاہئے کہ دکن کی دونوں جنوبی ریاستوں سے بھی بالواسطہ ان کی لڑائی چھڑ گئی۔

لیکن اس صلحنامہ سے احمد نگر کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ مغلوں کے ہٹتے ہی احمد نگر کے بے وفاؤں نے پھر سیاسی انتشار پیدا کر دیا۔ جن لوگوں کو ملکہ چاند بی بی نے سلطنت کی وزارت تفویض کی تھی بے وفا ثابت ہوئے اور جب ملکہ سے ان بن ہو گئی تو مغلوں کو دعوت دینی شروع کی۔ مغل تو منتظر ہی تھے۔ دوسرے ہی سال عبدالرحیم خانخاناں اور شہزادۂ مراد حملہ کرنے کے لئے بڑھے۔ احمد نگر میں تو کوئی فوجی طاقت نہیں تھی۔ بیجاپور کے مشہور جنرل سہیل خاں نے اس کا مقابلہ کیا۔ دریائے گوداوری کے کنارے سوپہ کے مقام پر یہ لڑائی ہوئی جنوری ۱۵۹۷ء یہ اگرچہ شہنشاہی فوج کا مقابلہ تھا جس کی کمان خانخاناں اور شہزادۂ مراد کے ہاتھ میں تھی اور شاہرخ مرزا اور راجہ علی خاں والی خاندیس بھی فوج میں تھے لیکن سہیل خاں کی مردانہ ہمت

کی وجہ سے سخت معرکہ ہوا اور حملوں کو بڑی مشکل سے کامیابی ہوئی ادھر سے سہیل خاں اور مغلوں کی طرف سے راجہ علی خاں میدان میں کھیت رہے اس کامیابی کے بعد مغل آسانی سے احمد نگر پر قبضہ کر سکتے تھے لیکن مراد اور خانخاناں کی نااتفاقی سے کوئی پیشقدمی نہیں ہوئی اور مغل فوج اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

الحاق خاندیس

راجہ علی خاں فاروقی نے اپنی پوتی کو شہزادہ مراد سے منسوب کر کے بظاہر اپنے آئندہ استقلال کا مزید اطمینان کر لیا تھا لیکن سوپہ کی لڑائی میں یہ مارا گیا (۱۰۰۵ھ / ۱۵۹۷ء) اور تقدیر سے شہزادہ مراد نے چند ماہ بعد برار میں وفات پائی۔ ادھر حکومت خاندیس کا نیا وارث بہادر خاں (ابن راجہ علی خان) ایک ناتجربہ کار عیش دوست آدمی نکلا یہ اپنے باپ کی طرح مغلوں کا دوست نہیں تھا چنانچہ دکن کے نئے صوبہ دار اور خانخاناں کی فوجیں خاندیس میں سے ہو کر گزریں تو اس نے خیر مقدم سے پہلوتہی کی خود دانیال نے اس کی خبر لینی چاہی لیکن خود اکبر معاملات دکن کو صاف کرنے کی نیت سے مانڈو میں پہنچ گیا (۱۰۰۸ھ / ۱۵۹۹ء) تو خاندیس و احمد نگر کی رہی سہی آزادی کا خاتمہ ہونے میں زیادہ دیر نہ لگی اور گو قلعہ اسیر گڑھ کو بلند پہاڑیوں پر اس اہتمام و استحکام سے بنایا گیا تھا کہ اس زمانے کے آلات قلعہ کشائی کارگر نہ ہو سکتے تھے۔ نیز بہادر نے طویل سے طویل محاصرے کی پیش بندی میں دس برس کا آذوقہ فراہم کر لیا تھا۔ اسی وجہ سے ایک سال سے زیادہ اس کا محاصرہ کرنا پڑا اور فتح اس طرح ہوئی کہ محاصرے میں شہر کے اندر وبا پیدا ہوئی اور بعض دیگر اوہام نے بہادر کو اس درجہ خوف زدہ کیا کہ اس نے ہتیار رکھ دئے اور دعویٰ حکومت سے دست بردار ہو گیا۔ خاندیس کا مستقل طور پر سلطنت مغلیہ سے الحاق کر لیا گیا (۱۰۰۹ھ / ۱۶۰۱ء) اور بہادر کی زندگی کے باقی دن معمولی امیر کی حیثیت سے شاہان مغلیہ کے دربار میں بسر ہوئے ۔

فتح احمد نگر

پہلے محاصرے کے بعد مغل سرداروں نے صرف برار پر قناعت نہ کی تھی اور جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، احمد نگر کے جنوب مشرقی اضلاع پر بھی دست تصرف دراز کر رہے تھے۔ امرائے احمد نگر بیجاپور اور گولکنڈے کی مدد سے ان کے خلاف جا بجا جد و جہد کر رہے تھے اسی وجہ سے ۱۵۹۷ء میں سوپہ کی لڑائی ہوئی لیکن صدر حکومت کی کمزوری اور اندرونی نفاق کی وجہ سے خاطر خواہ کوئی تدارک ممکن نہ تھا اور اکبر نے خاندیس پہنچ کر اس رہی سہی بادشاہی کے بھی خاتمہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ چنانچہ اسیر گڑھ کے محاصرے کے ساتھ میرزا عبدالرحیم کو احکام بھیج دئے گئے کہ برار و دولت آباد کی طرف سے تمام مغلیہ فوجیں سمیٹ کر پہلے احمد نگر کو

باب ۱

فتح کر لے کہ صدر حکومت کے خاتمے سے دیگر امرائے نظام شاہی کی ہمتیں پست ہو جائیں ؛
الغرض مغل افواج نے دوبارہ شہر احمد نگر کو گھیر لیا (۱۰۰۸ھ ۱۵۹۹ء) اور اس مرتبہ چاند سلطان کو
مصلحت اسی میں نظر آئی کہ بہادر شاہ فاروقی کی طرح قلعہ محاصرین کے حوالے کر دیا جائے۔
لیکن اس کے فوجی سرداروں نے یہ مشورہ نہ مانا اور کچھ بزدلی اور کچھ غداری کے شبہے پر
اس نامور خاتون کو قتل کر دیا۔ ان کی یہ ظالمانہ سفاکی احمد نگر کو نہ بچا سکی۔ مغلوں نے سرنگ لگا کر
فصیلوں میں رخنے ڈال دیئے اور قلعے میں گھس کر ایسا قتل عام کیا کہ فرشتہ کے قول کے بموجب
نام نہاد بادشاہ بہادر نظام شاہ کے سوائے کوئی ان کی تلوار سے زندہ نہ بچا[1] (۱۰۰۹ھ ۱۶۰۰ء)
بایں ہمہ اہل احمد نگر نے اغیار کے طوق حکومت کو خود گلے میں ڈالنے کا ننگ گوارا نہ کیا اور ان کے
جو سردار ادھر ادھر منتشر تھے یا فتح سے کچھ پہلے نکل گئے تھے وہ بھی سالہا سال تک
اپنی آزادی کے لئے مغلوں سے جدوجہد کرتے رہے۔ چنانچہ گو شہر احمد نگر کی تسخیر کے ساتھ ہی
"نظام شاہی ریاست" کے سلطنت مغلیہ میں الحاق کا اعلان کرا دیا گیا تھا لیکن حقیقی طور پر
اس الحاق کی تکمیل پینتالیس برس کے بعد ہو سکی جس کا حال آگے آتا ہے ؛

تیسری فصل:۔ جہانگیر و شاہجہاں

اکبر کی وفات

خاندیس و احمد نگر کی تسخیر نیز ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور سے سالانہ "پیشکش"
یا خراج گزاری کا اقرار لے کر خود اکبر آگرے چلا گیا اور دکن کے تین نئے صوبے میرزا عبدالرحیم
خانخاناں کی اتالیقی میں اپنے چھوٹے بیٹے شہزادہ دانیال کے سپرد کر گیا تھا جسے تھوڑے سے
عرصے بعد بیجاپور کے بادشاہ نے اپنی بیٹی بیاہ دی کہ مغلوں کے ساتھ نئے اتحاد کو مزید قوت پہنچائی جائے۔ لیکن
ظاہر ہے کہ اسی قسم کی غلطی یا مجبوری تھی جس نے خاندیس کے معاملات میں مغلوں کو مداخلت کا موقع دیا تھا چنانچہ
انجام کار حکومت بیجاپور پر بھی وہی گھڑی جو طاقتور مغلوں سے تعلق ہونے کی بدولت خاندیس پر گزری تھی ؛
مگر یہ بعد کے واقعات ہیں۔ خود اکبر کو اودے پور و بنگالہ کی طرح بیجاپور اور ایک طرف
فتح احمد نگر کی خاطر خواہ تکمیل کی فرصت نہیں ملی۔ اور گو خوشامدی جوتشیوں اور نجومیوں نے

[1] تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۱۶۴۔ بہادر نظام شاہ کو قلعہ گوالیار میں قید کر دیا گیا تھا اور ایک عرصے بعد وہیں اس نے وفات پائی ؛

درازی عمر کے یقینی "حکم" لگا کر بادشاہ کے دل میں طرح طرح کی موہوم آرزوئیں پیدا کر دی تھیں، لیکن دکن سے مراجعت کو تین چار سال ہی گزرے تھے کہ وہ آگرے میں بیمار ہوا اور تقریباً پینسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔ (جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۶۰۵ء) اور ترکے میں اتنی بڑی اور دولتمند و خوشحال سلطنت چھوڑی کہ سلطنت عثمانیہ کے سوائے دنیا کی کوئی ہمعصر سلطنت اس کے برابر نہ تھی!

جہانگیر ۱۰۱۴ھ تا ۱۰۳۷ھ ۱۶۰۵ء ۱۶۲۷ء

اکبر کے دونوں چھوٹے بیٹے اس کی زندگی میں انتقال کر گئے تھے اور اگرچہ ولیعہد سلطنت یا بڑے بیٹے شہزادہ سلیم سے آخری ایام حکومت میں وہ کئی مرتبہ ایسا ناخوش ہوا کہ عجب نہ تھا کہ خانہ جنگی کی نوبت پہنچ جائے با ایں ہمہ بعض امرا کی یہ کوشش کہ اس شہزادے کے فرزند خسرو کو اپنے دادا کا جانشین بنایا جائے۔ کارگر نہ ہو سکی نئے بادشاہ کا جہانگیر کے لقب سے اعلان تخت نشینی ہوا اور جب شہزادہ خسرو نے پایۂ تخت سے بھاگ کر کچھ فتنہ و فساد برپا کرنا چاہا تو اس وقت بھی بہت جلد اس کا تدارک کر دیا گیا اور خسرو کی باقی زندگی قید میں کٹی۔

دکن کی لڑائیاں

بنگالے اور اودے پور کی فتوحات میں جو کسر باقی رہ گئی تھی، وہ جہانگیر کے عہد میں پوری ہوئی جس کا ہم اوپر تذکرہ کر چکے ہیں۔ لیکن ریاست احمد نگر پر کامل قبضہ حاصل کرنے میں ان دونوں مہمات سے کہیں زیادہ اہتمام اور درد سری کی ضرورت تھی اور جس وقت وہاں کے ایک حبشی سردار ملک عنبر نے خاندان نظام شاہی کے نئے وارث مرتضیٰ نظام شاہ کی (جو اس خاندان کے دوسرے فرمانروا برہان کا پوتا تھا) بادشاہی تسلیم کر لی تو چند سال کے واسطے اس ریاست کے بے جان قالب میں گویا نئی روح پیدا ہو گئی۔ ملک عنبر غضب کا مستعد، منتظم اور دور اندیش سپہ سالار تھا۔ اگرچہ اس کی حکومت پوری طرح سرکار عالی کے موجودہ صوبہ اورنگ آباد، اور صوبہ بمبئی کی قسمت وسطی (سنٹرل ڈویژن) کے تمام اضلاع پر بھی نہ چلتی تھی، تاہم اپنے زیر اثر علاقے کے شاید ہر قابل جنگ آدمی کو اس نے سپاہی بنا دیا تھا اور درحقیقت اسی حبشی سپہ سالار کی کوشش کا ثمرہ تھا کہ یہاں کے مرہٹے باشندے بن حیث القوم فنون جنگ سے آشنا ہوئے اور انھیں "قزاقانہ جنگ" کے ان طریقوں کی مشق و مہارت ہوئی جو بعد میں، اہل دکن، بالخصوص مرہٹہ سپاہیوں کی، خصوصیت سمجھی جانے لگی تھی۔

چند سال تک دکن کے مغل صوبہ دار ملک عنبر سے الجھتے اور اپنے طور پر اس کی دست درازیوں کا سد باب کرتے رہے۔ لیکن جب ۱۰۲۸ھ (۱۶۱۹ء) میں اس نے دولت آباد کے

علاقے سے بڑھ کر خاندیس پر یورش کی بلکہ نربدا کو اتر کے مالوے کے بعض جنوبی اضلاع بھی تاراج کر گیا تو بادشاہ کو وسیع پیمانے پر جنگی مہم کی تیاری کرنی پڑی اور اودے پور کا ٹکڑے کا فاتح شہزادہ خرم افواج دکن کی سپہ سالاری پر مامور ہوا (۱۰۲۹ھ ۱۶۲۰ء)

شہزادہ خرم کی سپہ سالاری

یہ شہزادہ، جس کے عہد بادشاہی کے غیر معمولی تزک و احتشام، اور بزم عیش و فراغت کی دھوم دھام نے، اس کے جنگی کارناموں کو چھپا لیا ہے، درحقیقت فن حرب کا ماہر اور اپنے زمانے کا نہایت کامیاب سپہ سالار تھا۔ آج کل ذاتی شجاعت و سپہ گری کی چنداں قدر نہیں ورنہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے کہ (فرخ سیر سے پہلے) خاندان تیموری کا ہر فرماں روا شیر دلی اور بہادری کے اعتبار سے جوانمردان روزگار میں شمار ہونے کے لائق ہے لیکن سپہ سالاری کا کمال یہ مانا جاتا ہے کہ ہم کو غنیم لڑنے پر مجبور نہ کر سکے بلکہ ہم جب اور جہاں چاہیں وہاں اسے جنگ کرنے پر مجبور کر دیں۔ شہزادہ خرم کی راجپوتانہ اور دکن، دونوں ملکوں کی لڑائیاں فن حرب کی اسی مہارت کی نظیریں ہیں کہ دونوں جگہ دشمن کو ایک وسیع اور پہاڑی ملک میں پناہ لینے کے موقعے حاصل تھے اور اس کی ساری کوشش یہی یہ تھی کہ مغلوں سے میدانی جنگ کی نوبت نہ آئے، بلکہ تنگ مقامات پر قزاقانہ تاخت اور ناگہانی حملوں سے ان کی ہمت اور قوت کمزور کر دی جائے اور ان کی رسد رسانی میں اس قدر مشکلات پیدا کر دی جائیں کہ وہ طوعاً و کرہاً ملک سے دفع ہو جائیں۔ اہل دکن کو رسد روکنے کے لئے خود اپنا ملک تاراج کرنے میں باک نہ تھا، اور آٹھ دس برس کی پیہم جنگ و جدال میں وہ نہ صرف نہایت مشاق اور تیز دست سپاہی ہو گئے تھے، بلکہ مغلوں کے خلاف ان کی جدوجہد میں بعض اوقات اس مایوسانہ جانبازی کی شان نظر آتی ہے جس نے اودے پور جیسی چھوٹی ریاست کے باشندوں کو سالہا سال تک مغلوب نہ ہونے دیا تھا۔ لیکن شہزادہ خرم کی جنگی تدابیر و شجاعت سے ملک عنبر کے تمام منصوبے الٹ دیے شمالی دکن کے چپے چپے سے عنبر کی واقفیت، دکنی سپاہیوں کی بہادری اور گریز پائی، کوئی شے کارگر نہ ہوئی۔ تھوڑے ہی دن بعد دکنی دستے نہ صرف جا بجا سے پسپا ہو کر مرکزی مقامات کی طرف سمٹنے لگے بلکہ صاف نظر آنے لگا کہ ان کا حریف مقامی واقفیت اور یک بہ یک حملہ کرنے کے فن میں خود ان سے چار قدم آگے ہے۔ چنانچہ ایک ہی سال (۱۰۳۰ھ ۱۶۲۱ء) کے اندر اہل دکن کو بالکل اپنے منشا اور مصلحت کے خلاف دو یا تین میدانوں میں مجبوراً لڑائی لڑنی پڑی اور ہر جگہ انھوں نے سخت نقصان اٹھایا کیونکہ اس میں کوئی کلام نہ تھا کہ جنگی ساز و سامان اور کھلے میدان کی

لڑائی لڑنے میں مغل اہل دکن پر برتری رکھتے تھے ؎

دربارى سازشیں

اب ملک عنبر صلح پر آمادہ تھا۔ مغل فوجیں بھی زیادہ عرصے تک ایسے ملک میں جہاں کئی فصل سے زراعت نہ ہوئی تھی۔ قیام نہ کرسکتی تھیں۔ لہٰذا آئندہ اطاعت وخراج گزاری کے عہد وپیمان، پچھلے خراج کی رقوم کی ادائی اور احمد نگر کے شمالی اضلاع سے دست برداری کے اقرار پر شہزادۂ خرم نے اسے امان دیدی اور خاندیس وبرار کی جانب فوجیں واپس ہٹا لایا (سنہ ۱۰۳۰ھ ۲۱-۱۶۲۰ء) مگر ملک عنبر کی فوجی قوت اس قدر مضمحل ہوگئی تھی کہ تھوڑے سے وقفے کے بعد آیندہ جب کبھی مغل فوج کشی کرتے، اپنے حریف کو پامال کرڈالتے لیکن اس کی نوبت نہ آئی تھی کہ بعض نئے واقعات نے دربار جہاں گیر میں سخت انتشار پیدا کردیا اور اس کی حکومت کے آخری چند سال انھی درباری سازشوں میں ختم ہوئے جن کی اصلی ذمہ دار بادشاہ کی محبوب ملکہ **نور جہاں بیگم** تھی ؎

ہوا یہ کہ سنہ مذکور میں بادشاہ سخت بیمار ہوا اور امیروں میں اس کی وراثت کے متعلق سرگوشیاں ہونے لگیں۔ جہاں گیر کا بڑا بیٹا خسرو قید میں تھا اور اسی سال اس نے وفات پائی اور بعض راویوں نے شبہہ ظاہر کیا ہے کہ اسے شہزادۂ خرم کے ہوا خواہوں نے زہر دے دیا۔ دوسرا بیٹا پرویز عیش دوست لاابالی مزاج شہزادہ تھا اور اسی طرح سب سے چھوٹا **شہریار** اپنے سنجھلے بھائی خرم کے مقابلے میں حکومت وبادشاہی کی کوئی امید نہ رکھ سکتا تھا۔ ادھر نور جہاں بیگم کے باپ نواب **اعتماد الدولہ** کے انتقال کے بعد قلمدان وزارت مرحوم کے فرزند ابوالحسن (المخاطب بہ یمین الدولہ **آصف خاں**) کے سپرد ہوا جس کی اقبال مند بیٹی ارجمند بانو بیگم شہزادۂ خرم سے منسوب تھی اور **ممتاز محل** کے لقب سے دنیا کی مشہور ومعروف خواتین میں داخل ہے پس ان سب اسباب نے مل کر نور جہاں بیگم کو یقین دلایا کہ تخت کا آئندہ وارث بظاہر شہزادۂ خرم کے سوا جسے انھی دنوں فتوحات دکن کے صلے میں "شاہ" کا لقب عنایت ہوگیا تھا) دوسرا نہیں ہوسکتا۔

بایں ہمہ جہانگیر کی صحت یابی اور اعتماد الدولہ کی وفات کے بعد معاملات سلطنت میں اپنا روز افزوں رسوخ واثر دیکھ کر، نور جہاں اس بات پر آمادہ ہوگئی کہ جس طرح ممکن ہو

؎ خافی خاں جلد اول ۳۲۵ ؎

باب ۳

شہزادہ خرم کی قوت کمزور کر دی جائے۔ دولت و حکومت کی چاشنی سے یقیناً اس کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہو گیا تھا کہ جہانگیر کے بعد بھی اس کے ذاتی اقتدار میں فرق نہ آئے اور اس نے اپنی بیٹی کو جو پہلے شوہر سے تھی، شہزادۂ شہریار کے ساتھ ضرور اسی خیال سے منسوب کر دیا تھا۔ لیکن تاریخ نویسوں کا یہ عام قیاس کہ وہ شہریار ہی کو مالک ہند کا فرماں روا بنانا چاہتی تھی یا یہ کہ جہانگیر بالکل اس کی مرضی کا تابع ہو گیا تھا کہ وہ جو چاہتی کر لیتی، آسانی سے قابل تسلیم نہیں ہے۔

جہانگیر کے خصائل

اس جگہ ہمیں سب سے پہلے جہانگیر بادشاہ کے ذاتی خصائل یا مزاج کو سمجھنے کی کوشش کرنی پڑے گی حالانکہ اس کتاب میں اس قسم کی بحث چھیڑنے سے ایک حد تک احتراز کیا گیا ہے۔ حقیقت میں جب کہ ہم اپنے احباب و اقربا تک کے ذاتی مزاج و خصلت کا اندازہ کرنے میں بعض اوقات سخت غلطی کرتے ہیں، تو قیاس کرنا چاہیے کہ گزشتہ اشخاص کے بارے میں کوئی قطعی رائے لگانی کس درجہ دشوار بلکہ بے احتیاطی کی بات ہوگی؟ بہر نوع، مسلمہ تاریخی واقعات کو پڑھنے اور پرکھنے سے جہانگیر کے متعلق جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ گو اس نے تخت نشین ہو کر "دین الٰہی اکبر شاہی" کے ان آئین و قوانین کو جن سے مسلمانوں کو سخت اختلاف تھا منسوخ کر دیا، تاہم خود وہ ایسا بے اصول، رند مشرب سا آدمی ہے جس کا مطمح نظر صرف یہ ہو کہ دنیا کی زندگی کو اپنی خواہشوں کے مطابق عیش و آرام کے ساتھ گزار دیا جائے۔ ذہانت و فراست میں وہ کسی طرح اپنے باپ سے کم نہیں اور علمی قابلیت کے اعتبار سے کہیں افضل ہے۔ اسی طرح مطلق العنانی اور داب شاہی کا وہ پاس و لحاظ جو سلاطین مغل کی خصوصیت ہے اس میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے چنانچہ اس کے عہد میں نہ صرف "زمیں بوس" یا "سجدے" کی رسم جاری رہی بلکہ اسی قبیل کے بعض اور آئین وضع ہوئے کہ بادشاہ اور اس کی رعایا کے فرق مراتب کو نمایاں کیا جائے۔ وہ بہادری اور کشور کشائی کے جذبے سے خالی نہیں۔ لیکن عیش دوست و آسانی پسند ہے اور کسی طویل جنگ کے مصائب برداشت کرنے گوارا نہیں کرتا۔ البتہ اپنے اندرونی ملکی معاملات پر اس کی کافی نگرانی ہے اور وہ اتنی فہم و قابلیت رکھتا ہے کہ عہد اکبری میں نظم و نسق کے جو آئین جاری ہو گئے تھے ان پر اپنے ماتحتوں سے عملدرآمد کراتا رہے حتیٰ کہ انھیں "فرائض جہانداری" کو خاطر خواہ ادا کرنے کے واسطے وہ بالعموم دن کے وقت شراب نہیں پیتا جس کی جوانی سے اسے لت پڑ گئی تھی۔ نیز اعلان کراتا ہے کہ

رعایا میں سے جو شخص جس وقت چاہے بادشاہ سے مل سکتا ہے اور اس غرض سے ایک "زنجیر عدل" فصیل قلعہ کے نیچے تک لٹکائی جاتی ہے کہ دادخواہ قلعے کے باہر ہی سے زنجیر ہلا کر بادشاہ کو متوجہ کر سکے ۔

سازشوں کا انجام

ایسے بادشاہ پر نور جہاں بیگم کا، جسے خود جہانگیر نے معمولی درجے سے بڑھا کر اعلیٰ مرتبہ پر پہنچایا، ایسا قابو پا جانا کہ اس کے خلاف منشا کوئی کام نہ کر سکے، عقل میں نہیں آتا اور نہ واقعات اس خیال کی تائید کرتے ہیں۔ دوسرے جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، بہت ممکن ہے کہ اوّل اوّل نور جہاں شہزادۂ خرّم کی قوت توڑ کر صرف یہ چاہتی ہو کہ تینوں بھائیوں میں ممالک ہند کی اس طرح تقسیم ہو جائے کہ اس کے داماد شہریار کا بھی ایک حصۂ ملک پر بادشاہانہ قبضہ رہے۔ امیر تیمور کی سلطنت اس کے پوتے اور پر وتوں میں اسی طرح تقسیم ہو گئی تھی اور خود شہزادۂ خرّم بادشاہ ہو کر غالباً یہی چاہتا تھا کہ اس کے چاروں فرزند علیٰحدہ علیٰحدہ ممالک پر فرماں روا رہیں لیکن تیموری نسل کے ہندی شہزادے عزم و ہمت اور وسعت نظر میں اپنے اجداد سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے اور ان کے شوق شہنشاہی نے اس قسم کی کسی تجویز پر کبھی بھی ایسا عملدرآمد نہ ہونے دیا جو دیرپا ہوتا۔ دوسرے جہانگیر کی اولاد کے متعلق ایسی تقسیم کا کوئی منصوبہ تھا بھی تو آئندہ واقعات نے اسے بہت جلد درہم و برہم کر دیا اور چند ہی سال میں معاملات کی صورت اس قدر جلد جلد بدلی کہ آخری نتیجے کو اگر محض تقدیری فیصلہ کہا جائے تو کچھ بیجا نہ ہو گا ۔

قندھار

اصل یہ ہے کہ جس زمانے میں نور جہاں بیگم بادشاہ کو شہزادۂ خرّم سے ناراض کر دینے کی فکر میں تھی، ایرانیوں کے قندھار پر فوج کشی کرنے کی اطلاع ملی۔ یہ شہر یا صوبہ ہمایوں کے وقت سے دولت ایران و ہند میں مابہ النزاع تھا اور اس مرتبہ خود شاہ ایران اس کی تسخیر کے لئے بڑھا تھا (۱۰۳۱ھ ۱۶۲۲ء) لہٰذا جہانگیر نے شہزادۂ خرّم کے نام احکام جاری کئے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اپنی افواج کو لے کر دکن سے واپس آئے اور اس نئے خطرے کا دفعیہ کرے۔ اس نئی مہم کو لے جانے کے صلے میں شہزادے نے جو مطالبہ پیش کیا کہ پنجاب کے اکثر اقطاع اسے بطریق جاگیر دے دیئے جائیں وہ بھی بادشاہ نے قبول کر لیا تھا بایں ہمہ اس نے موسم بارش کے عذر پر مالوے سے

بڑھنے میں بہت دیر کی۔ قندھار فتح ہوگیا اور اس موقع پر نورجہاں بیگم نے اگر بادشاہ کو یہ یقین دلا دیا کہ یہ شہزادۂ حکم کی تعمیل میں لیت ولعل کرتا ہے، تو یہ کچھ بے بنیاد بات نہ تھی بادشاہ شہزادۂ خرم کی جانب سے مکدر ہوگیا اور اس نے قندھار کو واپس لینے کی مہم پر شہزادہ شہریار کو نامزد کر کے احکام جاری کر دیئے کہ جو بادشاہی فوجیں مالوے میں شہزادۂ خرم کے ساتھ ہیں وہ بلا تاخیر آگرے پہنچ جائیں۔

یہ اور دیگر واقعات بادشاہ کی ناراضگی کا کھلا ہوا ثبوت تھے اور اس حالت میں اگر شہزادۂ خرم نے تمام فوج کے ساتھ آگرے کی طرف کوچ کیا تو جہانگیر ہی پر منحصر نہیں، عام طور پر یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ شہزادہ باغی ہوگیا[1] اور جنگ کے ارادے سے پیش قدمی کر رہا ہے۔ بادشاہ ان دنوں لاہور میں مہم قندھار کی تیاری میں مصروف تھا۔ یہ پریشان کن خبریں سن کر اسے پائے تخت کی طرف آنا پڑا اور دہلی میں ٹھیر کر اس نے شہزادۂ خرم کے خلاف ایک فوج روانہ کی کہ جبراً اسے آگے بڑھنے سے روک دے کیونکہ شہزادے کو دکن واپس جانے کے جو احکام بھیجے گئے تھے، ان کی تعمیل میں ہر مرتبہ اس نے یہ عذر کیا تھا کہ میں خود حضور کی خدمت میں باریاب ہونا چاہتا ہوں۔

ہمعصر فارسی مورخ جو علانیہ شہزادۂ خرم کے جانب دار ہیں ہر طرح اس کی بے گناہی ثابت کرتے ہیں۔ لیکن واقعی وہ محض باپ کے شکوک دفع کرنے کے لیے آیا تھا، یا کسی اور قصد سے یہ مسلم ہے کہ بادشاہی فوجوں کا مقابلے کے لئے روانہ ہونا سن کر پھر اسے پیش قدمی کی ہمت نہ ہوئی اور اپنی فوجیں فتح پور (سیکری) ہی میں چھوڑ کر وہ خود دکن کی طرف واپس چلا گیا۔ لیکن اب اس کی حیثیت ایک مفرور باغی کی سی تھی اور آیندہ تین چار سال تک بادشاہی احکام اس کی گرفتاری کی فکر میں رہے، اور وہ کبھی مالوے سے دکن، دکن سے بنگالہ اور پھر دکن و گجرات، سندھ و راجپوتانہ میں اپنی جان بچاتا پھرا۔ اسی تعاقب کے دوران میں شہزادۂ پرویز کا انتقال ہوا (۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۶ء) اور انھی سرگرمیوں میں نورجہاں بیگم کی اپنے بھائی اور آخر میں سپہ سالار مہابت خاں[2] سے ان بن ہوئی اور

---

[1] خافی خاں جلد اول ۳۳۴ نیز دیکھو اقبال نامۂ جہانگیری صفحہ ۱۹۸ و ۱۹۹ وغیرہ۔
[2] اصلی نام زمانہ بیگ تھا لیکن اس کے بیٹے خان زماں خان کا بیان ہے کہ ہم لوگ خاندان سادات

باب ۳

اس نے موقع پاکر ایک مرتبہ خود بادشاہ کو اپنی حراست میں لے لیا (۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۶ء) جس سے بہ مشکل نجات ملی اور کچھ عرصے کے لئے کاروبار سلطنت میں انتشار پیدا ہو گیا۔

شہزادۂ خرم کی تخت نشینی

اس عرصے میں شہزادۂ خرم جابجا شکستیں کھا کر بالکل مایوس و مجبور ہو گیا تھا اور مالوے کے قلعے جواب تک اس کے قبضے میں تھے نیز اپنے بیٹے بطور یرغمال بادشاہ کے حوالے کر کے بلا شرط اطاعت پر آمادہ تھا، اور اگر نورجہاں بیگم رخنہ اندازی نہ کرتی تو غالباً باپ بیٹوں میں صفائی ہو جاتی۔ لیکن ابھی تک دلوں میں تھوڑا بہت غبار باقی تھا کہ جہانگیر پر قدیم مرض (دمے) کا دورہ پڑا اور کشمیر کا سفر ملتوی کر کے وہ واپس لاہور آتا تھا کہ راستے میں وفات پائی (ماہ صفر ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء) اور تھوڑے ہی عرصے میں آصف خاں نے شہریار کو لاہور میں شکست دے کر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۶) سے ہیں اور شیراز سے آکر کابل میں آباد ہوئے۔ بزمانہ بیگ جوانی میں شہزادۂ سلیم کی سرکار میں ملازم ہوا اور ترقی کرتے کرتے ۱۰۲۶ھ / ۱۶۱۷ء میں سہ ہزاری منصب اور صوبہ داری کابل پر نامزد ہو گیا تھا اور شہزادۂ خرم سے نورجہاں بیگم کی مخالفت شروع ہوئی تو بیگم نے اسی کو اپنے بھائی کی بجائے عہدۂ وزارت پر مقرر کرا دیا کہ شہزادۂ خرم کے مقابلے کے واسطے اس سے بہتر کوئی شخص نظر نہ آتا تھا اول اول اس منصوبے میں کامیابی بھی ہوئی لیکن بعد میں نورجہاں اس کی سرکشی اور شہزادۂ پرویز کی طرفداری دیکھ کر ناخوش ہو گئی اور اسے معزول و ذلیل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ لہذا مہابت خاں نے جو نہایت بے اصول و بے باک سپاہی تھا، اثنائے سفر میں موقع پاکر جب کہ شاہی لشکر دریائے جہلم کو عبور کر چکا تھا اور بادشاہ کے ساتھ تھوڑے سے خدمت گار رہ گئے تھے، بارگاہ شاہی کو گھیر کر جہانگیر کو حراست میں لے لیا۔ پھر چند ماہ تک اگرچہ ظاہراً آداب شاہی میں کوئی فرق نہ آیا اور مہابت خاں دست بستہ حضور میں حاضر رہتا تھا لیکن "جہاں پناہ اس کے منشا کے بغیر کوئی کام نہ کر سکتے تھے اور چند راجپوت سپاہی تلوار لیے ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے (۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۶ء)" آخرکار کابل جا کر بہ مشکل بعض تدبیروں سے اس بلا سے نجات ملی اور اب مہابت خاں کو جان بچا کر فرار ہونا پڑا۔ اس نے شہزادۂ خرم کی پناہ لی تھی جو خود بھی گجرات و دکن میں منہ چھپاتا پھرتا تھا۔ شہزادۂ خرم کی تخت نشینی کے بعد اپنی مختلف کارگزاریوں کے صلے میں اسے "خان خاناں" کا خطاب اور ہفت ہزاری منصب عطا ہوا اور آخر تک وہ سلطنت کا نہایت معزز رکن رکین رہا۔ ۱۰۴۴ھ / ۱۶۳۴ء میں وفات پائی۔

باب ۳

گرفتار کر لیا۔ غالباً اسی حریف سے مقابلہ کرنے اور عوام الناس کو دھوکا دینے کے واسطے اس نے جہانگیر کے مرتے ہی شہزادۂ خسرو مرحوم کے بیٹے داور بخش کی بادشاہی کا اعلان کر دیا تھا لیکن جب شہریار اور نیز شہزادۂ دانیال بن اکبر کے دو بیٹے جن سے شورش و فساد کا اندیشہ تھا، قابو میں آ گئے تو شہزادۂ خرم کے اشارے سے (جو دکن کے قلعہ جُنیر میں باپ کے انتقال کی خبر سنتے ہی احمد آباد کے راستے آگرے آ رہا تھا) ان کے ساتھ داور بخش کو بھی قتل کرا دیا گیا اور انسانی جانوں کی یہ قیمتی بھینٹ چڑھا کر "ہندوستان کا سب سے اقبال مند مغل بادشاہ" آگرے میں شاہجہاں کے لقب سے تخت نشین ہوا (۱۴ جمادی الآخر ۱۰۳۷ھ مطابق جنوری ۱۶۲۸ء)۔

چند اندرونی مفسدے (۱) جھجار سنگھ بندیلہ

آیندہ بتیس برس کی حکومت میں شاہجہاں کو بیرونی مہمات کے علاوہ چند اندرونی مفسدے بھی دفع کرنے پڑے، جن میں جھجار سنگھ[1] بندیلہ کی شورش اور خان جہاں لودھی کی بغاوت سب سے اہم اور قابلِ ذکر ہیں۔ بندیل کھنڈ کا یہ راجہ بیر سنگھ کا بیٹا تھا جس نے جہانگیر کے حکم سے ابوالفضل کو دکن سے آگرے آتے میں قتل کیا اور اس جرم کی سزا میں اکبر نے اس کی ریاست کو پامال و تاراج کرایا تھا۔ لیکن جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد اس کی بڑی قدر و منزلت ہوئی اور وہ سلطنت کے نہایت معزز امیروں میں داخل کر لیا گیا۔ بادشاہ کے اسی لطف خاص کے زعم پر وہ نہ صرف اپنی رعایا بلکہ ہمسایوں اور مسافروں پر طرح طرح کے ظلم کرنے لگا تھا اور کچھ ملکی خلفشار، کچھ بادشاہ کے پائے تخت سے باہر رہنے کی وجہ سے بھی لوگوں کو ایسے منظورِ نظر سردار کے خلاف شکوے شکایت کا موقع نہیں ملتا تھا، شاہجہاں کو تخت نشینی ہی کے وقت سے اس کی تنبیہ و تادیب کا فکر تھا کہ اس کی وفات کی اطلاع ملی اور ساتھ ہی اس کے بیٹے جھجار سنگھ نے بادشاہ کی بغیر اجازت، آگرے سے چھپ کر اپنے وطن کی راہ لی۔ دراصل اسے اپنے باپ کی زیادہ ستانیوں کے محاسبے کا خوف ہو گیا تھا لیکن ظاہر ہے کہ اس مطالبے سے بچنے کے لئے یہ علانیہ سرکشی مغل شہنشاہ کو کسی طرح گوارا نہ ہو سکتی تھی۔ فوراً ایک فوج راجہ کی سرکوبی کے لئے جس کا علاقہ قریب قریب وہی تھا جو آج کل "مغربی بندیل کھنڈ" کہلاتا ہے روانہ ہوئی اور

[1] فارسی تواریخ میں اسے جا بجا "نرسنگھ دیو" لکھا ہے۔

پیہم شکست و ناکامی نے جھجار سنگھ کو چند ہی روز میں امان مانگنے پر مجبور کیا۔ اور گو خود اس کے چند ہم قوم افواج شاہی میں موجود اور منصب راجگی کے اہل و امیدوار تھے با ایں ہمہ شاہجہاں نے اس کی دست بستہ معافی قبول کر لی اور خراج کے ساتھ تھوڑا سا علاقہ ضبط کرنے کے بعد اسے ریاست پر بحال کر دیا گیا[۱] (۱۰۳۹ھ / ۱۶۲۹ء)۔

چند سال کے بعد جھجار سنگھ نے پھر علانیہ بغاوت پر کمر باندھی اور اپنی قزاقیوں سے دکن کے راستے مخدوش کر دیئے اس وقت شہزادہ اورنگ زیب بندیلوں کے استیصال پر مامور ہوا اور اس کی سپہ سالاری میں مغل فوجوں نے اس ریاست کے تینوں مشہور و مضبوط قلعے اوندچھ (یا اڑچھا) دھامونی اور جھانسی جبراً فتح کر لئے اور بندیل کھنڈ کے گھنے جنگلوں کا جہاں جھجار بھاگ بھاگ کر چھپ رہتا تھا، گوشہ گوشہ چھان مارا مجبوراً باغیوں کو گونڈوانے کے علاقے میں فرار ہونا پڑا اور وہیں وہ اپنے قدیم دشمن گونڈوں کے ہاتھ سے مارے گئے، ریاست "دیوی سنگھ بندیلہ" کو بخش دی گئی جس کا خاندان بیر سنگھ سے پہلے یہاں کا اصلی فرماں روا تھا۔

(۲) خان جہاں لودھی

اس اثنا میں خان جہاں لودھی کی بغاوت میں نئی نئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ لیکن طاقتور سلطنتوں کے حق میں ہر نئی دشواری کا حل ازدیاد قوت کا سبب ہو جاتا ہے۔ اس بغاوت کے فرو کرنے میں بھی مغلوں کو ریاستہائے دکن پر اپنے پنجے جمانے کا مغتنم موقع مل گیا اور در اصل یہی گہری اغراض مد نظر تھیں کہ خود بادشاہ نے آگرے سے خاندیس کا سفر کیا اور دو ڈھائی سال تک (۱۰۳۹ھ / ۱۶۳۰ء تا ۱۰۴۱ھ / ۱۶۳۲ء) انھی علاقوں میں مقیم رہے یہاں تک کہ "چوں" "پیرائے" کا فرماجرائے امر عیال و نہب اموال بہ سزائے اعمال نکوہیدہ رسید۔ و "بے نظام" نیز بہ کیفر حمایت و رعایت او دست زد حوادث و پامال نوائب گشت و ملک بیجاپور کہ اصلا تاخت سرحدش در عہد عرش آشیانی (اکبر) و حضرت جنت مکانی (جہانگیر) ...... دست بہم نداده ـ چہ جائے آنکہ آں ملک بہ ورود لشکر شاہی پے سپر گردید و تورس پور کہ درحوالی بیجاپور راست دار الملک دعاکم نشین، با توابع و مضافات

---

[۱] بادشاہ نامہ جلد اول۔ ۲۴۴ و ۲۶۴ تا ۲۶۹ خافی خاں جلد اول ۴۰۶ و ۴۰۹ نیز دیکھو مآثر الامرا جلد دوم حالات "جھجار سنگھ بندیلہ"۔

باب۲

خراب شد .... نہضت رایاتِ جہاں کشا بہ صوبہ دار الخلافت اکبر آباد مقرر شد"[۱]

واضح رہے کہ خان جہاں کا اصلی نام **پیر خاں** (پسر دولت خاں) تھا جسے مورخ نے ازراہ حقارت "پیرا" لکھا ہے۔ حالانکہ ایک زمانہ تھا جب کہ یہی "پیرا" جہانگیر کا سب سے معزز و محترم درباری سمجھا جاتا تھا اور بادشاہ اسے ہاتھ سے سہارا دے کر گھوڑے پر سوار کرتے تھے[۲] عہد جہانگیری میں وہ بڑے بڑے عہدوں پر مامور ہوتا رہا اور اس کے انتقال کے وقت بھی خاندیس و دکن کا صوبہ دار تھا۔ بادشاہ کی وفات اور داور بخش کی تخت نشینی کی اطلاع سن کر وہ یا اس کے مشیر سخت غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے اور شاہجہاں کی بادشاہی تسلیم کرنے میں تامل کرنے لگے اور گو بعد میں خانجہاں نے معافی مانگ لی اور اس کے اعزاز و اکرام میں کوئی ظاہری فرق نہ آیا تاہم دلوں میں کسی قدر کدورت باقی تھی اور اسی نے آخر کار خانجہاں کو رفتہ رفتہ اس قدر بدگمان کیا کہ وہ بادشاہ کی بغیر اجازت اپنی جمعیت کو لے کر آگرے سے چل دیا۔ بادشاہی فوجوں نے اسے دھول پور سے کچھ آگے بڑھ کر جا لیا تھا لیکن وہ لڑ بھڑ کر چنبل کو عبور کر گیا اور بندھیل کھنڈ اور گونڈوانہ کے غیر معروف راستوں سے نکل کر دولت آباد آ پہنچا (۱۰۳۹ھ / ۱۶۳۰ء) جہاں مرتضیٰ نظام شاہ نے بڑے تپاک و اعزاز کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا اور اس کے مصارف کے واسطے بیڑ کا پرگنہ عطا کیا کہ اطمینان سے وہاں رہ کر فوجی جمعیت فراہم کرے۔ کیونکہ خان جہاں لودھی درحقیقت ہندی اور سرحدی افغانوں کا مسلمہ سرگروہ تھا اور دکن میں اس کے پہنچنے کی خبر سنتے ہی بہت سے روہیلے یا افغان سپاہی جوق جوق اس کے گرد جمع ہو رہے تھے اور یہ منصوبے دلوں سے نکل کر زبانوں پر آنے لگے تھے کہ خانجہاں کو علانیہ بادشاہی کا اعلان کر کے شیر شاہ سوری کی مثل پھر ایک مرتبہ

---

[۱] بادشاہ نامہ دفتر اول صفحہ ۲۲۴۔ عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ جب خان جہاں لودھی کو اپنے اعمال کی سزا مل چکی اور والی دولت آباد بھی اس کی مدد کے جرم میں کافی سزا بھگت چکا' تو لشکر شاہی نے ملک بیجاپور پر یورش کی اور خاص پائے تخت کے قریب تک کا علاقہ پامال کر ڈالا حالانکہ اکبر و جہاں گیر کے عہد میں مغلوں کو کبھی یہاں تک بڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ پھر اس کارنمایاں کے انجام پانے کے بعد بادشاہ نے شمالی ہند کو مراجعت کی

[۲] مآثر الامرا جلد اول ۷۱۰۔ ہمعصر تواریخ میں جستہ جستہ خان جہاں لودی کے حالات تحریر ہیں۔ صاحب مآثر الامرا نے انھیں نہایت خوبی سے جمع کر دیا ہے۔

باب ۳

مغلوں سے شمشیر آزمائی کرنی چاہئے!

شاہجہاں کی فتوحات دکن

غرض پہلی مرتبہ شاہجہاں کے برہانپور آنے کا اصلی مدعا اسی شورش و بغاوت کا استیصال کرنا تھا لیکن اسی ضمن میں مغلوں نے نظام شاہی ریاست کے رہے سہے اضلاع پامال کر ڈالے اور پہلی دفعہ بیجاپور کے علاقوں میں بھی دور تک گھس گئے؛ خان جہاں لودھی تو چند شکستیں کھا کر دکن سے نکل گیا تھا اور آخر کار کئی جگہ کشت و خون کے بعد کالنجر کے قریب مارا گیا اور اس کی جمعیت منتشر ہوگئی (۱۰۴۰ھ / ۱۶۳۱ء) لیکن انہی لڑائیوں کے سلسلے میں بالاگھاٹ[1] پر مغلوں کا مستقل قبضہ ہوگیا اور جا بجا ان کی سرحدیں گولکنڈہ و بیجاپور کے سرحدی اضلاع سے جا ملیں جو آیندہ جنگ و آویزش کی لازمی تمہید تھی۔

نظام شاہی حکومت کے قبضے میں اب صرف دولت آباد، جنیر اور ناسک کے چند اضلاع رہ گئے تھے اور ان کے قلعوں پر بھی جا بجا مغل سپہ سالاروں کی فوجیں حملہ کر رہی تھیں؛ ادھر ملک عنبر کی وفات (۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۶ء) سے یہاں کے امرا کا وہ اتحاد بھی مفقود ہوگیا جس نے ریاست کی عمارت کو گرتے گرتے چند روز کے لئے سنبھال لیا تھا اور خود اس کے بیٹے فتح خاں اور مرتضیٰ نظام شاہ میں سخت عداوت پیدا ہوگئی۔ اس گروہ بندی نے بعض نظام شاہی سرداروں کو اور بھی آمادہ کر دیا کہ وہ جا کر مغل صوبہ داروں سے مل گئے اور انہی میں مرہٹہ فوج کا ذی اثر سردار جادو رائے بھی تھا جسے بعد میں مرتضیٰ نظام شاہ نے اسی بے وفائی کے جرم پر دھوکے سے دولت آباد بلا کر قتل کرا دیا۔

نظام شاہی کا خاتمہ

لیکن اس خاندان شاہی کے خاتمے کا زمانہ بھی قریب آگیا تھا۔ رہے سہے اضلاع اور قلعوں پر مغل فوجیں جا بجا حملے کر رہی تھیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اہل بیجاپور بھی مغلوں سے متحد ہونے پر آمادہ تھے کہ سلطنت نظام شاہی کی آخری تقسیم کے وقت حصہ بٹائیں؛ مگر جب ان پریشانیوں میں مرتضیٰ نظام شاہ نے فتح خاں کو قید سے رہائی دی تو اس نے موقع پا کر اس بادشاہ اور اس کے رفیقوں کو قتل کر دیا اور خود ہی مغلوں کی اطاعت قبول کر لی! (۱۰۴۰ھ / ۱۶۳۱ء)

---

[1] آج کل ناگپور کے شمال و مشرق میں سرکار انگریزی کا بھی ایک ضلع "بالاگھاٹ" کہلاتا ہے لیکن اس جگہ بالاگھاٹ سے وہ علاقہ مراد ہے جو برار کے جنوب اور دولت آباد کے مشرق میں پان گنگا سے گوداوری تک پھیلا ہوا تھا، اور بعد میں اسی کو کچھ عرصے کے واسطے صوبۂ "تلنگانہ" میں ضم کر دیا گیا تھا۔

رسمی طور پر اب (دولت آباد کی) نظام شاہی حکومت سے مغلوں کی لڑائی ختم ہوگئی۔ اور وہ لڑکا جسے مرتضیٰ نظام شاہ کے بعد فتح خاں نے برائے نام بادشاہ بنایا تھا سلطنت مغلیہ کا باجگزار ہوگیا۔ لیکن بعض سرکش قلعہ داروں کے علاوہ جو بطور خود مغلوں کا مقابلہ کر رہے تھے اس موقع پر جادو رائے مقتول کے داماد ساہوجی بھونسلہ نے ایک نیا منصوبہ سوچا اور بچانے کی کوشش میں رہی سہی نظام شاہی حکومت کا خاتمہ کرادیا۔ واضح رہے کہ اپنے خسر جادو رائے کے قتل کے بعد وہ مغلوں سے آملا تھا اور اس کے ساتھ اسی رعایت و عزت کا سلوک مرعی رکھا گیا تھا لیکن جب خود فتح خاں نے اطاعت قبول کرلی تو اس کے مقابلے میں ساہوجی اور نیز دیگر امرائے نظام شاہی جو مغلوں سے آملے تھے ماند پڑ گئے اور اسی ناقدری سے بگڑ کر ساہو نے دربار بیجاپور کے ساتھ یہ سازش کی کہ خاندان نظام شاہی کے ایک اور شہزادے کی بادشاہی کا اعلان کردیا اور بیجاپوری فوج کے ساتھ مل کر خاص دولت آباد پر حملہ کیا کہ فتح خاں اور اس کے نامبردہ بادشاہ کو نکال کر خود پائے تخت پر قابض ہوجائے۔

فتح خاں نے مغلوں سے مدد مانگی اور ان کی فوجوں نے دولت آباد کے سامنے بیجاپوری افواج کو شکست دے کر پیچھے ہٹادیا۔ لیکن ابھی جنگ کا کوئی قطعی فیصلہ نہ ہوا تھا کہ فتح خاں اہل بیجاپور سے مل گیا اور یکایک عقب سے خود اپنے اتحادیوں پر حملہ آور ہوا جو اسی کو بچانے آئے تھے۔ بایں ہمہ مغل سپاہیوں کی جوانمردی اور سپہ سالار مہابت خاں کی کاروانی کی بدولت اس ناگہانی حملے میں بھی اہل دکن کو شکست ہوئی اور اب اودھر ایک مغل فوج تو بیجاپوریوں کے تعاقب میں روانہ کی گئی اور دوسری نے قلعۂ دولت آباد کا محاصرہ کرلیا۔

بیجاپور و گولکنڈہ کی باجگزاری

سامان جنگ و رسد کی کمی سے مجبور ہوکر آخرکار فتح خاں نے ہتیار ڈال دئے۔ نظام شاہیوں کا یہ دوسرا پائے تخت فتح ہوگیا (ذوحجہ ۱۰۴۲ھ / ۱۶۳۳ء) اور اس کا آخری وارث حسین نظام شاہ بھی بہادر نظام شاہ کی طرح (صفحہ ۱۵۲) گوالیار بھیج دیا گیا۔

اب قدیم سلطنت احمدنگر کا خاتمہ ہوجانے میں بظاہر کوئی کسر نہ رہی تھی لیکن اول تو اس کا ایک مشہور سرحدی قلعۂ پرینڈہ تسخیر نہیں ہوا تھا جو سینا ندی پر (آج کل عثمان آباد کے ضلع میں) واقع ہے۔ دوسرے ساہوجی اس لڑکے سمیت جس کی بادشاہی کا اس نے اعلان کیا تھا بچ کر نکل گیا اور اہل بیجاپور کی مدد سے کوکن کے کہستانی علاقے میں فتنہ و فساد مچا رہا تھا۔ پھر یہ کہ جب بادشاہ کے منجھلے بیٹے شہزادہ شجاع (ولادت ۱۰۲۵ھ / ۱۶۱۶ء) کو پہلی مرتبہ

منصب دوہزاری اور دکن کی صوبہ داری عطا ہوئی تو وہ ایک سال تک یہاں کا انتظام نہ سنبھال سکا اور تسخیر پرینڈہ کی کوشش میں بھی مغلوں کو ناکامی ہوئی (ہم ۱۰۴۲ھ / ۱۶۳۲ء) بادشاہ نے منغض ہوکر اسے واپس بلالیا اور سال آیندہ خود بدولت دکن کی طرف روانہ ہوئے (۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۵ء) راستے میں مالوے ہی سے دو سفیر بیجاپور اور گولکنڈہ بھیج دیئے گئے تھے جن میں قبول اطاعت و باجگزاری کا مطالبہ تھا۔ بیجاپور کی عادل شاہی حکومت اکبری کے زمانے میں پیش کش اور اطاعت گزاری کا اقرار کرچکی تھی لیکن قابل ذکر یہ بات ہے کہ گو اس حکومت نے پچھلی لڑائیوں میں اکثر مغلوں کے خلاف حصہ لیا نیز اپنی سرحد سے متصل بعض نظام شاہی قلعوں پر بھی متصرف ہوگئی تھی، بایں ہمہ وہاں کے بادشاہ محمد عادل شاہ کے نام جو فرمان بھیجا گیا وہ اتنا تہدید آمیز نہ تھا جتنا عبداللہ قطب شاہ کے نام کا مراسلہ[1] حالانکہ ریاست گولکنڈہ

---

[1] ان فرامین کے نقول ملاحظہ ہوں بادشاہ نامہ دفتر دوم صفحات ۱۲۶ تا ۱۳۳ نیز ان کا خلاصہ منتخب اللباب خافی خاں جلد اول صفحات ۴۸۶ تا ۴۹۱۔ خافی خاں لکھتا ہے اور بادشاہ نامے کے بعض اقوال سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، کہ جو سفیر بیجاپور بھیجا گیا اسے بادشاہ نے بتاکید سمجھا دیا تھا کہ بالمشافہ گفتگو میں شاہ بیجاپور کو اچھی طرح تہدید و تنبیہ کرے۔ بایں ہمہ راقم الحروف کے نزدیک بیجاپور کے ساتھ رعایت و نرمی کی اصلی وجہ بالکل دوسری تھی جسے یہ مورخ اپنی بے پروائی یا سادہ لوحی کے باعث نہیں سمجھے یا بیان نہیں کرتے۔ اور وہ یہ کہ ان دنوں بیجاپور کی فوجی قوت گولکنڈہ سے کہیں زیادہ تھی کیونکہ اول تو حکومت نظام شاہی کے اکثر سردار و سپاہی جن میں ساہوجی کی مرہٹہ فوج بھی داخل ہے اس ریاست کے مٹنے کے بعد بیجاپور کی سرکار میں چلے آئے تھے اور آئے دن کی لڑائیوں نے بیجاپوری کی افواج کو مغلوں کا مقابلہ کرنے میں بھی خاصہ دلیر و مشتاق بنا دیا تھا، دوسرے فرنگی تاجروں کے ذریعے دربار بیجاپور کو مغربی سواحل ہند سے جنگی ساز و سامان فراہم کرنا بھی آسان ہوگیا تھا۔
اس تصریح کی زیادہ ضرورت اسے لئے ہوئی کہ ان فارسی تواریخ کی ناقص تحریروں نے انگریزی تاریخ نویسوں کو بھی مغالطے میں ڈال دیا اور وہ شاہجہاں کی بیجاپور کے ساتھ رعایت اور گولکنڈہ کی اطاعت گزاری کے اصلی سبب کو نہ سمجھ کر عجیب عجیب تاویلیں بلکہ "اختراعات" کرنے لگے (مثلاً دیکھو گرانڈ ڈف کی "تاریخ مرہٹہ" جلد اول صفحہ ۹۰۔ یا بوجادوناتھ سرکار کی "تاریخ اورنگ زیب" صفحہ ۳۶ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ "محققین" نہ صرف صورت واقعات کو نہیں سمجھے بلکہ کمال دلیری سے محض اپنی

اب تک، دوستانہ نامہ و پیام اور تحف و ہدایا بھیجنے کے سوا مغل شہنشاہوں کے زیر اثر نہ آئی تھی اور اگر یہ مان لیا جائے کہ وہاں پر علانیہ "تبرا" کہا جانا یا خطبوں میں شاہ ایران کا نام لیا جانا شاہجہاں کو ناگوار تھا اور "مؤید و مروج مذہب سنت و جماعت" کی حیثیت سے وہ ان رسوم کو محو کرانا چاہتا تھا تو بھی آخر میں یہ مطالبہ کہ آئندہ خطبوں میں مغل بادشاہ کا نام لیا جائے اور سالانہ خراج کی ایک مقررہ رقم ادا کی جایا کرے محض ایک کمزور ہمسایہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا تھا اور نیز جس قسم کے سلسلۂ جنگ کو ختم کرنے وہ اب دکن آرہا تھا اسی قسم کے ایک نئے سلسلۂ جنگ کی تمہید تھی! بہر حال یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ شاہجہاں فن سیاسیات کا نہایت مشّاق ماہر تھا اور اس نے اپنے دکنی حریفوں کی حالت کا اس قدر صحیح اندازہ کیا تھا کہ آئندہ اس کی ہر جنگی اور سیاسی چال ٹھیک اور کارگر پڑی، عبداللہ قطب شاہ نے تو بے لڑے بھڑے مغل شہنشاہ کے مطالبات تسلیم کر لئے اور دربار بیجاپور کے لیت و لعل کے جواب میں یکبارگی مغلوں کی فوجیں عادل شاہی علاقوں میں گھس گئیں اور پایۂ تخت بیجاپور کی نواح تک تمام ملک پامال و تاراج کر دیا، بیجاپوری دستے ہر طرف سے سمٹ کر پائے تخت میں آ گئے تھے اور یہیں قلعہ بند ہو کر لڑنے کا انھوں نے کافی انتظام کر لیا تھا لیکن شاہجہاں کو وقت کے وقت بیجاپور کی تسخیر سے غرض نہ تھی اور اس کے مغل سپہ سالاروں نے دشمن کی فوجوں کو قلعوں میں معطل کر صرف میدانی اضلاع کی تاراجی کا تہیّہ کر لیا تھا جس نے چند ہی ہفتے میں اہل بیجاپور کے حواس باختہ کر دیئے اور انھوں نے عاجزانہ مصالحت کی درخواست کی اس موقع پر شاہجہاں نے جن شرائط پر صلح کی (۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۶ء) وہ اس کی اصلی اغراض اور نیز صورت واقعات کی نہایت عمدہ شاہد ہیں:۔

(۱) نہ صرف بیجاپور کا اصلی علاقہ بحال رکھا گیا بلکہ کوکن اور قلعہ پرینڈہ کے قریبی قطعات جو تنازعہ فیہ اور پہلے نظام شاہی حکومت میں داخل تھے، ریاست بیجاپور ہی کو دے دیئے گئے اور عادل شاہ سے حلفیہ اقرار لیا گیا کہ وہ آئندہ نظام شاہی حکومت کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۳) غلط رائے کو تاریخی واقعات کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ باقی و نسنٹ اسمتھ کے متعلق تو کچھ لکھنا غالباً بیکار ہے جو ظاہرا اپنی تاریخ دانی اور بے لطف انشاپردازی کا کمال ہی یہ سمجھتا ہے کہ سلاطین اسلامی کے حق میں سخت سے سخت الفاظ استعمال کئے جائیں)۔

احیا کی کسی کوشش یا سازش میں شریک نہ ہوگا اور نہ ساہو جی یا دیگر نظام شاہی امرا کی (مغلوں کے خلاف) کوئی مدد کرے گا۔

(۲) مقررہ خراج کی باقیات جو پچاس لاکھ روپے کے قریب نکلتی تھیں، ادا کرنے کے بعد آیندہ ریاست بیجاپور چار لاکھ کے بجائے صرف دو لاکھ ہون (یعنی تقریباً آٹھ لاکھ روپیہ) سالانہ بطریق پیشکش ادا کرتی رہے گی[1]۔

(۳) بیجاپور میں خطبہ اور سکہ شاہجہاں کے نام کا جاری کر دیا جائے گا۔

اس معاہدے سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مدبر کشور کشا اول صرف نظام شاہی حکومت کو اطمینان و استقلال کے ساتھ سلطنت مغلیہ میں جذب کرنا چاہتا ہے اس نے از خود چند سرحدی اور کوہستانی اضلاع دربار بیجاپور کے حوالے کر دئیے ہیں تاکہ وہاں کے حکمراں یا وہ امرائے نظام شاہی جو دولت آباد سے نکل نکل کر بیجاپور پہنچ گئے تھے، خوشی سے اس علاقے پر اکتفا کریں اور احمد نگر کی حکومت رفتہ کو دوبارہ زندہ کرنے کا خیال بھی انھیں نہ آئے۔ اسی کے ساتھ

[1] بابو جادو ناتھ سرکار لکھتے ہیں (تاریخ اورنگ زیب" جلد اول صفحہ ۳۹ و ۲۵۳ جہاں باب نہم کو اسی غلط بنیاد پر شروع کیا ہے) کہ اس معاہدے کی چوتھی شرط یہ تھی کہ عادل شاہ امن کے معاوضے میں بیس لاکھ روپیہ (نقدا ور بصورت اجناس) شہنشاہ کی نذر کرے لیکن اس پر" کوئی سالانہ خراج عائد نہیں کیا گیا تھا" اس آخری فقرے پر انھوں نے خاص طور سے زور دیا ہے اور لطیفہ یہ ہے کہ بادشاہنامہ اور خافی خاں کی تاریخ کے انھی صفحات کا حوالہ دیتے ہیں جن کی اصلی عبارت (از جانب شاہجہاں) یہ ہے کہ قریب پنجاہ لک روپیہ پیشکش کہ بعد از جلوس اقدس مقرر فرمودہ بودیم ارسال داشت، داین معنی مقتضی آں بود کہ آں قطب فلک ایالت رارعایتے فرمائیم۔ بنابریں مقرر فرمودیم کہ از جملہ چہار لک ہون کہ ہر سال حسب الحکم الاشرف بہ نظام الملک میداد، دو لک ہون راہر سال بہ سرکار خاصہ شریفہ واصل سازو و دو لک ہون دیگر بہ آں قطب فلک شوکت معاف باشد" (بادشاہ نامہ جلد اول دفتر دوم صفحہ ۱۷۱ سطر ۷ تا ۱۳) یہی جملہ بجنسہ خافی خاں کے ہاں موجود ہے (منتخب اللباب جلد اول صفحہ ۵۳۳ سطر ۹ تا ۱۱) پھر خافی خاں نے جہاں عادل شاہ کا خط بادشاہ کے نام نقل کیا ہے وہاں بھی وہ منجملہ دیگر شرائط کے "دو لک ہون" (یا ہشت لک روپیہ) سالانہ پیشکش کی شرط تسلیم کرتا ہے (صفحہ ۵۳۶) اب سمجھ میں نہیں آتا کہ سرکار صاحب کے مذکورۂ بالا "نتیجۂ تحقیقات" کو "غلطی (۹)" کی کونسی قسم قرار دیا جائے۔

اس نے خود بیجاپور میں اپنی مداخلت بلکہ آئندہ اس کے الحاق کا راستہ تیار کرلیا ہے کہ جب نئی فتوحات دولت آباد وغیرہ کا نظم و نسق درست ہو جائے تو فرصت سے مغلیہ فوجیں سیتنا اور بھیانڈیوں کی طرف بڑھائی جائیں ؛

مذکورۂ بالا معاہدے کی تکمیل و توثیق کے بعد شاہجہاں نے "دکن" کو چار صوبوں میں تقسیم کردیا: خاندیس، برار، تلنگانہ اور دولت آباد جس میں مغربی گھاٹ یا سواحل ہند کے پہاڑوں تک، احمد نگر کے تمام مغربی اضلاع شامل تھے۔ پھر ان چاروں کی حکومت، امن و انتظام کی بحالی نیز ساہوجی اور بعض دیگر سرکشوں کی سرکوبی کی خدمت شہزادہ اورنگ زیب کے سپرد کرکے خود شمالی ہند کو مراجعت کی (صفر ۱۰۴۶ھ / ۱۶۳۶ء) کیونکہ پچھلے چند سال کی لڑائیوں نے شمالی دکن میں اس درجہ انتشار و بدنظمی اور زرعی پیداوار میں کمی پیدا کردی تھی کہ بادشاہی لشکر کے واسطے رسد فراہم کرنا غریب لوگوں پر بار ہو گیا تھا ؛

تیسری فصل :۔ اورنگ زیب (ا) عہد شہزادگی[۱]

گزشتہ جنگ و جدال کے بیان میں ضمناً حکومت دکن کی ان دشواریوں کا اندازہ ہوتا ہے جن سے بڑے بڑے نامی امرائے مغل اور خود بادشاہ کا منجھلا فرزند شہزادہ محمد شجاع عہدہ برآنہ ہو سکا تھا۔ لیکن اب جس شہزادے کو یہ اہم خدمت سپرد کی گئی اس کے نصیب میں آئندہ ہندوستان کا سب سے جلیل القدر شہنشاہ ہونا تحریر تھا اور گویا اسی لئے قدرت نے نوجوانی سے اس کی ذات میں وہ صفات اور قابلیتیں جمع کردی تھیں جو بظاہر ذاتی محنت واکتساب سے حاصل نہیں ہو سکتیں چنانچہ یہاں خاص طور پر یاد دلانے کے لائق بات یہ ہے کہ اٹھارہ برس کی عمر سے جب کہ وہ صوبہ دار دکن کی حیثیت سے پہلی مرتبہ ملکداری کے میدان میں داخل ہوا، اس کی شہرت و ناموری ہندوستان کے ہر کہہ و مہہ سے بڑھ گئی اور عہد شاہجہانی کے سب سے اہم سیاسی واقعات اور جنگی فتوحات کا باقی حال،

---

[۱] ولادت ۱۵ ذوقعدہ ۱۰۲۷ھ / ۱۶۱۸ء

باب ۳

تین چوتھائی سے زیادہ شہزادہ اورنگ زیب کے کارناموں کی داستان ہے ۔

پہلی صوبہ داری

بادشاہ کے دکن سے واپس جانے کے بعد سلطنت نظام شاہی کی فتح و الحاق کی تکمیل میں جو کسر باقی رہ گئی تھی، وہ اسی شہزادے نے پوری کی۔ اور تسخیر اودگیر کے علاوہ دکن کا شمال مشرقی علاقہ جو معاہدے کی رو سے مغلوں کے حصے میں آیا تھا، اسی کی صوبہ داری میں سرکشوں سے پاک ہوا۔ انھی پہاڑی علاقوں اور قلعوں میں بھاگتے بھاگتے ساہوجی نے آخر کار ہتھیار ڈال دئیے اور چند قلعے جو اب تک اس کے قبضے میں تھے، نیز نظام شاہی خاندان کا وہ لڑکا جسے وہ اب تک بادشاہ بنائے ہوئے تھا، مغلوں کے حوالے کر دیئے۔ اس کے معاوضے میں مغلوں نے اسے بیجاپور میں ملازمت کرنے کی اجازت دے دی ۔

اس کے دو سال بعد اورنگ زیب نے بگلانہ کے اضلاع کا ممالک محروسہ میں اضافہ کیا (۱۰۴۸ھ / ۱۶۳۸ء) خاندیس و سورت کے درمیان کا یہ وہ پہاڑی قطعہ ہے جس کے قلعوں کی سنگینی اور دشوار گزاری مشہور تھی اور جس پر اکبر کی فوجیں بھی خاطر خواہ تصرف نہ حاصل کر سکی تھیں۔ اورنگ زیب کی حسن سعی اور اس کے سپاہیوں کی نمایاں جوانمردی سے یہ علاقہ چند مہینے کی جدوجہد کے بعد مستقل طور پر مغلوں کے قبضے میں آگیا اور اسی کارنمایاں کے صلے میں شہزادے کو پانزدہ ہزاری (نہ ہزار سوار) کے منصب پر ترقی دی گئی ۔

بڑے بھائی کا حسد

اس جنگی کامیابی، نیز ممالک دکن میں (جنھیں شاہجہاں نے سخت بدنظمی اور ابتری کی حالت میں چھوڑا تھا) اورنگ زیب کے حسن انتظام کی شہرت عام نے پہلی مرتبہ اس حسد کو نمایاں کیا جس نے اس کے بڑے بھائی دارا شکوہ (ولادت ۱۰۲۴ھ / ۱۶۱۵ء) کو غالباً لڑکپن سے اورنگ زیب کا مخالف کر دیا تھا۔ یہ شہزادہ علمی اور اخلاقی یا سپاہیانہ اور انتظامی قابلیت کے اعتبار سے اپنے سنجھلے بھائی سے کوئی مناسبت نہ رکھتا تھا لیکن باپ کی مفرط محبت اور اہل غرض کی خوشامد نے اسے نہایت مغرور و خود پسند بنا دیا تھا۔ لہٰذا شہزادہ اورنگ زیب کی واجبی مدح و ستائش بھی اسے ناگوار گزرتی تھی۔ ایسے شاہی خاندان میں جو وراثت سلطنت کے معاملے میں کسی مسلّم اصول و قانون کا پابند نہ ہو، افراد خاندان کی باہمی رقابت و دشمنی کوئی حیرت کی بات نہیں ہے لیکن یہاں ہمیں خاص طور پر یہ جتانا منظور ہے کہ شاہ جہاں کی اولاد میں اس رقابت و دشمنی کی ابتدا دارا شکوہ

۱؎ فتح کی تفصیل کے لئے دیکھو بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۱۰۵ الخ۔ نیز دیکھو گزیٹیر جلد ششم صفحہ ۱۹۱ ۔

باب ۳

کی جانب سے ہوئی جو ولی عہدی کا مدعی اور آئندہ تخت نشینی کا امیدوار تھا۔ بالخصوص اورنگ زیب کے معاملے میں تمام تاریخی قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ دارا شکوہ اس کی تذلیل و آزار رسانی کے درپے تھا اور غالباً یہی وقت ہے جب سے اورنگ زیب نے اسے "برادر نامہربان" سمجھنا شروع کیا۔

اورنگ زیب کے بعض خصائل

اس عہد کی فارسی تاریخیں پڑھنے والوں سے یہ امر بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ ہمعصر مورخ بالعموم اورنگ زیب سے ناراض و بدگمان ہیں۔ بایں ہمہ اس کی شہزادگی (یعنی جوانی کے پرجوش زمانے) میں ہمیں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جس سے ثابت ہو کہ اورنگ زیب نے محض بھائی کی عداوت کے جواب میں یا مدافعت ہی کے عذر پر دارا شکوہ کے خلاف کوئی دشمنی یا سازش کی۔ بے شبہہ شاہی دربار و محل سرا میں اس کا موقع بھی کم تھا۔ لیکن اس سے قطع نظر، ایسی عداوت خود اورنگ زیب کے اس حلم و انکسار نیز اطاعت گزاری و سعادت مندی کے خلاف تھی، جن کی مثالوں سے ہمعصر تواریخ اور عالمگیری خطوط کے اوراق معمور ہیں۔ انھی رقعات کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ہم پہلی مرتبہ ایک ایسے مغل شہریار سے دوچار ہوئے ہیں جس کی عادات و افکار بلکہ رگ و پے میں اسلامی تعلیم سرایت کر گئی تھی۔

گوشہ نشینی کا ارادہ

اسی مذہبی میلان اور ذوق عبادت کا نتیجہ تھا کہ اورنگ زیب نے زیر نظر زمانے میں بھائی کی دراندازی سے تنگ آ کر گوشہ گیری کا ارادہ کر لیا وہ بخوبی سمجھ گیا تھا کہ اگر اپنے منصب اور عہدے پر فائز رہ کر وہ اسی طرح تن دہی سے بادشاہ کی خدمت انجام دیئے جائیگا تو اس کے بھائی کی آتش رشک و حسد برابر ترقی کرتی رہے گی اور آئندہ جنگ و تنازع کے سوا اس کا کوئی اچھا انجام نہ ہوگا۔ لہذا ان مخمصات سے بچنے کی خاطر اس نے ان دنوں جب کہ وہ بیمار بہن کی عیادت کے لئے آگرے آیا ہوا تھا سرکاری عہدے سے استعفا دیدیا۔ (۱۰۵۴ھ / ۱۶۴۴ء)۔

واضح رہے کہ اس ارادۂ خلوت نشینی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ عداوت و حسد کا بے گناہ شکار ہونے کے علاوہ، اورنگ زیب کو اپنے بڑے بھائی کے ماتحت و حاشیہ نشین رہ کر زندگی گزارنی گوارا نہ تھی۔ وہ دارا شکوہ کو مذہباً ملحد اور اخلاقاً سفلہ پرور و بدخو جانتا تھا اور اس دلی بیزاری کو ظاہری محبت و خوشامد کی صورت میں بدل دینا اس کے مزاج و طینت کے خلاف تھا۔ نظر بریں اپنے ذی اثر بھائی کی دشمنی سے محفوظ رہنے کی بہترین تدبیر یہی تھی کہ معاملات سلطنت سے دست کشی کر لی جائے اور باقی ماندہ زندگی ہندخواہ بیرون ہند میں

درویشانہ طریق پر بسر کی جائے جس کا شوق اورنگ زیب کو تمام عمر دامن گیر رہا۔
لیکن اس طرح منصب سے کنارہ کش ہونے میں خود شاہجہاں کی بیجا طرفداری کی شکایت مضمر تھی اور قرینہ کہتا ہے کہ اس بدگمانی کی بنا پر وہ اورنگ زیب کے استعفے سے ناخوش ہوا۔ مگر یہ چند روز کی بات تھی۔ محبت پدری اور شاہی جوہر شناسی نے بہت جلد رنجیدہ شہزادے کو منالیا اور اسے پھر بادشاہ کے اصرار سے گجرات کی صوبہ داری پر احمد آباد جانا پڑا (ذوحجہ ۱۰۵۵ھ ۱۶۴۶ء)۔

ع۱۔ استعفے کے واقعے کا شاہی تاریخ نویسوں نے مختصر طور پر ذکر کیا ہے (بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۳۷۶) اور اسی کے قول کو خافی خاں نے تا سمجھی سے الفاظ بدل کر اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے (جلد اول صفحہ ۶۰۰) لیکن بعض دیگر شہادتوں کے علاوہ اس واقعے کی سب سے اچھی شہادت اس خط میں محفوظ ہے جو اورنگ زیب نے دوسری مرتبہ کی صوبہ داری کے زمانے میں دکن سے اپنی بہن جہاں آرا بیگم کے نام ارسال کیا تھا۔ خط کی تاریخی صحت و اصلیت میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں اور ہم ذیل میں اس کا ضروری حصہ بجنسہ نقل کرتے ہیں تاکہ داراشکوہ کی زیادتی اور شاہجہاں کی بیجا ناانصافی کا جو اورنگ زیب کے ساتھ روا رکھی جاتی تھی، صحیح اندازہ ہو جائے:۔

خیر اندیش آنحضرت بعد اظہار اشتیاق معروض می دارد کہ بر خاطر عطوفت مآثر پوشیدہ نہ خواہد بود کہ اعلحضرت از غایت عنایت ایں مرید فدوی را بہ منصب امتیاز بخشیدہ اند بہر خدمتے کہ از پیشگاہ خلافت مامور شدہ بقدر امکان و استقلال آں را بہ تقدیم رسانیدہ بہ ہیچ باب کوتاہی نہ نمودہ و اطاعت و بندگی پیر و مرشد حقیقی را سعادت خویش دانستہ در جمیع کار با نظر بر استرضائے خاطر مقدس داشتہ الی داند کہ دریں وقت چہ تقصیر و خطا ازیں مرید سر زدہ کہ امورے کہ موجب خفت و عدم اعتبارش دور و نزدیک ست، بظہور می رسد۔ اول مقدمہ قلعۂ اسیر...... زہے خسارت و ندامت و کم طالعی ایں مرید کہ و باوجود آنکہ مدت بست سال صرف خدمت و بندگی نمودہ در طریق عقیدت بجان و مال مضایقہ نہ کردہ، ہنوز برابر برادر زادہ سہل (؟) ہم سامان اعتماد نیست...... مشفقہ من اگر چہ ایں فدوی ہرگز خود را داخل مریداں و بندہا نہ شمردہ بجز غلامی دعوی نہ دارد و بہر وضعی کہ دارند خورسند ست۔ لیکن از آنجا کہ از دولت اعلحضرت عمرے بہ عزت و ناموس گزرانیدہ و در ہمیں ولایت مدتے بہ استقلال بسر بردہ در نیولا نیز پیر و مرشد حقیقی بے خواہش و اظہار ایں مرید محض بفضل، ایالت ایں مملکت را بہ ایں اخلاص آئین مرحمت فرمودہ اند و ظہور ایں

گجرات میں اس نے جس مستعدی اور قابلیت سے فوجی اور ملکی انتظامات کئے
ان کی تاریخی کتابوں میں جابجا شہادتیں ملتی ہیں۔ اسی کے صلے میں بار بار اظہار خوشنودی
اور گراں قدر تحائف کے علاوہ بادشاہ نے ڈیڑھ سال بعد اس کے منصب وفوج میں
نمایاں اضافہ کیا اور جب اسی زمانے میں شاہی افواج سے اہل بلخ کی شدید جنگ کی
ابتدا ہونے لگی تو ان کی سپہ سالاری کے دشوار و اہم کام کا اورنگ زیب کے سوا اور کوئی
اہل نظر نہ آیا۔

بلخ و بدخشاں کی مہم

واضح رہے کہ یہ مہم نذر محمد خاں شاہ بخارا کی مدد کے بہانے سے بھیجی گئی تھی
جس نے اپنی خانہ جنگی میں شکست کھا کر مجبوراً شاہ جہاں کی اطاعت کا اقرار کر لیا تھا لیکن
اس کی تہ میں اپنے قدیم دشمن ازبکوں سے امیر تیمور و بابر کا ترکہ واپس چھیننے کا شوق مضمر تھا
اور شہزادۂ مراد بخش کو پچاس ہزار فوج کے ساتھ بھیجنے کے معنی ہی یہ تھے کہ ہندوستان کا
مغل شہنشاہ ہندوکش کے پار سیحوں کی جنوبی وادی پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتا ہے، چنانچہ
ان فوجوں کے شہر بلخ میں داخل ہوتے ہی غالباً نذر محمد خاں کو اپنی غلطی نظر آ گئی اور وہ
چھپکر فرار ہو گیا اور ادھر ہندوکش سے بحر خزر تک ازبک جنگ آزما کمانیں سنبھال کر
اٹھ کھڑے ہوئے کہ "ہندی" حملہ آوروں کو واپس ان کے ملک میں دھکیل دیں (جمادی الاول سنہ ۱۰۵۵ھ / ۱۶۴۶ء)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۰) امور خلاف مرید پروری و بندہ نوازی و سبب خفت و اہانت و عدم استقامت
حال فدویانست چوں بدیں آئین زیستن و مردن دشوار است و لطفی ندارد برائے امور فانی ناپائیدار
در رنج و آزار نمی تواں بود و خود را بدست دیگراں نمی تواں سپرد ہماں بہتر کہ بحکم اعلیحضرت کہ سرو جان مریداں
فدائے رضائے ایشان ست از تنگنائے چنیں حیات وا رہد تا مصلحت ملکی قومی شود (؟) و خاطر ہا ازیں
فکر بیاساید۔ ایں مرید پیش ازیں بدہ سال ایں معنی را دریافتہ وجود خود را مخل مطلب دانستہ استعفا
نمودہ بود و ثانی الحال محض بجہت خوشنودی پیر و مرشد حقیقی کہ اہم مقصد ایں فدوی است بہ ایں وضع تن
در دادہ کشید آنچہ کشید۔ بایستے ہماں وقت معاف می فرمودند تا گوشہ اختیار نمودہ غبار خاطر کسے نمی شد
و بایں کشمکش نمی افتاد ...... توقع کہ آں شفقہ مہربان ایں معنی را در خلوت بسامع جلال رسانیدہ ہر آنچہ
از زبان الہام بیان بشنوند اطلاع دہند ..." (آداب عالمگیری، ورق ۲۹۸ و ۲۹۹۔ بابو جادو ناتھ نے بھی
اس خط کا آداب عالمگیری کے دوسرے نسخے سے خلاصہ نقل کیا ہے (جلد اول صفحہ ۷۷، وغیرہ)

مغلوں سے شمشیر آزمائی کرنی چاہئے!

شاہجہاں کی فتوحات دکن

غرض پہلی مرتبہ شاہجہاں کے برہانپور آنے کا اصلی مدعا اسی شورش و بغاوت کا استیصال کرنا تھا لیکن اسی ضمن میں مغلوں نے نظام شاہی ریاست کے رہے سہے اضلاع پامال کر ڈالے اور پہلی دفعہ بیجاپور کے علاقوں میں بھی دور تک گھس گئے؛ خان جہاں لودھی تو چند شکستیں کھا کر دکن سے نکل گیا تھا اور آخر کار کئی جگہ کشت و خون کے بعد کالنجر کے قریب مارا گیا اور اس کی جمعیت منتشر ہوگئی (سنہ ۱۰۴۰ھ ۱۶۳۱ء) لیکن انھی لڑائیوں کے سلسلے میں بالاگھاٹ[۱] پر مغلوں کا مستقل قبضہ ہوگیا اور جا بجا ان کی سرحدیں گولکنڈہ و بیجاپور کے سرحدی اضلاع سے جا ملیں جو آیندہ جنگ و آویزش کی لازمی تمہید تھی۔

نظام شاہی حکومت کے قبضے میں اب صرف دولت آباد، جنیر اور ناسک کے چند اضلاع رہ گئے تھے اور ان کے قلعوں پر بھی جا بجا مغل سپہ سالاروں کی فوجیں حملہ کر رہی تھیں؛ ادھر ملک عنبر کی وفات (سنہ ۱۰۳۵ھ ۱۶۲۶ء) سے یہاں کے امرا کا وہ اتحاد بھی مفقود ہوگیا جس نے ریاست کی عمارت کو گرتے گرتے چند روز کے لئے سنبھال لیا تھا اور خود اس کے بیٹے فتح خاں اور مرتضیٰ نظام شاہ میں سخت عداوت پیدا ہوگئی۔ اس گروہ بندی نے بعض نظام شاہی سرداروں کو اور بھی آمادہ کر دیا کہ وہ جا کر مغل صوبہ داروں سے مل گئے اور انھی میں مرہٹہ فوج کا ذی اثر سردار جادو رائے بھی تھا جسے بعد میں مرتضیٰ نظام شاہ نے اسی بے وفائی کے جرم پر دھوکے سے دولت آباد بلا کر قتل کرا دیا۔

نظام شاہی کا خاتمہ

لیکن اس خاندان شاہی کے خاتمے کا زمانہ بھی قریب آگیا تھا۔ رہے سہے اضلاع اور قلعوں پر مغل فوجیں جا بجا حملے کر رہی تھیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اہل بیجاپور بھی مغلوں سے متحد ہونے پر آمادہ تھے کہ سلطنت نظام شاہی کی آخری تقسیم کے وقت حصہ بٹائیں؛ گر جب ان پریشانیوں میں مرتضیٰ نظام شاہ نے فتح خاں کو قید سے رہائی دی تو اس نے موقع پا کر اس بادشاہ اور اس کے رفیقوں کو قتل کر دیا اور خود ہی مغلوں کی اطاعت قبول کر لی! (سنہ ۱۰۴۰ھ ۱۶۳۱ء)

---

[۱] آج کل ناگپور کے شمال و مشرق میں سرکار انگریزی کا بھی ایک ضلع "بالاگھاٹ" کہلاتا ہے لیکن اس جگہ بالاگھاٹ سے وہ علاقہ مراد ہے جو برار کے جنوب اور دولت آباد کے مشرق میں بان گنگا سے گوداوری تک پھیلا ہوا تھا اور بعد میں اسی کو کچھ عرصے کے واسطے صوبہ "تلنگانہ" میں ضم کر دیا گیا تھا۔

کے زمانے میں اس کی اصلی خدمت ملتان و سندھ کی صوبہ داری تھی جہاں کے بعض اضلاع و قبائل پر اب تک مغلوں کا خاطر خواہ تسلط نہ ہوا تھا۔ اورنگ زیب پہلا مغل صوبہ دار ہے جس نے نہ صرف ان خرابیوں کو دفع کیا بلکہ بلوچستان اور مکران کا ساحلی علاقہ فتح کر کے پہلی مرتبہ ان حصص بعیدہ میں مغل شہنشاہ کا خطبہ و سکہ جاری کرایا اور اندرونی نظم و نسق کی درستی اور زراعت کی ترقی کے ساتھ، سواحل سندھ کی بحری تجارت کو ازسرنو چمکانے کی کوشش کی جو ایک مدت سے تنزل کر رہی تھی اور جس کی بندرگاہیں اب ایسی کس مپرسی کی حالت میں پڑی تھیں کہ وہاں جہازوں کی آمدورفت بھی دشوار ہو گئی تھی۔ اورنگ زیب نے وہاں ایک نئی بندرگاہ تعمیر کرائی اور شاہجہاں نے خوش ہو کر اس کا محصول تجارت (درآمد) معاف کر دیا کہ تاجروں کو اس راستے مال لانے کی ترغیب ہو[1]۔

قندھار کی مہمات

جنوبی افغانستان کا یہ مشہور شہر (قندھار) جسے ایرانیوں سے چھیننے کے لئے حکومت ہندوستان نے تین مرتبہ سخت کوشش و کاوش کی، اس زمانے میں وسط ایشیا کے نہایت مشہور، دولتمند شہروں میں شمار ہوتا تھا اور ہند و ایران کی تجارتی شارع پر واقع ہونے کی بدولت اس کی جنگی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ قندھار کی قیمتی پیداوار خاص کر سفید گیہوں اور سیب و انار دور دور مشہور تھے اور وہاں ندیاں کاٹ کر جو صدہا نہریں لگائی گئی تھیں انہیں دیکھ کر آج بھی یورپ والوں کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ "فن نہر کاوی میں افغانوں سے بڑھ کر دنیا بھر میں کوئی ماہر نہیں ......"[2] یہی اسباب تھے کہ ہمایوں کے زمانے سے اورنگ زیب و شاہ عالم (اول) کے عہد تک یہ شہر حکومت ایران و ہندوستان میں مابہ النزاع رہا۔ جہانگیر کے زمانے میں اس کا ہندیوں کے ہاتھ سے چھن جانا ہم پڑھ چکے ہیں۔ عہد شاہجہانی میں وہاں کے ایرانی صوبہ دار **علی مردان خاں** نے از خود اسے شہنشاہ ہندوستان کے حوالے کر دیا (۱۶۳۸ء) اور اس پر گذشتہ دس برس میں خزانۂ ہند کا لاکھوں روپیہ صرف کیا گیا تھا کہ اگر ایرانی حملہ کریں

---

[1] مذکورۂ بالا معلومات کا اصلی ماخذ آداب عالمگیری ہے (ورق ۵ و ۶) نیز دیکھو سرکار کی تاریخ اورنگ زیب جلد اول۔ باب ششم۔

[2] گزیٹیر جلد اول صفحہ ۱۲۔ نیز ملاحظہ ہو آئین اکبری جلد اول صفحہ ۵۸۲ و ۵۸۰۔

باب ۶

توجم کران کا مقابلہ کیا جائے۔ لیکن دنیا میں لڑائی کا فیصلہ مستحکم مورچوں اور سنگین بروج و فصیل پر اتنا منحصر نہیں جتنا فریقین کی جنگی قابلیت اور عزم و استقلال پر ہے۔ دوسرے ایرانیوں کے پاس آتشی اسلحہ ہندیوں سے بہتر تھے اور ترکوں سے پیہم جنگ و جدال نے انھیں توپ اندازی کے فن میں طاق کر دیا تھا۔ ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء میں انھوں نے خلاف توقع شدید سردی کے زمانے میں قندھار پر فوج کشی کی اور دو مہینے کے محاصرے کے بعد یہ سنگین قلعہ قلعہ دار کی نااہلی اور ہندی دستوں کے باہمی نفاق نیز غداری کی بدولت تسخیر ہو گیا۔

اس مرتبہ حکومت ہند نے کمک پہنچانے میں جو تساہل و تاخیر کی تھی اس کی پھر کبھی تلافی نہ ہو سکی۔ دونوں مہمیں جو اورنگ زیب کی سپہ سالاری میں بھیجی گئیں (۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء و ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۱ء) ناکام رہیں۔ ایرانیوں کی عمدہ توپوں اور مشاق توپچیوں نے ہندی فوج کو سرنگیں لگانے یا فصیل میں رخنہ کرنے کا موقع ہی نہ دیا اور شہزادے کی یہ درخواست کہ یورش کر کے قلعہ لینے کی اجازت دی جائے، شاہجہاں نے منظور نہیں کی۔ آخر مہم ناکام و نامراد واپس آئی اور دو سال بعد دارا شکوہ کی مہم کا اس سے بھی بدتر حشر ہوا۔ اس نے اور اس کے مصاحبوں نے اورنگ زیب کی ناکامی پر خوب قہقہے لگائے تھے اور اب کہیں زیادہ لشکر و ساز و سامان کے ساتھ قلعے پر فوج کشی کی اجازت لی تھی کہ جو کام بھائی سے نہ بن پڑا وہ خود کر دکھائے لیکن اس مرتبہ اتنی بھی کامیابی نہ ہوئی اور بیشتر نقصان جان و مال کے ساتھ مغل فوجیں واپس ہٹ آئیں (۱۰۶۳ھ/۱۶۵۳ء)۔

دکن کی دوسری صوبہ داری

اس اثنا میں شہزادۂ اورنگ زیب کو دوسری مرتبہ ممالک دکن کی صوبہ داری پر نامزد کر کے بھیجا گیا تھا (۱۰۶۲ھ/۱۶۵۲ء) اور محض یہ انتخاب اس بات کی نہایت عمدہ شہادت ہے کہ حکومت ہندوستان کے نزدیک کوئی امیر و شہزادہ اس سے زیادہ قابل و منتظم نہ تھا۔ کیونکہ گزشتہ آٹھ نو سال میں صوبہ داروں میں کئی بار تبدیلی کے باوجود ان جنوبی صوبوں کی اندرونی حالت اس درجے خراب ہو گئی تھی کہ مالی فائدہ درکنار، وہاں کے سرکاری مصارف ہی کے واسطے الٹا شاہی خزانے سے روپیہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ زراعت و تجارت دونوں میں

تنزل کے آثار نمایاں تھے اور مالگزاری تین کروڑ ۱/۴ ۶۲ لاکھ کی بجائے گھٹتے گھٹتے صرف ایک کروڑ روپیہ تخمینہ کی جانے لگی تھی[1] فوجوں کی حالت ایسی ابتر ہوتی جاتی تھی کہ شاہان بیجاپور و گولکنڈہ کئی سال سے مقررہ پیش کش ادا کرنے میں لیت و لعل کرنے لگے تھے بلکہ بعض اوقات ان کی جانب سے سرکشی کا اظہار ہوا تھا اور نئے صوبہ دار کے مستقر پر پہنچنے سے پہلے شاہجہاں نے اس بات کی طرف توجہ دلائی اور شاہ بیجاپور کے "کفران نعمت" کی خاص طور پر شکایت کی تھی[2]

شہزادہ اورنگ زیب کے دولت آباد پہنچتے ہی ان حالات میں ہمیں نمایاں انقلاب ہوتا نظر آتا ہے۔ اور تین سال کے اندر دکن کے شمالی صوبوں کی حالت کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے! یہاں کی مزروعہ اراضی کی پیمائش اور مختلف حیثیتوں کی تشخیص جو ملک عنبر کے عہد میں شروع ہوئی تھی اسی نے وسیع پیمانہ پر کرائی اور مرشد قلی خاں اور ملتفت خاں جیسے لائق عہدہ داروں کے مشورے سے پہلی مرتبہ وہ "مالگزاری بندوبست" رائج ہوا جو عرصۂ دراز تک دھارا مرشد قلی خاں کے نام سے مشہور تھا۔ بہت سے ویران علاقے از سر نو آباد ہوئے

---

[1] آداب عالمگیری ورق ۱۵۔ نیز دیکھو مآثر الامرا جلد سوم صفحہ ۴۹۶ و ۴۹۷۔ بابو جادو ناتھ سرکار نے بھی ان حالات اور بعد میں اورنگ زیب کی اصلاحات کے نتائج کو کافی تحقیق و تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ ("تاریخ اورنگ زیب" جلد اول باب نہم)۔

[2] آداب عالمگیری۔ ورق ۴۳۔ واضح رہے کہ ان شیعہ ریاستوں کے ساتھ حکومت مغلیہ کے معاملات کو عہد عالمگیری کے مؤرخوں نے جو خود شیعہ ہیں۔ اس طرح بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ جہاں تک ہو سکے مغلوں کی زیادتی اور ناانصافی ظاہر ہو۔ اور ان کی ذاتی آرا اور بعض غلط روایات کی بنا پر انگریزی تاریخ نویسوں نے اپنی کتابوں میں اورنگ زیب پر اس قدر اتہام و الزام وارد کئے ہیں کہ ان کی تردید و تکذیب کے لیے ضخیم سے ضخیم کتاب بھی بمشکل کافی ہو سکتی ہے ہماری تاریخ میں اتنی گنجائش نہیں کہ ان عجیب عجیب الزامات اور اعتراضات پر بحث کی جائے۔ ہم صرف عہد عالمگیری کے اہم واقعات کو صحت و تحقیق کے ساتھ اپنے طور پر بیان کریں گے اور ان اعتراضات اور غلط بیانیوں سے ہمیں قطع نظر کرنی پڑے گی۔

آبپاشی

اور تقاوی کی فیاضانہ اعانت سے بہت سے بنجر رقبے سرسبز و زرخیز بن گئے، اورنگ آباد کی آئندہ عظمت و شہرت کی بنیاد اسی زمانے میں پڑی اور یہ قصبہ (کھڑکی) جو ملک عنبر کے عہد میں اچھی طرح آباد ہو گیا تھا شہزادے کے نام پر بتدریج ایک خوبصورت و وسیع شہر بننے لگا۔

گولکنڈے سے لڑائی۔

صوبے کا اندرونی نظم و نسق اور فوج کی درستی کے بعد اورنگ زیب کو فرصت ملی کہ دکن کی ریاستوں کے معاملات پر اپنی توجہ مبذول کرے یاد رکھنا چاہئے کہ مغل کشور کشا مدتوں سے ان ریاستوں کی فتح کی تمہید ڈال چکے تھے احمد نگر کی تسخیر کے بعد بیجاپور نے خود ہی اپنے آپ کو ان کے جال میں پھنسا لیا تھا اور گولکنڈے کے بادشاہ کو شاہ جہاں اور نیز اورنگ زیب نہایت حقیر جانتے تھے۔ وہاں کی دولت و ثروت سن کر جس قدر طمع پیدا ہوتی تھی اسی قدر مذہبی حمیت انھیں اس ملک کو قطب شاہیوں سے چھین لینے پر ابھارتی تھی جن کے آخری عہد میں یہ ملک فسق و فجور، بدعت و اوہام کا گھر بن گیا تھا۔ گزشتہ معاہدوں کے بعد آئندہ لڑائی چھیڑنے کے بھی بہت سے مواقع مغلوں کو مل گئے تھے کیونکہ دکن کی یہ زوال پذیر حکومتیں اکثر ان شرائط کی خلاف ورزی کرتی تھیں اور اصلی قوت نہ ہونے کی وجہ سے فریب و سازش پر ان کی سیاسی کامیابی کا انحصار رہ گیا تھا، ظاہر ہے کہ ایک طاقتور حریف کے سامنے جو اپنے ہمسائے کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے پر تلا ہوا تھا، ایسی حیلہ سازیاں زیادہ عرصے تک کارگر نہیں ہو سکتیں۔ جب گزشتہ پیش کش کی رقوم ادا کرنے میں دربار گولکنڈہ کی طرف سے برابر لیت و لعل ہوتی رہی اور اسی طرح بعض اور مطالبات کے تسلیم کرنے میں تامل و سرکشی کا اظہار ہوا تو آخر کار شاہ جہاں کے حکم سے مغل فوجیں گول کنڈے کے علاقے میں گھس گئیں اور اس قدر تیزی سے حیدر آباد پر بڑھیں کہ عبد اللہ قطب شاہ بے حواس ہو کر شہر سے بھاگا اور قلعۂ گولکنڈہ میں قلعہ بند ہو گیا۔[۱] (۱۶۵۶ء)۔

[۱] عاقل خاں شیرازی صاحب "واقعات عالمگیری" کی یہ روایت (جو منوکی اور برنیر کی تحریروں میں کسی قدر اختلاف کے ساتھ موجود ہے) کہ اورنگ زیب نے اپنے بڑے بیٹے شہزادہ محمد سلطان کو

مغلوں کے مقدمۃ الجیش نے حیدر آباد پر قبضہ کر لیا اور انتظام ہوتے ہوتے اس دولتمند شہر کے بعض حصوں کو لوٹ لیا۔ محصور و مجبور عبداللہ قطب شاہ اب تمام شرائط ماننے پر عاجزانہ آمادگی کا اظہار کر رہا تھا لیکن اورنگ زیب کا منشا یہ تھا کہ اگر شاہجہاں اجازت دے دے تو اب اس ریاست کی علیحدہ ہستی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ چنانچہ حیدر آباد کی طرف کوچ کرتے وقت باپ کو تحریر کرتا ہے کہ عادل شاہ کی طرف سے شورش و سازش کے آثار دیکھ کر "ایں مرید توقف را مصلحت نہ دیدہ از ناندیڑ کوچ نمودہ با اعتضاد عنایت الٰہی و توجہ پیر و مرشد حقیقی عازم صوب گولکنڈہ است و تا رسیدن میر جملہ آنجا بودہ اگر حکم اشرف صادر گردد بہ توفیق یزدانی و اقبال لایزال قبلہ و کعبۂ دو جہانی قطب الملک را با مہل وجہے دیگر ساختہ تمامی ولایت او را ...... بحوزۂ تصرف و تسخیر خواہد آورد ...... و بر تقدیریکہ اعلیحضرت با وجود صدور چنین حق ناسپاسی بکافر نعمتی و ظہور ایں قسم تقصیرے عظیم کہ قطب الملک کوتہ اندیش مرتکب آں گردیدہ ...... بہ انتزاع مملکت او حکم نفرمایند جواہر و اقبال ...... و بست و دو لک روپیہ از بقایائے پیش کش سابق کہ بر ذمۂ او ماندہ با پیش کش خوبے از و گرفتہ مراجعت خواہد نمود[1]"

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ بنگالے جانے کے بہانے حیدر آباد کی طرف بھیجا اور یک بہ یک عبداللہ قطب شاہ پر حملہ کرا دیا تھا' ایک بازاری گپ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ سرکار نے بھی اس کی تردید کی ہے (ضمیمہ باب ۹ جلد اول) اور جیسا کہ شاہجہاں نامہ (محمد وارث) اور آداب عالمگیری کے متعدد خطوط سے ظاہر ہوتا ہے عبداللہ قطب شاہ کو ہفتوں پہلے سے اعلان جنگ دیدیا گیا تھا' لیکن سرکار صاحب نے یہ تازہ الزام تراشا ہے کہ اورنگ زیب نے بیٹے کو ہدایت کر دی تھی کہ عبداللہ قطب شاہ کو ملاقات کے بہانے بلا کر خاتمہ قتل کرا دے۔ اس کے ثبوت میں آداب عالمگیری کا جو خط وہ پیش کرتے ہیں اول تو وہ ہمیں اپنے پیش نظر نسخے میں کہیں نہیں ملا دوسرے خود انہی کے انگریزی ترجمے میں (صفحہ ۲۴۰) "ملاقات کے بہانے سے بلا کر قتل کرنے" کا کوئی ذکر نہیں ہے۔"

[1] آداب عالمگیری۔ ورق ۴۳ ہ۔ خط کا اردو میں خلاصہ یہ ہے کہ خاکسار کو (یعنی شہزادہ اورنگ زیب کو) زیادہ ٹھیرنا خلاف مصلحت نظر آیا۔ لہٰذا ناندیڑ سے گولکنڈہ روانہ ہوتا ہے اور میر جملہ کے (شاہجہاں کے پاس پہنچ

باپ دارا کی مخالفت

لیکن شاہجہاں بذات خود گولکنڈے کے الحاق پر آمادہ تھا یا نہ تھا، اس کے بڑے بیٹے کو یہ بات کسی طرح منظور نہ ہوئی۔ چاہنے والے باپ کی عمر کے ساتھ اس کا معاملات سلطنت میں روز بروز دخل بڑھتا جاتا تھا اور اسے سب بھائیوں سے زیادہ اورنگ زیب کا حسد تھا جس کی شہرت کارگزاری میں برابر ترقی ہو رہی تھی۔ ادھر خود اورنگ زیب کی بھائی سے ناراضی کی نوعیت بھی اب بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ زمانہ گیا جبکہ وہ بڑے بھائی کے رشک وحسد سے بچنے کی خاطر مجبوراً گوشہ نشینی اختیار کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اب وہ ایک پختہ کار، صاحب اہل وعیال آدمی تھا اور اگر اسے اپنی اولاد کی آئندہ فلاح وبہبود کی طبعی فکر نہ تھی تو بھی غالباً اب وہ اپنی زندگی کو دنیا میں رہ کر پوری قوت ومستعدی کے ساتھ خالصتہً لوجہ اللہ گزارنے کے راز کو سمجھ گیا تھا۔ اور اگر وہ خود سلطنت ہند کا آرزومند نہ ہو یا اول اول صرف ممالک دکن کی بادشاہی اس کا مطمح نظر ہو تو بھی یہ قریب قریب یقینی بات ہے کہ اسے دارا شکوہ کا آئندہ بادشاہ ہونا سخت ناگوار تھا کیونکہ اس شہزادے نے اسلامی تصوف اور دعویٰ ولایت کے دائرے سے گزر کر اب وہ "مشرب وسیع" اختیار کر لیا تھا جو اس زمانے کے اکثر مصنفوں کے نزدیک تو "آزاد خیالی" کی دلیل ہے لیکن راسخ العقیدہ مسلمانوں میں ہمیشہ لامذہبی اور بے دینی سمجھا گیا ہے۔[۱]

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ آئے تک اسی طرف قیام کرے گا کہ اگر بادشاہی حکم ہو تو قطب الملک کو گرفتار اور اس کی ریاست کو فتح کر لیا جائے۔ لیکن اگر حضور (یعنی شاہجہاں) کو قطب الملک کی غلط کاریوں کے باوجود یہ منظور نہیں ہے تو اس صورت میں اس سے صرف پیش کش کی باقیات اور نیز کچھ تاوان لینے پر اکتفا کی جائے گی۔

۱۔ "لطائف الاخبار" سے جو دارا شکوہ کے ایک مداح کی تصنیف ہے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شہزادہ اپنی کشف وکرامات کا بہت دن سے مدعی تھا (صفحہ ۱۷) صوفی سرمد اور جوگی لال داس اس کے مشہور "استاد" ہیں۔ پھر اسے "مجمع البحرین" نامی کتاب لکھ کر یہ ثابت کرنا چاہا کہ دنیا کے سب مذہب ایک ہیں اور "اپنشد" کے فارسی ترجمے میں یہاں تک ترقی کی کہ قرآن مجید کو اسی کتاب سے ماخوذ بتایا۔ بظاہر وہ اپنے پردادا اکبر کا مقلد تھا اور عجب نہیں کہ بادشاہ ہو کر "دین الٰہی" کی طرح اس کے واسطے بھی کوئی نیا مذہب تیار کر لیا جاتا۔

باب ۲

باایں ہمہ اورنگ زیب نے اپنی طرف سے آخر تک بھائی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ دکن کی دوسری صوبہ داری کے زمانے میں بار بار صدر حکومت نے اس کی آزار رسانی اور توہین کی کوشش کی۔ اس کی مالی اور فوجی اصلاحات کے راستے میں طرح طرح کی مشکلات حائل کی گئیں جنھیں وہ اپنے متعدد خطوط میں باپ کو جتاتا ہے۔ اب بھی گولکنڈے کی تسخیر سے حکماً اس کو روک دیا گیا اور وہ اپنی منشا کے خلاف محض باپ کی تعمیل حکم میں پیش کش کی کچھ رقوم اور آئندہ اطاعت گزاری کے ناقابل اعتبار عہد و پیمان[۱] لے کر واپس اورنگ آباد چلا آیا (۱۰۶۶ھ / ۱۶۵۶ء) اسی طرح جب سال آئندہ خود شاہجہاں کے حکم اور شاہی افواج کی امداد سے اس نے بیجاپور پر فوج کشی کی اور اپنی حیرت انگیز قابلیت سپہ سالاری اور شجاعت سے بیدر و کلیانی جیسے مستحکم قلعے چھین لیئے نیز اہل بیجاپور کو کئی خونریز معرکوں میں شکستیں دیں (۱۰۶۷ھ / ۱۶۵۷ء) تو عین اس وقت جب کہ اس نے دشمن کی قوت مدافعت کو مضمحل کر دیا تھا اور اس کی فتحمند فوجیں بیجاپور کے اندرونی علاقوں میں بڑھ رہی تھیں شاہجہاں نے حکماً اس کو صلح کرنے پر مجبور کیا اور اسے بادل ناخواستہ بیدر و کلیانی کے اضلاع اور ڈیڑھ کروڑ روپیہ بقایا و تاوان کی شرط پر حکومت بیجاپور سے صلح کرنی پڑی۔

خانہ جنگی

اورنگ زیب کے خلاف یہ تمام کارروائیاں داراشکوہ کی کوشش و رسوخ کا نتیجہ تھیں اور جب اسی زمانے میں (ذوالحجہ ۱۰۶۷ھ / ۱۶۵۷ء) شاہجہاں سخت بیمار ہوا تو پھر تمام اختیارات علانیہ اس کے ہاتھ میں آگئے[۲] اور اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ

---

[۱] چنانچہ عبداللہ قطب شاہ نے مغلوں کے واپس جانے کے بعد صلحنامہ کی اکثر شرائط کی تعمیل نہیں کی تفصیل کے لیے دیکھو سرکار، جلد اول صفحہ ۲۴۷ وغیرہ)

[۲] خافی خاں لکھتا ہے (جلد دوم صفحہ ۴) "داراشکوہ کہ ولی عہد مستقل خود را می گرفت و در ایام صحت نیز زمام اختیار ملک رانی بدست او بود و بہ تقلید ملحدان صوفی مشرب تصوف را ہزنام ساختہ کفر و اسلام را برادر توام خواندہ ...... دریں وقت فرصت را غنیمت دانستہ اختیار امور سلطنت بکمف اقتدار خود درآوردہ ...... نیز دیکھو آثر عالمگیری صفحہ ۳۔ وغیرہ وغیرہ۔

تاکیدی احکام بھیجکر دکن کی بادشاہی فوجوں کو جو اورنگ زیب کی امداد کے واسطے بھیجی گئی تھیں، واپس طلب کرلیا؛ اس شہزادے نے ہر چند چاہا کہ یہ فوجیں کم سے کم اس وقت تک کہ صلح نامے کی شرائط کی تعمیل ہو جائے، ٹھیری رہیں لیکن ملک میں عام طور پر شاہجہاں کے انتقال اور دارا شکوہ کی تخت نشینی کی افواہیں پھیل گئی تھیں افواج شاہی کے سرداروں نے اورنگ زیب کی ایک نہ سنی اور بعض علانیہ سرکشی کے ساتھ بغیر اس سے رخصت ہوئے شمالی ہند کی جانب روانہ ہو گئے[۱] نتیجہ یہ ہوا کہ مذکورۂ بالا شرائط صلح کی بجا آوری میں بھی اہل بیجاپور لیت ولعل کرنے لگے۔

اس اثنا میں ادھر تو دارا شکوہ نے بھائیوں کے وکیلوں کو آگرے میں نظر بند کرکے ان کے خط وکتابت کے تمام ذرائع مسدود کردیے اور ادھر اورنگ زیب کو حکم بھیجا کہ صوبۂ برار (وخاندیس؟) کو فوراً شہزادۂ مراد بخش کے حوالے کردیا جائے جسے گجرات کا صوبہ خالی کرکے برار جانے کے احکام پہنچ گئے تھے ساتھ ہی جسونت سنگھ اور قاسم خاں کو فوج دے کے مالوے بھیجا گیا کہ ضرورت ہو تو جبراً ان احکام کی تعمیل کرائیں[۲]۔

دارا شکوہ کی یہ اور اسی قسم کی دوسری کارروائیاں بھائیوں کی علانیہ عداوت اور خود اس کی جلد بازی اور ناعاقبت اندیشی پر مبنی تھیں۔ ان کا اثر یہ ہوا کہ شجاع نے بنگالے میں اور مراد نے گجرات میں شاہجہاں کی وفات اور اپنی خود مختار بادشاہی کا اعلان کرادیا اور شجاع جسے اپنی جنگی کشتیوں اور توپوں پر بہت ناز تھا، فوراً افواج آراستہ کرکے دہلی کی جانب روانہ ہوگیا کہ بڑے بھائی کو شکست دیکر خود سلطنت پر قبضہ کرلے؛ اس کے مقابلے کے واسطے دارا نے اپنے بڑے بیٹے سلیمان شکوہ اور راجہ جے سنگھ کو بھیجا جنھوں نے بنارس کے قریب شجاع کو سخت شکست دی (۱۰۶۸ھ-۱۶۵۸ء) اور مونگھیر تک اس کے تعاقب میں آئے تھے کہ

۱۔ واقعات عالمگیری، ورق ۱۲۔

۲۔ سرکار، جلد اول صفحہ ۳۶۰ بحوالہ "فیاض القوانین"۔

باب ۳

پائے تخت سے انھیں بہ عجلت واپس آنے کا حکم ملا کیونکہ اس اثنا میں دارا کے جنوبی حریف جسونت سنگھ اور قاسم خاں کو شکست دے کر شمالی مالوے تک بڑھ آئے تھے؛

اورنگ زیب کی فتوحات

شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ جب شاہی افواج کے دکن سے واپس جانے کے بعد اورنگ زیب کو بادل ناخواستہ بیجا پور کے علاقے سے ہٹنا پڑا اور ادھر اپنے وکیل دربار کی گرفتاری، اور خط و کتابت کے سد باب کے ساتھ ہی برار سے دست بردار ہونے کا حکم پہنچا تو وہ نہایت پریشان ہو گیا۔ مراد بخش نے تو گجرات کو خالی کرنے کی بجائے وہاں اپنی خود مختار بادشاہی کا اعلان کر دیا تھا اور برابر اورنگ زیب کو خط لکھ کر دارا کے خلاف لشکر کشی پر ابھار رہا تھا لیکن خود اورنگ زیب اب بھی باپ کے جیتے جی علانیہ انحراف یا بادشاہی کا دعوے کرنا نہ چاہتا تھا اور ایک عرصے کے تردد و انتشار کے بعد وہ اپنی فوج لے کر خاندیس تک بڑھا (جمادی الاول ۱۰۶۸ھ) تو اس کا سبب بھی محض یہ تھا کہ آگرے سے نسبۃً قریب رہ کر اپنے خطوں کے جواب کا انتظار کیا جائے۔ اور "ہموارہ در صدد دانستند کہ شاید عارضۂ آنحضرت (شاہجہاں) بالکلیہ زائل شدہ صحت کامل حاصل آید تا بہ نظم و نسق مہمات خلافت و جہانبانی کہ بہ سبب ضعف و آزار..... خلل پذیرفتہ بود، بہ نفس نفیس متوجہ گردیدہ کار دولت و سلطنت را از نو نظام و سرانجام بخشند و دست تصرف و استقلال بے شکوہ (یعنی دارا شکوہ) خسران مآل از مراتب ملک و مال کوتاہ سازند[1]"۔ (عالمگیر نامہ صفحہ ۴۹) لیکن یہ آخری خیال غلط نکلا۔ شاہجہاں تندرست ہونے کے بعد بھی داراشکوہ کے "دست تصرف" کو "کوتاہ" نہ کر سکا۔ جسونت سنگھ اور قاسم خاں نے دکن کے راستے روک کر گجرات پر فوج کشی کی تیاری کی کہ مراد بخش کا استیصال ہو جائے تو اطمینان سے اورنگ زیب کی طرف متوجہ ہوں، اس وقت

[1] فارسی عبارت کا اردو میں خلاصہ یہ ہے کہ اورنگ زیب کو اس بات کی بھی امید تھی کہ شاید بادشاہ کی طبیعت بالکل درست ہو جائے گی اور وہ ملکی انتظامات کی جانب، جس میں اتنے دن کی علالت سے خلل پیدا ہونے لگا تھا، پھر خود متوجہ ہو کر داراشکوہ کی مداخلت کو دور کر دیں گے۔

باب ۳

مرادؔ نے سخت اصرار و منت کے ساتھ بھائی کو امداد و اتحاد کے خط بھیجے اور خود اورنگ زیب کو نظر آنے لگا کہ "اگر وہ بادشاہ ہوتا یا محض آزادی سے زندہ رہنا چاہتا ہے تو اب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا غیر ممکن ہے"[1]

آخر اس نے مراد بخش کی درخواست قبول کر لی اور معاہدہ ہوگیا کہ ضرورت ہوئی تو دونوں بھائی مل کر دارا شکوہ کا مقابلہ کرتے رہیں گے اور اس کے استیصال کی صورت میں کابل و کشمیر، شمالی پنجاب اور سندھ و ملتان کا ملک شہزادۂ مراد بخش کے حصے میں آئے گا اور باقی ممالک ہند اورنگ زیب کی ملکیت ہوں گے۔[2] پھر اس نے برہان پور سے کوچ کیا اور نربدا اتر کے جسونت سنگھ کے مقابلے کے لیے بڑھا، جو ان دنوں اجین میں مقیم تھا۔ راستے میں مراد بخش اپنی آٹھ دس ہزار فوج لے کر بھائی سے آملا اور اب اورنگ زیب کی کل فوج حریف کے تقریباً مساوی یعنی تیس چالیس ہزار کے درمیان ہوگئی[3]۔ لڑائی سے پہلے اس نے جسونت سنگھ کو کہلا بھیجا تھا کہ اگرچہ میری پیش قدمی احکام شاہی کے خلاف ہے لیکن جب تک آگرے جا کر میں اپنے باپ سے خود نہ مل لوں گا، مجھے اطمینان نہ ہوگا اور واپس دکن نہ جاؤں گا۔ یہ کوئی بغاوت یا بادشاہ سے لڑائی نہیں ہے اور تم کو چاہیئے کہ یا تو میرے ہمراہ آگرے چلو یا راستہ چھوڑ کر ہٹ جاؤ۔[4]

جسونت سنگھ نے ان میں سے کوئی بات نہ مانی، اور جب تک اجین کے قریب سخت شکست نہ کھائی (رجب ۱۰۶۸ھ) راستہ نہ دیا۔ لڑائی میں اس کے بہت سے **راجپوت** سپاہی اور سردار مارے گئے اور خود وہ بہ مشکل جان بچا کر میدان سے فرار ہوگیا۔ فتح کی یادگار میں جو قصبہ اورنگ زیب نے مقام جنگ

---

[1] یہ جادو ناتھ صاحب سرکار کے الفاظ ہیں (جلد اول صفحہ ۳۶۰) جو اورنگ زیب سے نہایت تعصب و بدگمانی رکھتے ہیں۔

[2] باب کے ضمیمے میں اس معاہدے کی نقل شامل کر دی گئی ہے نیز دیکھو واقعات عالمگیری ورق ۱۰ و ۳۹۔

[3] سرکار، جلد دوم صفحہ ۱۱۔

[4] عالمگیر نامہ صفحہ ۵۵۔ خافی خاں ۱۲۔ واقعات عالمگیری ۱۰۔

باب

کے قریب آباد کیا تھا وہ فتح آباد کے نام سے اب تک موجود ہے۔

سموگڑھ

لیکن اس جنگ برادران کا سب سے بڑا اور فیصلہ کن معرکہ ڈیڑھ مہینے کے بعد سموگڑھ کے میدان میں ہوا جو آگرے سے آٹھ دس میل مشرق میں واقع ہے۔ یہیں اورنگ زیب نے اپنے کوہ وقار ثبات قدم اور عمدہ سپہ سالاری کے، اور مراد بخش نے سپاہیانہ تہور کے جوہر دکھائے۔ داراشکوہ نے حریفوں کے مقابلے میں قابلیت ذاتی کی اس کمی کو دُگنی فوج[1] اور کثرت ساز و سامان سے پورا کرنا چاہا تھا اور بے شبہ اس کی فوج کے پہلے حملے نے صفوف مقابل میں ہل چل ڈال دی تھی۔ لیکن اورنگ زیب جیسے سپہ سالار کے مقابلے میں یہ غلبہ محض عارضی تھا۔ اس کی صفیں پیچھے ہٹتے ہی پھر جم گئیں اور جس قدر حملہ آوروں کا ابتدائی جوش کم ہوتا گیا اسی قدر مدافعین کی چیرہ دستی بڑھتی گئی۔ اورنگ زیب نے اپنے توپ خانے کو وسط میں برابر بچائے رکھا تھا اور اس کی آتش باری ہی کی وجہ سے دشمن کی پہلی یورش اس کے بازوؤں کی طرف منتشر ہوگئی تھی۔ مگر جب دونوں طرف اس کا ریلا رک گیا تو شہزادۂ محمد سلطان باپ کے حکم سے غنیم کے بائیں پہلو پر حملہ آور ہوا۔ واضح رہے کہ اس کا رسالہ اپنی توپوں کی پناہ میں پیچھے کھڑا تھا اور دونوں پہلوؤں پر دباؤ پڑنے کے باوجود اورنگ زیب کے قطعی احکام نے اسے اب تک اپنی جگہ سے ہلنے نہ دیا تھا۔ اب یہ تازہ دم سوار گھوڑے اڑاتے ہوئے ایک طرف سے نکلے اور اپنے میمنہ کے ساتھ مل کر انھوں نے غنیم کے میسرہ پر اس جوش و قوت سے حملہ کیا کہ اس کی صفیں سمٹ کر پیچھے ہٹنے لگیں اور ہٹتے ہی پھر اورنگ زیبی توپ خانے کی زد میں آگئیں جس کی چند شلکوں نے ان کے حواس باختہ کر دیئے اور خود داراشکوہ کو جان بچانے کی پڑ گئی۔ ایک مستقل مزاج سپہ سالار کا جس کے پاس فوجوں کی کچھ کمی نہ تھی اس الجھاوے سے اپنے

---

[1] اورنگ زیب کی تیس پینتیس ہزار سپاہ کے مقابلے میں، دارا کی کل فوج کا شمار ایک لاکھ کے قریب تھا۔ (واقعات عالمگیری، ورق ۱۰) خافی خاں نے بھی ساٹھ ہزار سے زیادہ صرف سوار بتائے ہیں۔ ایسی صاف اور صریح شہادتوں کے مقابلے میں سرکار کا بلا سند پیش کیے یہ لکھنا کہ دارا کی فوج کی تعداد تقریباً پچاس ہزار تھی (جلد دوم صفحہ ۴۰) عجیب قسم کی دیدہ دلیری ہے!

باب ۳

یسرہ کو نکال لینا کچھ دشوار بات نہ تھی اور تھوڑا سا نقصان اٹھا کر غنیم کی دہری زد بچائی جا سکتی تھی لیکن نازک مزاج دارا کو دھوپ کی تپش اور مضطربانہ ادھر ادھر تگ و دو ہی نے پریشان کر دیا تھا اب گرد و پیش لوگوں کے گرنے اور گھبرا کے ہٹنے، نیز خود اس تک بعض آتش بازی کے لٹوؤں کے پھٹنے سے اس کے اوسان بگڑ گئے اور وہ گھوڑے پر سوار ہو کر بے حواسی کے ساتھ فرار ہو گیا۔ اور چونکہ آگرے میں دوبارہ کسی فوج کے مرتب کرنے کی امید نہ تھی لہذا راتوں رات پنجاب کے ارادے سے دہلی کی طرف چلدیا۔ یہ خونریز جنگ جس میں صرف دارا کے نقصانات کا اندازہ دس ہزار مقتول کیا جاتا ہے، ۷ رمضان المبارک ۱۰۶۸ھ مطابق ۲۹ مئی ۱۶۵۸ء کے دن ہوئی۔

شاہجہاں اور مراد کی نظربندی

اورنگ آباد سے روانگی کے وقت سے اب تک اورنگ زیب نے جس قدر عرائض شاہجہاں کو ارسال کیں، ان میں سے کسی کا جواب نہ ملا تھا۔ سموگڑھ کی فتح کامل کے بعد جب کہ اسے دقت کے وقت کسی حریف کا خوف نہ تھا، اور نہ صرف داراشکوہ کی فوج کے اکثر سردار و سپاہی بلکہ خود بادشاہ کے ذی اثر امرا اس کی اطاعت قبول کر رہے تھے، اس نے پھر ایک عرضداشت باپ کی خدمت میں بھیجی اور اس میں بھائی کی ناانصافیاں اجمالاً دہرا کر کمال عجز و ندامت کے ساتھ اپنی پیش قدمی کی معافی مانگی۔ اور تمام مجبوریاں لکھنے کے بعد بھی اپنے ہی قصور کا اعتراف کیا۔ شاہجہاں نے اس کے جواب میں فتح کی مبارکباد اور ایک تلوار ہدیۃً ارسال کی جس پر "عالمگیر" کا خطاب کندہ تھا اور تین چار دن بعد اسے ملنے کے واسطے بلایا؛ اورنگ زیب نہ صرف باپ کی ملاقات بلکہ اس شرط پر کہ داراشکوہ کو آئندہ معاملات سلطنت میں کوئی دخل نہ دیا جائے اور وہ اپنے شمالی صوبوں میں (ملتان) رہے، مصالحت کے لیے بالکل آمادہ اور باپ کے حکم کے مطابق غالباً واپس دکن جانے کے لیے تیار تھا۔ اس نے اپنے مشیروں کے شبہات پر بھی چنداں اعتنا نہ کی تھی لیکن جس وقت خاص شاہجہاں کے ہاتھ کا رقعہ جو داراشکوہ کے نام دہلی بھیجا گیا تھا راستے میں پکڑا گیا اور اورنگ زیب کے سامنے پیش ہوا تو بے شبہ وہ حیران رہ گیا ہوگا

باب ۲

کیونکہ "آں منشور ناطق برآں بود کہ دارا شکوہ خاطر خود را جمع کردہ در شاہجہاں آباد ثبات قدم ورزد و از آں جا بیشتر نگذرد کہ ما دریں جا مہم را فیصل می فرمائیم" [۱]
سلطنت کے لیے اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو کمال بے دردی سے قتل یا اندھا کرا دینا، اس زمانے کے طبقۂ اعلیٰ میں اسی طرح جائز قرار دے لیا گیا تھا، جس طرح آج کل کمزور و مغلوب قوموں کی پامالی عین مصلحت سمجھی جاتی ہے۔
اور اگرچہ اس بات کی صدہا شہادتیں موجود ہیں کہ بعد میں بھی باپ کے ساتھ اورنگ زیب کی اس فرزندانہ محبت و تعظیم میں فرق نہیں آیا جو اس کی فطری سعادت اور سچی خداترسی کا نتیجہ تھی، [۲] تاہم وقت کے وقت اس قاتلانہ سازش کے جواب میں اس نے اپنے بیٹے کو حکم دیا کہ محلات شاہی کو محصور کر کے

۱۔ واقعات عالمگیری ورق ۲۹۔

۲۔ شاہجہاں کی نظر بندی کے زمانے میں جو خط اورنگ زیب نے اسے اور اپنی بڑی بہن جہاں آرا بیگم کو لکھے ہیں۔ ان کا نمونہ مختلف تاریخ و انشا کی کتابوں میں، اور ایک معقول و مستند مجموعہ آداب عالمگیری میں موجود ہے (ورق ۴۲ تا ۱۰۴) پھر شاہجہاں کے انتقال کے بعد اس کے اپنے بیٹوں کے نام بہت سے خط رقعات عالمگیری میں ملتے ہیں جن میں اپنے مرحوم باپ (شاہجہاں) کے جابجا حالات لکھے ہیں۔ اور ان خطوں کی ایک ایک سطر سے ایسی مخلصانہ محبت اور عاجزانہ تعظیم پڑ ٹپکتی ہے جس کی نظیر بادشاہوں کے مکتوبات درکنار شاید کسی فقیر زادے کی تحریر میں بھی مشکل سے میسر آئیگی۔ اس جگہ یہ صراحت کئے بغیر چارہ نہیں کہ اس زمانے کے انگریزی تاریخ نویس اول تو فارسی تواریخ سے بہت کم واقف ہیں دوسرے انہیں (جادو ناتھ صاحب سرکار سمیت) فارسی زبان پر اتنا عبور نہیں کہ مذکورۂ بالا خطوط کے صحیح مفہوم و منشا کو سمجھ سکیں۔ تیسرے اپنی طبیعت و تربیت کی وجہ سے بھی وہ اس بارے میں معذور رہیں۔ چنانچہ (مثلاً) انھوں نے اورنگ زیب کے بعض خطوط کو، جن میں وہ حسرت و افسوس کے ساتھ اپنے گناہوں کا اعتراف اور آئندہ محاسبہ کا خوف ظاہر کرتا ہے، اس کے گزشتہ مظالم و جرائم کے ثبوت میں پیش کیا ہے! درحقیقت یہ مادہ پرست مصنف اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکتے کہ ایک خدا پرست عابد کا نفس جس قدر زیادہ صاف اور مزکّیٰ ہوتا ہے اسی قدر اس کی ذمہ داریاں بڑھتی ہیں اور اسے اپنی خفیف ترین لغزش بلکہ خدا کی یاد سے محض عارضی غفلت بھی سخت معصیت اور قابل مواخذہ خطا محسوس ہونے لگتی ہے اور وہ ایسے انفعال و خوف کے دریا میں غرق ہو جاتا ہے جس سے عفو و رحمت الٰہی کی امید ہی اسے اوپر ابھار سکتی ہے۔

باب ۳

شاہجہاں کو اطلاع دیدی جائے کہ اب وہ نظر بند ہیں![1]

اب اورنگ زیب نے دارا شکوہ کے تعاقب میں آگرے سے پنجاب کی طرف کوچ کیا۔ لیکن اس اثنا میں مراد بخش کی جانب سے اسے تازہ فکر پیدا ہوگیا کہ وہ ابھی سے خود مختار بادشاہی کا دعویٰ کر رہا تھا۔ اس نے بھائی سے علیحدہ امرائے شاہی کو ملانا اور نئی فوج مرتب کرنی شروع کردی تھی اور بھائی کے ساتھ چلنے میں بھی روپیہ نہ ہونے کے عذر پر پس و پیش کرنے لگا تھا۔ اورنگ زیب نے اسے بیس لاکھ روپیہ ارسال کیا اور "ہر روز مکرر پیغام می فرستادند کہ چوں ہنوز مطلب عمدہ (حسب معاہدہ) در پیش است سرسری قدم توجہ پیش نہادن مصلحت کار تقاضا نمی فرماید"[2] لیکن مراد بخش طیش و طمع کے جذبات سے جلد مغلوب ہوجاتا تھا اور ہمارے سب مورخ متفق ہیں کہ اس وقت بھی سادہ لوحی سے وہ اپنے خوشامدی مصاحبوں کے کہنے میں آگیا تھا جس سے اورنگ زیب کو آئندہ فساد کا اندیشہ پیدا ہوا اور اس کو مصلحت اسی میں نظر آئی کہ دعوت کے بہانے ایک روز اپنے خیمے میں بلاکر بھائی کو حراست میں لے لیا (شوال ۱۰۶۸ھ ۱۶۵۸ء) اور پہلے دہلی اور پھر گوالیار کے قلعے میں نظر بند کرادیا۔ جیسا کہ خود اورنگ زیب نے معذرت کی تھی[3] درحقیقت وہ عام دستور کے موافق، بھائی کی جان لینی نہ چاہتا تھا بلکہ نظر بندی کا مدعا محض یہ تھا کہ آیندہ فساد و خانہ جنگی کا پیش از وقت تدارک کردیا جائے۔ ورنہ گوالیار میں

---

[1] اورنگ زیب کی مصالحت پر آمادگی اور شاہجہاں کی اس کے خلاف سازش کے حالات ان مورخوں نے جن کی نسبت اورنگ زیب کی طرف داری کا شبہہ بھی نہیں ہو سکتا۔ نہایت وضاحت کے ساتھ لکھے ہیں اور مولوی شبلی صاحب نے بھی "عالمگیر پر ایک نظر" نامی رسالے میں اس پر بہت خوبی سے بحث کی ہے (صفحہ ۳۹ وغیرہ) مگر باوجود ناتھ سرکار، اگرچہ واقعات سے انکار نہیں کرسکے تاہم کمال تعصب سے انھیں ایسی صورت میں پیش کرتے ہیں (جلد دوم باب ہفدہم) کہ خواہ مخواہ اورنگ زیب کی نسبت بدگمانی پیدا ہو

[2] واقعات۔ ورق ۴۴ نیز دیکھو مآثر صفحہ ۸۔

[3] واقعات۔ ورق ۴۴۔

آزادی کے سوا مراد بخش کے لیے ہر قسم کی آسائشیں فراہم کردی گئی تھیں اور بعد میں بھی جب اس پر قتل کا دعویٰ کیا گیا تو اورنگ زیب بذاتہ غالباً خونبہا دے کر اس کی جان بچانی چاہتا تھا۔ لیکن مستغیث (یعنی مقتول کا بیٹا) قصاص پر مصر تھا اور ثبوت جرم میں کوئی کسر نہ تھی۔ قاضیٔ عدالت نے موت کا فتویٰ دیا اور مراد بخش سنہ ۱۰۷۲ھ / ۱۶۶۲ء میں اسی قلعۂ گوالیار میں قتل کرا دیا گیا۔[1]

ب۔ عہد بادشاہی

غلط بیانیاں اور ذاتی اوصاف۔

مذکورۂ بالا حالات کو ہم نے خلاف عادت زیادہ تفصیل و وضاحت سے بیان کیا کیونکہ آج کل اورنگ زیب کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں جدید انگریزی تاریخوں کو پڑھنے سے یقین ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ مجسم شیطان تھا جس کی

---

[1] اس قتل کے متعلق اکثر تاریخوں میں غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن ہم اصلی واقعات کو خود خافی خاں کی تاریخ سے اخذ کر سکتے ہیں۔ اس مورخ کا باپ مراد بخش کا خاص معتمد علیہ اور ملازم تھا اور نظر بندی کے زمانے میں اس شہزادے کو قلعے سے بھگا لے جانے کی جو کوششیں کی گئیں ان میں بھی شریک رہا۔ مختصر یہ کہ خافی خاں مراد بخش کی سرکار کا نمک پروردہ اور دل سے اس کا طرف دار، اور اس شہزادے کے قید و قتل کے معاملے میں اورنگ زیب سے قدرۃً بہت ناراض ہے۔ اسی کا یہ بیان ہے کہ علی نقی خاں کا (جسے مراد بخش نے گجرات میں بے گناہ مار ڈالا تھا) بڑا بیٹا قصاص کے دعوے سے دست بردار ہو گیا اور چھوٹے کے استغاثے پر قاضی نے سزائے قصاص تجویز کی۔ لیکن خود اورنگ زیب اس مستغیث سے بعد میں ناراض رہا اور "چوں پسر کلاں از دعوی خون پدر ابا نمودہ بود" بادشاہ قدردان (یعنی اورنگ زیب) از فرمودنِ خدمات حضور و دیگر عنایات متوجہ حال او شدند (منتخب اللباب، جلد دوم صفحہ ۱۵۶) اس حقیقت کو نہ چھپا سکنے کے باوجود اس مورخ کا یہ کہنا کہ قتل کا دعویٰ بھی اورنگ زیب کے اشارے سے ہوا، قابل یقین نظر نہیں آتا۔

رگ رگ میں ظلم و خونخواری، مکر و خود غرضی بھری ہوئی تھی اور خود ہمعصر فارسی تاریخوں سے
اس یقین کی تائیدی شہادتیں فراہم کی جاسکتی ہیں۔ لیکن یہ فارسی تاریخیں جن کے
لکھنے والے بالعموم اورنگ زیب سے ناخوش ہیں، اس بارے میں متفق ہیں کہ
یہ بادشاہ ذاتی طور پر نہایت سادگی پسند اور درویش مزاج آدمی تھا۔ ہر قسم کے
لہو و لعب اور عیش و طرب سے اسے نفرت تھی۔ قیمتی لباس، عالیشان محلات،
زر و جواہرات اور پر تکلف کھانوں کا اسے شوق نہ تھا۔ درباری شوکت و تجمل
تزک و احتشام یا ایسے شاہانہ مراسم جو بادشاہ کو معمولی انسانوں سے بلند و برتر
بنا دیتے ہیں، اسے ناپسند تھے۔ اپنی رعایا اور اولاد پر اس کی شفقت، ماتحتوں کے ساتھ
اس کی مہربانی، حلم و رعایت ضرب المثل تھی۔ عمر بھر اس نے کسی کے منہ پر
سخت و سست لفظ نہیں کہا۔ بچے بیمار ہوئے تو بعض دفعہ ان کی تیمارداری میں
کئی کئی دن ان کے ساتھ بیٹھ کر خود پرہیزی کھانا کھایا۔ لڑکپن سے اس کے تقویٰ
اور دینداری میں کسی کو حرف رکھنے کی گنجایش نہیں ہوئی۔ بادشاہ ہو کر اس نے
پورا قرآن مجید حفظ کیا اور اکثر اوقات دہراتا رہتا تھا۔ اکثر راتیں عبادت و
یاد الٰہی میں اور دن نفلی روزہ رکھ کر گزار دیئے اور یہ اعمال حسنہ محض تقلید و
ضعیف الاعتقادی پر مبنی نہ تھے کیونکہ اورنگ زیب علوم عقلی و نقلی کا نہایت
فاضل و ذہین طالب علم تھا اور اس کی علمی موشگافیوں کے بعض دلچسپ قصے
اب تک مشہور ہیں، اسی کے ساتھ معاملات سلطنت سے اس کو حیرت انگیز
واقفیت تھی۔ ملکی اور فوجی آئین و انتظام کی جزئیات تک سے وہ آگاہ تھا
اور ایک ایک قصبے کے "اخبار" خود مطالعہ کرتا اور تمام حالات کی خبر رکھتا تھا۔
سیاسی تدبر اور انتظامی قابلیت کے ساتھ وہ فن حرب کا مانا ہوا ماہر ہے۔ اور
چودہ برس کی عمر سے، جب اس نے مست ہاتھی کا مقابلہ کیا، اس کی ذاتی شجاعت
کی ملک میں دھاک بیٹھ گئی تھی۔ مگر اس جگہ خاص طور پر جتانے کی بات یہ ہے کہ
اس کی شجاعت اور کسی جانباز سپاہی کے جوش تہور و دلاوری میں ایک نمایاں
فرق تھا۔ وہ یہ کہ اورنگ زیب محض شوق بہادری یا کسی سپاہیانہ آن بان کی خاطر
یا وقتی ہیجان و اشتعال میں جان سے بے پروانہ ہو جاتا تھا بلکہ درحقیقت اسے

بذاتہ جان کی کوئی خاص محبت اور خدا کے سوائے کسی شئے کی دہشت نہ تھی۔ وہ زندگی کو محض خدا کی امانت سمجھتا تھا اور اسی لیے ہم جا بجا پڑھتے ہیں کہ عین جنگ میں نماز کا وقت آگیا تو وہ اپنی سواری سے اتر پڑا اور "بکمال حضور وجمعیت قلب" کے ساتھ نماز ادا کی۔" "دراں حالت اگر جہان وجہانیاں بہم برآیند درجمعیت قلب وآرام باطن اشرف خلل وفتور رہنمی رود۔ وبارہا در مواقف صعب ایں صورت ازآں خدیوصورت ومعنی رخ نمودہ ودوست ودشمن ..... آں را معائنہ کردہ اند وبالجملہ بروفق۔

"مَنْ اِسْتَأْنَسَ بِاللّٰہِ لَمْ یَسْتَوْحِشْ مِنْ غَیْرِ اللّٰہِ"

جز ایزد توانا وخالق بے ہمتا (عزوجل) ترس وبیم وخوف وہراس از ہیچ چیز وہیچکس درذات اقدس نیست"

ان تمام مسلمہ صفات وعادات[1] کو پیش نظر رکھنے کے بعد بھی اگر کہا جائے کہ اورنگ زیب کی یہ ساری درویشانہ طرز زندگی اور زہد وعبادات محض ریاکاری سے تھیں، تو شاید خلوص وصداقت کا پھر کوئی معیار باقی نہ رہے گا۔ دوسرے یاد رکھنا چاہئیے کہ ہندوستان کے راسخ العقیدہ، ذی علم وسنجیدہ (سنی) مسلمان اورنگ زیب کو اول سے بہترین مسلمان بادشاہ مانتے ہیں اور ان کی رائے کے مقابلے میں مغربی مصنفوں کی رائیں، جو ہندوستان کی اسلامی تاریخ سے بہت کم واقف اور اسلام اور مسلمانوں سے بالعموم تعصب رکھتے ہیں، تاریخی اعتبار سے

---

[1] اورنگ زیب کے مذکورہ اوصاف کی اس قدر تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ گو ان کے بیان کرنے میں فارسی انشا پردازوں نے حسب عادت مبالغۂ شاعرانہ سے کام لیا ہو لیکن ان کی اصلیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ مثال کے لیے ملاحظہ ہو عالمگیر نامہ صفحہ ۱۰۰۷ الخ مآثر عالمگیری ۵۲۰ تا ۵۲۳۔ واقعات عالمگیری ورق ۱ و ۲۔ منتخب اللباب صفحہ ۱ و ۲ و ۵۰ و ۵۵ وغیرہ وغیرہ۔ لین پول صاحب نے اپنے تاریخی تمانفانے "اورنگ زیب" میں ان اوصاف پر بحث کی ہے (باب سوم وچہارم) اور بابو جادو ناتھ سرکار کو بھی ان سے انکار کرتے نہیں بنی (تاریخ اورنگ زیب، مقدمہ جلد اول صفحہ ۱۵)۔

باب ۱

کوئی وزن نہیں رکھتیں؛ نظر برایں ہمیں اورنگ زیب کے حالات کو مطالعہ کرتے وقت یہ نکتہ دلنشین رکھنا چاہیئے کہ اس بادشاہ کی زندگی درحقیقت اسلامی للّٰہیت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی اور اس کا حصول سلطنت کے لیے جدوجہد کرنا بھی محض حفاظت خود اختیاری کے واسطے نہ تھا بلکہ جیسا کہ خود وہ اپنے خطوں میں جا بجا اشارا کرتا ہے[۱] اس کی تہ میں اسلام کی خدمت کا جوش تھا جسے وہ اپنی زندگی کا سب سے مقدس فرض اور خدا کی عین عبادت سمجھتا تھا۔

تخت نشینی

سموگڑھ کی فتح کے بعد اسے سلطنت کی خاطر اپنے بڑے بھائیوں سے دو لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ پہلی شجاع سے، جو اورنگ زیب سے معاہدۂ صلح کرنے کے باوجود[۲] بہار سے فوج لے کر چلا اور دارا کے ملازمین قلعہ داروں کی مدد سے دوآب کے علاقے میں پہنچ گیا تھا۔ اسے خیال تھا کہ اورنگ زیب دارا شکوہ کے تعاقب کی وجہ سے پنجاب و ملتان سے واپس نہ آسکے گا کہ میں آگرے پہنچ جاؤں گا۔ لیکن اس کی سہولت پسندی اور آہستہ خرامی کے مقابلے میں اورنگ زیب دودو منزلیں طے کرتا ہوا اتنا تیز بڑھا کہ ابھی شجاع نے موجودہ فتح پور سے کوئی پچیس میل ہی مسافت طے کی ہوگی کہ عالمگیری ہراول نے ایک منزل آگے آگرے کی شاہ عام روک لی اور چند روز بعد جب خود اورنگ زیب وہاں آیا تو اسی نواح میں وہ جنگ ہوئی جو کھجوا یا کھجوا ہہ کے گاؤں سے منسوب ہے۔ (ربیع الثانی سنہ ۱۰۶۹ مطابق سنہ ۱۶۵۹) شجاع کو سخت ہزیمت ہوئی اور اس کے فرار ہونے کے بعد اورنگ زیب کے سرداروں نے اس کا بنگالے کے مشرقی سرے تک پیچھا نہ چھوڑا حتیٰ کہ وہ ملک اراکان کی غیر آباد پہاڑیوں میں بھاگ کر مفقود الخبر ہو گیا۔

دارا شکوہ جیسے ایسے بلائے بے درماں حریف کے مقابلے میں کہیں جم کر لڑنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، گجرات و وسطی راجپوتانے کے امرا کی مدد سے اجمیر آگیا تھا اور یہیں اس نے اورنگ زیب سے دوبارہ مدافعانہ جنگ کی۔ لیکن

۱۔ مثلاً دیکھو آداب عالمگیری ورق ۲۴۰، وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ عالمگیرنامہ صفحہ ۲۱۱ و ۲۲۳۔

باب ۳

مورچوں پر چند حملوں کے بعد پھر اس کی ہمت نے جواب دیدیا اور وہ سندھ کے راستے فرار ہو کر ایران جانا چاہتا تھا کہ ایک بلوچی رئیس ملک جیون نے اسے اور اس کے بیٹے سپہر شکوہ کو گرفتار کر لیا (رمضان ۱۰۶۹ھ / ۱۶۵۹ء) اور دو مہینے بعد جب وہ دہلی لائے گئے تو دارا کو شورش و فساد کے ساتھ "کفر و الحاد کا فتویٰ" لے کر قتل کرا دیا گیا (ذوالحجہ) اور سپہر شکوہ کی زندگی کے باقی دن گوالیار کے شاہی بندی خانے میں بسر ہوئے۔[1]

اسی سال اجمیر کی فتح کے بعد فاتح کا جشن تاجپوشی دہلی میں منعقد ہوا اور "شاہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر" کے لقب سے خطبہ و سکہ جاری کیا گیا اگرچہ اس کی بادشاہی کو مورخ سال گزشتہ یعنی ۱۰۶۸ھ مطابق ۱۶۵۸ء ہی سے شروع کرتے ہیں۔

مختلف اصلاحات

اس بادشاہ کا طریق نظم و نسق اور ملکی اصلاحات و آئین بھی ایک مذہبی نوعیت رکھتے ہیں۔ جشن تاجپوشی ہی کے زمانے میں اس نے جہاں متعدد غیر شرعی محاصل منسوخ کئے وہیں ایک محکمہ احتساب بھی قائم کیا کہ مسلمانوں کی معاشرت میں جو فواحش و بدعات عام طور پر داخل ہو گئے تھے، ان کا سد باب کیا جائے۔ منسوخ کردہ محاصل کی تعداد اسی کے قریب تھی لیکن غالباً ان میں سے بعض ہنگامی طور پر محض قحط سالی کی وجہ سے موقوف کئے گئے تھے بایں ہمہ جن کی منسوخی مستقلاً عمل میں آئی ان کی آمدنی تیس لاکھ روپے سالانہ کے قریب تھی اور ان میں راہداری، پانداری، (جسے آج کل "نزول" کہتے ہیں) غلے اور کپڑے وغیرہ مختلف اجناس کے محاصل، جن میں تمباکو کا محصول سب سے زیادہ تکلیف دہ تھا، نیز محصول ددآمد قابل ذکر ہیں۔[1]

آمدنی کی ایک مد وہ نذریں اور تحائف تھے جو امرا سالانہ درباروں اور

---

[1] عالمگیر نامہ صفحہ ۱۰۸۲۔ مآثر ۲۰، ۲۷، ۳۰۵ ان معتبر تحریروں کا خافی خاں کے اقوال سے (جلد دوم صفحہ ۸۷، ۸۸) مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مورخ مستقل منسوخی اور ہنگامی منسوخی میں فرق نہیں کرتا اور اس نے سب کو گڈمڈ کر دیا ہے۔

باب ۳

جشنوں کے موقع پر حضور میں گزرانتے تھے۔ اور اس رسم نے رفتہ رفتہ انھیں بھی ایک باقاعدہ محصول بنا دیا تھا جسے نقد وصول نہ ہونے کی صورت میں مقررہ تنخواہ میں سے وضع کر لیا جاتا۔ مگر اس رسم کا سب سے بدتر پہلو یہ ہے کہ یہ امرا جس طرح خود بادشاہ کو نذریں دیتے تھے اسی طرح اپنے اپنے مقام پر اپنے ماتحتوں زمینداروں اور غریب رعایا سے خود وصول کرتے تھے اور اس میں یقیناً بعض اوقات بڑی سختیاں اور ناانصافیاں ہوتی ہونگی۔ اورنگ زیب نے اس رسم کو بالکل اڑا دیا اور جن امرا پر پہلے سے رقوم واجب الادا تھیں انھیں بھی یک قلم معاف کر دیا۔

سب سے زیادہ دشواری بادشاہ کو دربار کی اندرونی اصلاح کے معاملے میں پیش آئی۔ مغلوں کی نسلی بادشاہ پرستی نے ہندوستان کی آب و ہوا میں پرورش پاکر اور یہ دولت و حکومت حاصل کر کے واقعی دربار شاہی کو "پر تکلف بتکدہ" بنا لیا تھا اور اس کی آرائش و تکلفات، عیش و طرب کے سامان دیکھ کر ساسانی درباروں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ اورنگ زیب نے بہت سی رسمیں اور غیر اسلامی بدعات حکماً روک دیں۔ بادشاہ کے سامنے "سری ٹیک" یا زمین بوس کی بجائے محض "سلام علیک" کہنا کافی قرار دیا۔ درشن کی رسم موقوف ہوئی مصوری اور موسیقی کے ساتھ شاعری حتیٰ کہ وہ شاعرانہ تاریخ نویسی بھی، جو ابوالفضل کے زمانے سے نثر میں بادشاہوں کی، قصیدہ خوانی اور مداحی کا آلہ بن گئی تھی، رخصت کر دی گئی اور بادشاہ کے اس انکار نے ہمیں بھی تاریخ کے ایک عمدہ ماخذ سے محروم کر دیا!

مالگزاری

قوانین مالگزاری میں اصولاً اور عملاً اورنگ زیب نے بہت سی مفید اصلاحیں کیں۔ اور اس کا "دستور العمل" اب تک مشہور و محفوظ ہے بادشاہ اور بادشاہی دیوان کی نگرانی بڑھنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر خائن عمال کی رشوتیں اور چوریاں پکڑی گئیں اور وہ صدہا کی تعداد میں برطرف کئے گئے۔ جیسا کہ علامہ شبلی نے جتایا ہے یہ زیادہ تر کایتھ (کالیستھا) قوم کے لوگ تھے اور ان کا تغلب شمالی ہند میں اس قدر مشہور تھا کہ اورنگ زیب نے آخر میں یہ اصول مقرر کر دیا تھا کہ آئندہ سے دفتر دیوانی کے آدھے پیشکار ہندو اور آدھے

مسلمان ہوں'' اورنگ زیب پر اس بے بنیاد اتہام کی کہ اس نے تمام ہندو عہدہ داروں کو محض تعصب مذہبی کی بنا پر موقوف کر دیا تھا' فقط اتنی اصلیت ہے اور یہ بھی محض ایک اصول تھا جس پر کسی خاص اہتمام و شدت کے ساتھ کبھی عمل نہیں ہوا[۲]۔

عہد اورنگ زیبی کی کل مالگزاری کے متعلق اہل تاریخ میں اختلاف ہے لیکن لین پول نے کافی تحقیق و تفصیل سے اس بارے میں بحث کرکے جو نتائج نکالے ہیں' وہ اگر بالکل صحیح نہیں تو قرین صحت ضرور ہیں[۴] اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اکبر کے آخری عہد میں سلطنت کی کل مالگزاری کچھ کم دو کروڑ پونڈ تھی۔ شاہجہاں کے آخری سال حکومت میں یہ مقدار تین کروڑ پونڈ اور اورنگ زیب کے آخری زمانے کے قریب چار کروڑ پینتیس لاکھ پونڈ سے کچھ زیادہ ہوگئی جس کے قدیم اکبری روپے کے حساب سے کوئی ساڑھے چالیس کروڑ روپے ہوئے۔ اس نمایاں اضافے کی سب سے بڑی وجہ تو دکن کی فتوحات اور بیجاپور و گولکنڈے کا الحاق ہے۔ لیکن خوبی انتظام کے ساتھ بعض اور اقتصادی اسباب کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے اول تو یہ کہ اس ایک صدی میں ہندوستان کی مرفہ الحال آبادی کم و بیش دگنی ہوگئی ہوگی۔ اور اسی نسبت سے مزروعہ رقبے میں اضافہ ہوا ہوگا۔ اگرچہ یہ ظاہر ہے نئی زمینیں ان اراضی کے برابر حاصل خیز نہ ہوگی جنھیں آبادکاروں نے پہلے سے انتخاب کر لیا تھا؛ دوسرے اتنی مدت تک ایک خاندان کی مستقل و منتظم حکومت نے لازمی طور پر سکۂ رائج الوقت میں کثرت پیدا کر دی ہوگی جس کے سبب سے اجناس میں قدرے گرانی کا ہونا اور اسی مناسبت سے روپے کی قوت خرید کا گھٹ جانا لازمی ہے۔ پس قرینہ کہتا ہے کہ اسی پیداوار جس کی پہلے بازار میں

ا۔ دیکھو منتخب اللباب ۔ جلد دوم صفحہ ۲۵۲ ۔ مولوی شبلی صاحب مرحوم نے اس بارے میں مفصل بحث کے بعد ایک طویل فہرست خاص اورنگ زیب کے بڑے بڑے ہندو عہدہ داروں کی درج کی ہے (''عالمگیر پر ایک نظر'' ۶۰ تا ۶۷) جو مذکورۂ بالا اتہام کی صریح و مسکت تردید ہے۔

۲۔ ''اورنگ زیب'' باب ہفتم۔

باب ۳

قیمت کم اور اس لیے شرح مالگزاری بھی کم تھی؛ اب سرکاری محصول ایک حد تک بڑھا دیا گیا ہوگا۔

دیگر محاصل اور جزیہ

غرض بظاہر یہی اسباب ہیں جنھوں نے اورنگ زیب کے زمانے میں صرف زرعی مالگزاری کو عہد اکبری کی نسبت دوچند سے بھی زیادہ کر دیا تھا۔ ورنہ طبعاً و اصولاً وہ رعایا کے ساتھ تاامکان رعایت و فیاضی کا برتاؤ کرتا تھا اور ماتحت عہدہ داروں پر اس قسم کی تاکید و تنبیہ کی بہت سی مثالیں ہمعصر تواریخ اور اس کے رقعات و خطوط میں محفوظ ہیں۔ البتہ غیر شرعی محاصل کو منسوخ کرنے اور نیز بہت سی اندرونی اصلاحات کے بعد جب نظم و نسق اسلامی قوانین حکومت کے مطابق ہوگیا تو اس نے مسلمانوں سے زکواۃ فرضی کی وصول یابی کی طرح غیر مسلموں پر جزیہ عائد کیا (سنہ ۱۰۹۰ھ / ۱۶۷۹ء) جو اکبر کے زمانے سے موقوف تھا۔ اس محصول سے ہر قسم کے سرکاری ملازمین محتاج و غیر پیشہ ور (ہندو) نیز بعض مذہبی اور غیر ملکی لوگ مستثنیٰ تھے۔ اور اس کی شرح صرف ۳ ۱/۳ روپے سے ۱۳ ۱/۳ روپیہ سالانہ تک تھی جو حسب حیثیت ہر غیر مسلم مرد (بالغ) کو ادا کرنی پڑتی تھی[۱]۔ بالفاظ دیگر دولتمند سے دولتمند ذمّی کو زیادہ سے زیادہ سے صرف ایک روپیہ اور دو آنے مہینہ سرکار کو ادا کرنا پڑتا تھا اور معمولی درجے کے لوگوں سے فقط چند آنے (ماہوار) وصول کیے جاتے تھے جس کے معاوضے میں فوجی خدمت سے مستثنیٰ کر کے حکومت ان کی حفاظت جان و مال کا ذمہ لیتی اور اسلامی قواعد کے مطابق مذہبی آزادی دیتی تھی[۲]۔

---

[۱] دیکھو سرکار کی تاریخ اورنگ زیب جلد سوم صفحہ ۳۰۵ تا ۳۰۷ وغیرہ۔ نیز لین پول کی کتاب اورنگ زیب صفحہ ۸ و ۱۱۔ یہی وہ محصول ہے جس کے اجرا و تجدید پر اورنگ زیب کو آج کل صد ہا صلواتیں سنائی جاتی ہیں اور اس جوش تعصب میں اس بات کو بھی یہ محقق بھول جاتے ہیں کہ اس نے بہت سے محاصل معاف کر دئے تھے!

[۲] اورنگ زیب کے مذہبی تعصبات اور جوش بت شکنی کے متعلق انگریزی تاریخوں میں عجیب عجیب افسانے شائع کر دیے گئے ہیں اور بعض ہندوستانی اہل الرائے اس افترا پردازی کو سیاسی مصالح پر

باب ۳ بعض اندرونی شورشیں

اورنگ زیب کے طویل اور قریبی عہد حکومت کی خاصی مفصل تاریخیں موجود ہیں، اور چونکہ یہ مورخ خاص درباری یا بادشاہ کے مقرب اور اعلیٰ عہدہ دار نہیں ہیں، اس لیے ان میں آج کل کے اخبارات کی طرح بعض عام جزئی اور ملکی خبریں بھی تحریر ہیں جن سے اس عہد کے ہندوستان اور امن وانتظام کا اندازہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن ہمیں ان مورخوں کے پیرایۂ بیان سے دھوکا نہ کھانا چاہئے اور نہایت احتیاط سے اصلی واقعات کو مورخ کے ذاتی جذبات وآرا کے غلاف سے باہر لانے کی کوشش کرنی چاہیئے ورنہ سخت مغالطہ ہوگا۔ مثلاً اورنگ زیب وشاہجہاں

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: مبنی سمجھتے ہیں۔ اس قسم کے الزامات کا مولوی شبلی صاحب نے اپنے رسالے "اورنگ زیب پر ایک نظر" میں محققانہ رد لکھا ہے۔ ہماری کتاب میں اس بحث کو چھیڑنے کا موقع نہیں مگر مختصر طور پر اتنا لکھنا مناسب ہوگا کہ اورنگ زیب ایک عالم باعمل مسلمان تھا اور اس معاملے میں بھی اس کا طرز عمل اسلامی تعلیم کے مطابق تھا۔ اس تعلیم کے بارے میں ہم گزشتہ اوراق میں اجمالاً بیان کر چکے ہیں کہ یہ مضحکہ انگیز الزام محض ناواقفیت یا سراسر دروغ گوئی ہے کہ اسلام غیر مسلموں کو جبراً مسلمان بنانے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے برعکس، اسلامی حکومت اگرچہ بت پرستی کی علانیہ تبلیغ وترویج کو جائز نہیں رکھتی۔ لیکن امن وصلح کے بعد ہرگز اپنی رعایا کے معتقدات سے تعرض نہیں کرتی اور انھیں اپنے گھروں میں یا پہلے سے جو معبد موجود ہیں ان میں جس طرح وہ چاہیں، عبادت وپرستش کی بالکل آزادی دیتی ہے۔ ٹھیک یہی احکام اورنگ زیب کے اس مشہور فرمان میں درج ہیں جو اس نے بنارس کے حاکم کے نام بھیجا تھا اور وہاں کے پجاری برہمنوں کے قدیم حقوق وآزادی کو بحال رکھنے کی تاکید کی تھی؛ اس فرمان کی عکسی تصویر چند سال ہوئے کامریڈ کے لائق اڈیٹر نے شائع کی تھی۔ اس کے انگریزی ترجمے کا اقتباس بابو جادوناتھ سرکار نے بھی اپنی تاریخ اورنگ زیب میں نقل کیا ہے (جلد سوم صفحہ ۳۱۹) البتہ یہ بالکل صحیح ہے کہ حالت جنگ میں اس قسم کی مذہبی دل آزاریوں کی کہیں کہیں مثالیں محفوظ ہیں۔ زیر نظر عہد میں بھی راجپوتانے یا دکن کی لڑائیوں میں اکثر اپنے ہندو حریفوں کی اسی قسم کی زیادتیوں کے جواب میں مندر توڑے گئے اور اگر کسی علاقے میں مسلمانوں کی قلت آبادی کی وجہ سے ان کی دو چار مسجدیں منہدم ہوئی تھیں تو اس کے بدلے میں صرف وہاں کے بہت سے مندر مسلمانوں کے جوش انتقام کی نذر ہوئے۔

باب ۳

نیز جہانگیر کے عہد حکومت کی تاریخوں میں ہم جا بجا ایسی مقامی شورشوں اور ہنگاموں کا حال پڑھتے ہیں جن کے بیان کرنے میں تاریخ لکھنے والوں نے ورق کے ورق سیاہ کر دیئے ہیں حالانکہ ان کی وقعت ایسے ہنگاموں سے کچھ زیادہ نہ تھی جیسے کہ آج کل کسی عید یا محرم کی لڑائی یا سیاسی شور و شغب اور ہڑتال کی صورت میں رونما ہوتے رہتے ہیں۔ یہ فرق ضرور رہے کہ ان دنوں اہل ہند عام طور پر اسلحہ رکھتے اور ان کا استعمال جانتے تھے اور اس زمانے کی نسبت زیادہ جنگجو اور باغیرت تھے۔ ان کے خاندانوں یا برادریوں میں بھی بہت اتحاد اور یک جہتی تھی لہٰذا کسی معمولی غلط فہمی یا چھوٹی سی بات پر ایسے جھگڑے جن کا آج کل نتیجہ فوجداری نالش ہوا کرتا ہے، ان دنوں زیادہ سنگین معاملے بن جاتے تھے۔ چنانچہ متھرا کے جاٹوں (۱۶۶۹ء)، نارنول کے ستنامیوں (۱۶۷۲ء) اور برہانپور کے تعزیے نکالنے والوں کے ہنگامے اسی قسم کے تھے جن میں بعض اوقات مقامی پولس یا ضلع کی متعینہ جمعیت سے کام نہ چل سکا اور دوسرے شہروں سے فوج بھیجکر انھیں فرو کیا گیا؛ البتہ سرحد کابل کے افغانوں اور میواڑ و مارواڑ کے راجپوتوں کی بغاوتیں ان سے مختلف نوعیت رکھتی ہیں اور ان کے فرو کرنے کے واسطے خود شہنشاہ کو مقام شورش کے قریب رہ کر چند روز تک خود نگرانی رکھنی پڑی۔

افغان و راجپوت

واضح رہے کہ یہ دونوں قومیں آزادی پسند، جنگجو اور سپاہی پیشہ تھیں۔ ان کے ملک دشوار گزار تھے اور بالخصوص افغانی قبائل اکبر کے زمانے سے اب تک برابر اپنی خود مختاری کے لیے لڑتے اور کبھی کبھی شاہی علاقوں پر بھی ہاتھ مار جاتے تھے چنانچہ ان کی اس شورہ پشتی میں آج تک کوئی نمایاں تغیر نہیں ہوا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ان کی یہ خصوصیات خود اس ملک کی معاشرت اور آب و ہوا کا نتیجہ ہیں اور بظاہر جب تک یہ قدرتی اسباب نہ بدلیں گے ان کی خو خصلت بھی نہ بدلے گی؛ بایں ہمہ اورنگ زیب جیسے مستقل مزاج و منتظم فرماں روا کے مقابلے میں ان کی شورش کچھ زیادہ وسعت و پائداری نہ حاصل کر سکی اور اس نے حسن ابدال میں خود پہنچکر (۱۶۷۴ء) جا بجا ایسی فوجی چوکیاں اور تھانے قائم کئے کہ پھر مدت دراز تک ان قبایل کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔ بادشاہی سردار

باب ۴

آغر خاں نے انھیں گھیر گھار کر اس بری طرح مارا تھا کہ مشہور ہے کہ مدتوں تک افغان عورتیں بچوں کو اس کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں۔

راجپوتانے کی شورش اس سے چند سال بعد کا قضیہ ہے جسے انگریزی تاریخوں میں مضحکہ انگیز مبالغوں کے ساتھ ہندو مسلمانوں کی ایک مذہبی لڑائی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ معمولی غلط فہمیوں کی بنا پر پیدا ہوئی اور حسب دستور سال دو سال کی جنگ و جدال کے بعد فرو ہو گئی۔[۱] شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ ۱۰۹۰ھ؍۱۶۷۹ء کے اواخر میں مارواڑ (جودھپور) کے راجہ جسونت سنگھ نے کابل میں وفات پائی۔ اور اس خبر نے اس کی ریاست (مارواڑ) میں تلاطم ڈال دیا۔ چونکہ وفات کے وقت اس کا کوئی بیٹا یا جانشین نہ تھا، لہٰذا معلوم ہوتا ہے اب ہر راجپوت رئیس اس کی جگہ لینے کا مدعی اور ایک ہندو مورخ کے الفاظ میں حصول اقتدار کی خاطر "شورش و فساد برپا کرنے پر آمادہ تھا"۔ نظر بریں اورنگ زیب نے جانشینی کا فیصلہ ہونے تک بعض شاہی عہدہ داروں کو جودھپور بھیج دیا کہ ان مفسدوں کو قابو میں رکھیں اور کچھ روز بعد (ربیع الآخر ۱۰۹۰ھ؍۱۶۷۹ء) جسونت سنگھ کے بھتیجے اندر سنگھ کو "خطاب راجگی و خلعت خاصہ و شمشیر با ساز مرصع ...... و علم و طوغ و نقارہ ......" دیکر مارواڑ روانہ کیا۔[۲]

اس اثنا میں جسونت سنگھ کے ماتحت سردار، اس کی فوج اور اہل خاندان کو لے کر بادشاہی اجازت کے بغیر کابل سے چل دیے اور دریائے سندھ پر ان سے پروانۂ عبور مانگا گیا تو لڑ کر زبردستی پار ہو گئے تھے۔ پھر اسی زمانے میں معلوم ہوا کہ متوفی راجہ کی دو رانیاں حاملہ ہیں اور لاہور پہنچ کر ان کے دو بیٹے ہوئے۔

[۱] سرکار جلد سوم صفحہ ۳۶۷ بحوالۂ ایشور داس۔

[۲] مآثر عالمگیری صفحہ ۱۷۵۔ یہ مسلمہ واقعات ہیں لیکن بابو جادو ناتھ سرکار نے انھی کو حیرت انگیز طریق پر مسخ کیا ہے اور بعض مقامات پر معلوم ہوتا ہے تعصب ذاتی کی رو میں بابو صاحب متانت و عقل کی حدود سے باہر نکل گئے ہیں۔

باب ۱۰

اور وہاں سے یہ قافلہ دہلی پہنچا۔ اب راجپوت سردار جن میں سب سے پرجوش وفتنہ انگیز درگاداس (یا درگ داس) راٹھور تھا، اصرار کر رہے تھے کہ ان میں سے کسی بچے کو جودھپور کا راجہ تسلیم کرلیا جائے اور بادشاہ جو ان کی ناسزا حرکات سے ناخوش تھا، ایسے چھوٹے بچوں کو راجہ بنانے میں قدرۃً متامل تھا جس کے معنی یہ ہوتے کہ درحقیقت درگاداس اور اس کے شورہ پشت ساتھیوں کے ہاتھ میں ریاست کی باگ آجائے۔ بایں ہمہ اس نے حکم دیا کہ دستور کے مطابق یہ بچے شاہی نگرانی میں پرورش و تربیت کئے جائیں اور جب "وہ بہ سن تمیز خواہند رسید بہ عنایت منصب و راج نوازش خواہند یافت"[۱]

لیکن اس فیصلے نے درگاہ داس وغیرہ کے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا اور اب وہ محض سرکشی اور خود غرضی سے اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ ایک بچے کو (دوسرا انھی دنوں میں مرگیا تھا) جس طرح بنے لے کر جودھپور فرار ہو جائیں اس سازش کی خبر سن کر ان کی قیام گاہ پر پہرہ قائم کر دیا گیا تھا لیکن اہل سازش نے رانیوں کو جو ساتھ نہ چلیں یا نہ چل سکتی تھیں بیدردی سے قتل کر ڈالا اور بچے کو لے کر جس طرح ہو سکا فرار ہو گئے۔ مآثر عالمگیری کی روایت یہ ہے کہ وہ اصلی بچہ نہ لے جا سکے تھے بلکہ جودھپور پہنچکر انھوں نے ایک اور بچے کو پیش کیا کہ جسونت سنگھ کا بیٹا اور اس کے راج کا اصلی وارث یہ ہے۔

اب درگاہ داس حکومت سے علانیہ منحرف تھا۔ (۱۰۹۰ھ / ۱۶۷۹ء) بہت سے راجپوت سپاہی جنھیں معمولی تحریک جوش دلانے اور لڑا دینے کے لیے کافی تھی، اس کے ساتھ ہو گئے تھے اور جب مارواڑ میں انھیں پیہم شکستیں ہوئیں تو مہا رانا اودے پور ان کا حامی و مددگار بن گیا اور اسی ضمن میں اس نے جزیہ کے جدید مطالبے کو ماننے سے بھی انکار کر دیا۔ یہی واقعہ ہے جس کی بنا پر انگریزی "محققین" نے اسے ایک مذہبی جنگ بنا دیا ہے خاص کر ٹاڈ نے تو اس جوش و خروش سے اس جنگ کے افسانے لکھے ہیں گویا یہ خود اس کی قوم کی صلیبی لڑائیاں تھیں!

۱۔ مآثر عالمگیری ۱۷۸۱

مگر افسوس ہے کہ ایک ہی واقعہ اس تمام طلسم خیالی کو باطل کرنے کے لیے کافی ہے اور وہ یہ کہ بغاوت کے سب سے بڑے سرغنہ، یعنی درگا داس اور مہارانا اودے پور چند ہی ماہ کی لڑائیوں کے بعد شہزادۂ اکبر سے ساز باز کرنے لگے اور اپنے باپ سے انحراف کرنے کی شرط پر انھوں نے کمال گرمجوشی کے ساتھ اس کی اطاعت کا پختہ عہد و پیمان کیا کہ جب تک جان میں جان ہے تمھارے (یعنی شہزادۂ اکبر کے) حلقہ بگوش و فرماں بردار رہیں گے اور سلطنت حاصل کرنے کے لیے تمھاری طرف سے حریفوں سے جنگ کریں گے۔[۱]

بہ الفاظ دیگر یہ مسلمانوں سے مذہبی لڑائی نہ تھی بلکہ محض بغاوت کی سزا سے بچنے کے لیے، حکومت وقت کو بدلنے کی کوشش تھی جس سے لڑائی چھیڑنے کا سبب بھی عود اعی کی سرکشی اور ہوس حکومت کو سمجھنا چاہیے۔

نوجوان اکبر اورنگ زیب کا منجھلا بیٹا اور باغی راجپوتوں کے استیصال کے لیے جو مہم روانہ کی گئی اس کا سپہ سالار تھا لیکن جب میواڑ میں اسے خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی اور کسی قدر معتوب ہو کر وہ مارواڑ کے علاقے میں متعین کیا گیا تو یہاں اس نے درگا داس وغیرہ کے اغوا اور سلطنت کے لالچ میں باپ سے بغاوت کی اور اپنی بادشاہی کا اعلان کر کے خود اورنگ زیب کے خلاف بڑھا جو ان دنوں اجمیر میں مقیم تھا (سنہ ۱۰۹۱ھ ۱۶۸۰ء) بادشاہ کے پاس بہت کم فوج تھی اور اکبر کی بغاوت نے رفقائے شاہی میں سخت انتشار ڈال دیا تھا لیکن اورنگ زیب ان سب مشکلات پر غالب آیا اور باغی شہزادے نے شکست کھائی۔ پھر وہ دو سال تک راجپوتانہ اور دکن میں منہ چھپاتا پھرا اور آخر ایران کے علاقے میں فرار ہو گیا (سنہ ۱۰۹۳ھ ۱۶۸۲ء) اور وہیں وفات پائی۔

باغی راجپوتوں کو چند مہینے کی مزید جنگ و جدال نے مایوس و مجبور کر دیا

---

[۱] ان واقعات کی صحت میں کسی کو بھی شک نہیں ہے دیکھو سرکار، جلد سوم، باب سی و ہفتم۔

ابطہ

مارواڑ کے علاقے پر جابجا شاہی دستے قابض ہو گئے اور آخر میں اودے پور کے مہارانا نے بھی بکمال ندامت و لجاجت کے ساتھ معافی مانگی اور محصول جزیہ کو نقد ادا کرنے کے عوض اپنے دو پرگنے بادشاہی حکام کے حوالے کر دیئے [1] (جمادی الآخر ۱۰۹۲ھ ۱۶۸۱ء) غرض یہ شورش و بغاوت دو سال کے اندر فرو ہو گئی، اور آئندہ نہ صرف یہ کہ راجپوتانے میں کوئی قابل ذکر شورش و فساد نہ برپا ہوا بلکہ بہت سے راجپوت سردار و سپاہی اپنی پہلی سی اطاعت و سرفروشی کے ساتھ اورنگ زیب کے محاربات دکن میں اس کے ماتحت لڑتے اور بادشاہی انعام و اکرام حاصل کرتے رہے [2]

معاملات دکن

شہزادۂ اکبر نے اول دکن میں سنبھاجی کی پناہ لی اور دکن کی اسلامی ریاستوں سے بھی سازباز میں مصروف تھا۔ یوں بھی دکن کے معاملات بہت دن سے الجھے ہوئے تھے۔ سرحدی تنازع پیش کش سالانہ کے ادا کرنے میں لیت و لعل اور اسی قسم کے دیگر معمولی اسباب مخاصمت کے علاوہ پونا میں ساہوجی بھونسلہ کے مشہور فرزند سیواجی کی نوخیز قوت نے سیاسیات دکن میں

---

[1] مآثر عالمگیری صفحہ ۲۰۰ وغیرہ نیز دیکھو سرکار (جو مسخ کرنے کے باوجود مسلّمہ واقعات سے ٹاڈ کی طرح انکار نہیں کر سکا) جلد سوم صفحہ ۴۲۱۔

[2] مولوی شبلی صاحب مرحوم نے اورنگ زیب کے جن ہندو سرداروں کی فہرست اور مختلف کیفیت اپنے رسالے میں درج کی ہے (صفحہ ۷۰) ان میں سب سے اول اودے پور کے رانا کے بیٹے راجہ بھیم سنگھ کا نام ہے جو مرتے دم (یعنی ۱۱۰۶ھ) تک دکن کی لڑائیوں میں شریک رہا اور پنج ہزاری کے منصب تک ترقی کی (مآثر عالمگیری صفحہ ۳۶۹ وغیرہ) اسی طرح اودے پور ہی کے اور کئی راجکماروں کے ملازمت شاہی میں کارگزاری دکھانے اور ترقی پانے کا ذکر آتا ہے۔ لیکن ان صریحی شواہد و واقعات کے باوجود دوسرے انگریز مورخوں کا تو کیا ذکر ہے بابو سرکار صاحب تک کمال دیدہ دلیری سے تحریر کرتے ہیں (جلد سوم ۴۲۵) کہ ہاڑا، کچھوا، اور بندیلہ قوم کے راجپوتوں کے سوا اور کسی راجپوت سردار نے مذکورۂ بالا جنگ کے بعد اورنگ زیب کی رفاقت نہیں کی!

باب ۳

مزید پیچیدگیاں ڈال دی تھیں اور ان سب قضیوں کے انفصال کی بہترین صورت یہی تھی کہ خود بادشاہ نے راجپوتانے کی شورش رفع دفع ہونے کے بعد ادھر کا رخ کیا اور کچھ عرصے برہانپور ٹھیر کر ۱۰۹۲ھ (۱۶۸۲ء) کے اواخر میں اورنگ آباد پہنچ گیا۔

اورنگ زیب کو دکن کے معاملات سے نہایت عمدہ واقفیت تھی اور جوانی کا اکثر حصہ یہاں گزارنے کی وجہ سے اس کو بالخصوص اپنے آباد کردہ شہر (اورنگ آباد) سے بہت انس ہو گیا تھا۔ کشورکشائی کے موروثی جذبات اور عہد اکبری سے الحاق دکن کی جو تمہید پڑ چکی تھی، اس کی تکمیل کے شوق سے بھی وہ معرا نہ تھا اور اس کی نسبت بیجاپور اور گولکنڈے سے تعصب وعداوت کا جو الزام لگایا جاتا ہے وہ بھی بے بنیاد نہیں ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تعصب دردمندی اور غیرت اسلامی پر مبنی تھا کہ حکومت بیجاپور کی بدنظمی اور قطب شاہی دربار کے فسق وفجور کا حال سن کر اسے سخت طیش آتا تھا کہ یہ خوش منظر و حاصل خیز ملک ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو نظم ونسق کی مطلق صلاحیت نہیں رکھتے اور اپنی بدعنوانیوں سے اسلام اور مسلمانوں کو خراب و رسوا کر رہے ہیں۔ انھی کی کمزوری اور نا اہلی کا ایک نتیجہ یہ ہوا تھا کہ پونا کی نئی مرہٹہ ریاست روزافزوں قوت واستقلال حاصل کرتی جاتی تھی اگرچہ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ سیواجی کو خود مغلوں کی فتح دکن کے منصوبوں سے بھی بالواسطہ مدد اور تقویت پہنچتی رہی اور جب کبھی حکومت بیجاپور نے اسے پامال کرنے کا سامان کیا، وہ مغلوں کی پناہ میں آ گیا۔

سیواجی مرہٹہ

یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ساہوجی بھونسلہ کی دولت آباد کی نظام شاہی حکومت کے احیا میں ناکامی کے بعد آخر کار بیجاپور میں ملازمت کی اجازت مل گئی تھی اور اب وہ اسی دربار کا ایک معزز جاگیردار تھا۔ لیکن اس کی زندگی ہی میں اس کے چھوٹے بیٹے سیواجی نے (ولادت ۱۰۳۶ھ / ۱۶۲۷ء) باپ کی پہاڑی اور رو و رودست جاگیر (واقع کوکن) میں جوان ہو کر بیجاپور کے اکثر

باب ۲

دیہات لوٹے اور قریب کے بعض چھوٹے قلعوں پر قابض ہو گیا بیجاپور کے حکام اول اول کچھ اپنی بے پروائی کچھ اس کے باپ کے رسوخ و اثر کی وجہ سے اسے طرح دیتے رہے لیکن اورنگ زیب شروع سے اس کے مزاج و میلان کا صحیح اندازہ کر چکا تھا اور جب اس نے مغلوں کے علاقے میں بھی قزاقانہ چھاپے مارے تو اورنگ زیب نے اس کا فوری تدارک کیا اور ایک فوجی دستہ بھیج کر سیواجی کو قبول اطاعت پر مجبور کیا تھا۔ پھر بیجاپور سے صلح (۱۰۶۷ھ / ۱۶۵۷ء) کے وقت بھی اس نے عادل شاہی دربار کو تاکید کی تھی کہ سیواجی کو سزا دی جائے یا کم سے کم اسے کوکن سے ہٹا کر سرحد مغلیہ سے کسی بعید علاقے میں جاگیر دیدی جائے۔[1]

اس قسم کی ہدایتوں پر فوری توجہ کرنے کی تو اہل بیجاپور میں صلاحیت نہ تھی لیکن جب اورنگ زیبی انتظامات نے سیواجی کو مغلوں کے علاقے میں بڑھنے سے روک دیا اور بیجاپور کے اضلاع ہی میں اس نے وسیع پیمانے پر تاخت و تاراج شروع کی نیز بیجاپوری سپہ سالار افضل خاں کو جو اس کے استیصال کے لیے مامور ہوا تھا، فریب سے قتل کر دیا تو خود علی عادل شاہ ثانی کو اس پر فوج کشی کرنی پڑی (۱۰۷۰ھ / ۱۶۶۰ء) اور سیواجی نے بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ لی پھر کچھ حکومت کے اندرونی خلفشار کچھ ساہوجی کی سعی سفارش سے اسے معافی مل گئی تو اس نے دوبارہ پہلے سے کہیں زیادہ قوت و جمعیت کے ساتھ مغلوں کے علاقے پر چھاپے مارنے شروع کئے اور اس زمانے کی مشہور مغربی بندرگاہ سورت کو بھی یکایک حملہ کر کے لوٹ لیا۔ (۱۰۷۴ھ / ۱۶۶۴ء)۔

اس سے کچھ پہلے ساہوجی بھونسلہ وفات پا چکا تھا اور اب سیواجی کو خود مختاری کا دعویٰ تھا۔ کم سے کم وہ ریاست بیجاپور کے قابو سے بالکل باہر ہو چکا تھا۔ لہٰذا اورنگ زیب نے اسے سزا دینے کے لیے دربار کے معزز امیر

---

[1] سرکار، جلد اول صفحات ۲۸۲ و ۲۶۷۔

باب

راجہ جے سنگھ اور مشہور سپہ سالار دلیر خاں کو دکن بھیجا جنھوں نے چند مہینے میں سیواجی کا قریب قریب تمام علاقہ اور قلعے چھین لیے اور یہ محض راجہ جے سنگھ کی مروت و رعایت تھی کہ اسے دوبارہ قبول اطاعت اور تقریباً دو تہائی علاقہ حوالے کر دینے کے عوض میں معافی دیدی گئی۔ اور آیندہ بیجاپور کے خلاف لڑائیوں میں وہ مغلوں کا مددومعاون بن گیا۔ اس کے صلے میں سیواجی کے فرزند سنبھاجی کو جو باپ کی طرف سے خود شریک جنگ تھا دربار مغلیہ سے پنجہزاری منصب عطا ہوا اور آیندہ سالانہ دربار میں شرکت کی غرض سے دونوں باپ بیٹے آگرے آئے اور نذر پیش کرنے کا شرف حاصل کیا (۱۶۶۶ء) لیکن معلوم ہوتا ہے یہاں سیواجی کی اتنی خاطر مدارات نہیں ہوئی جس کی اسے توقع تھی لہذا وہ چھپکر آگرے سے فرار ہو گیا۔ بایں ہمہ سلطنت مغلیہ کی قوت و عظمت دیکھ کر اب وہ اس بات کو سمجھ گیا تھا کہ اگر محض قزاقی کی بجائے کوئی مستقل حکومت و ریاست قائم کرنی ہے تو مغلوں کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو مصالحت سے کام لینا چاہیئے چنانچہ اس نے دکن پہنچ کر دکن کے مغل صوبہ دار کی وساطت سے بادشاہ سے معافی مانگ لی اور چند سال تک خاموشی سے اپنی ریاست کا اندرونی انتظام کرتا رہا[1]۔

فتوحات دکن۔

سیواجی نے کچھ عرصے بعد پھر عہد و پیمان کی خلاف ورزی کی تھی اور مغلیہ علاقوں کی تاخت و تاراج کا سلسلہ اس کی وفات (۱۶۸۰ء) کے بعد بھی جاری رہا۔ دوسرے اس کے جانشین سنبھاجی نے شہزادۂ اکبر کو اپنے ہاں پناہ دی جس سے اندیشہ ناک پیچیدگیاں پیدا ہونے کا امکان تھا۔ میں

---

[1] سرکار جلد چہارم صفحہ ۹۷ وغیرہ۔ مغلیہ دربار میں جانے اور وہاں سے فرار ہونے کے متعلق بھی انگریزی تاریخوں میں عجیب عجیب افسانے اور بادشاہ پر لغو الزامات تراشے گئے ہیں جن کی مولوی شبلی صاحب نے اپنے رسالے میں تردید کی ہے اس جگہ ان واقعات پر مفصل بحث کرنا بے محل اور موجب طوالت ہوگا۔

بیجاپور و گولکنڈہ کے معاملات طے کرنے کے علاوہ اورنگ زیب کے دکن آنے کا تیسرا مقصد یہ تھا کہ مرہٹوں کی اس سرکشی اور لوٹ مار کا خاطر خواہ تدارک کر دیا جائے۔

جب ۱۶۸۲ء میں شہنشاہ دکن آ گئے تو مرہٹوں کے خلاف سخت معرکے شروع ہو گئے۔ کوکن میں جہاں مرہٹوں کے قلعے تھے یورشیں ہونے لگیں۔ ایک فوج شاہزادۂ اعظم اور دوسرے نامی سپہ سالاروں کے ساتھ شمالی کوکن بھیجی گئی اور قلعہ رام سیج کا محاصرہ ہوا جو ناسک کے قریب ہے اور دوسری فوج شاہزادۂ معظم کے ماتحت مغربی کوکن کے قلعوں پر حملہ آور ہوئی لیکن کوکن کے دشوار گزار جغرافیے کی وجہ سے یہ دونوں مہیں ناکام ہوئیں اور ناچار یہ فوجیں احمد نگر ہٹ آئیں۔ ایک سال شہنشاہ نے سکوت اختیار کیا اور ۱۶۸۴ء میں پھر فوجی تیاریاں شروع ہوئیں لیکن اس وقت مرہٹوں کی مزاحمت کے بجائے شہنشاہ نے بیجاپور اور گولکنڈے کی سلطنتوں پر پہلے حملہ کرنا ضروری سمجھا شہنشاہ کو یہ محسوس ہوا کہ جب تک ان سلطنتوں کا خاتمہ نہ ہو جائے مرہٹوں کی سرکوبی ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ سلطنتیں اپنے بچاؤ کے لیے مرہٹوں کی تائید کرتی تھیں اور مرہٹوں کا بھی اس میں بہت فائدہ تھا اس لیے جو فوجیں مرہٹوں کی مقاومت میں مصروف تھیں وہ بیجاپور اور گولکنڈے پر حملہ کرنے کے لیے بھیجی گئیں شاہزادۂ اعظم بیجاپور کے لیے اور معظم گولکنڈے کے لیے مقرر ہوا۔ اگرچہ یہ دونوں سلطنتیں بہت کچھ فرسودہ ہو چکی تھیں لیکن ان کی قوت مدافعت میں فرق نہیں آیا تھا۔ اور مرہٹوں کی تائید علٰحدہ صورت حال پیچیدہ بنا لی تھی اس طرح ان سلطنتوں کی تسخیر آسان نہ تھی۔ جب بیجاپور کا محاصرہ شروع ہوا تو ایک طرف بیجاپوری فوج نے حملہ کیا تو دوسری طرف سے مرہٹوں نے تاخت و تاراج شروع کر دی اور مغل فوجوں کے لیے سخت دشواریوں کا سامنا تھا اور بروقت امداد نہ پہنچتی تو مغل فوجوں کا بالکل خاتمہ ہو جاتا۔ دو مہینے بارہ روز کے محاصرے کے بعد بیجاپور کا قلعہ فتح ہوا اور عادل شاہی خاندان کا آخری تاجدار سکندر عادل شاہ مغل امرا میں

داخل ہو گیا ۱۶۸۶ء

کچھ دنوں کے وقفے سے گولکنڈے کی مہم روانہ ہوئی تھی۔ گولکنڈے کی تسخیر بیجاپور سے بھی زیادہ کٹھن ثابت ہوئی۔ بیجاپور تو خانہ جنگیوں کا شکار ہو چکا تھا اور اس کی قوت مدافعت اندرونی خلفشار کے نذر ہو چکی تھی اس لیے صرف دو مہینے کے محاصرے میں اس کا خاتمہ ہو گیا لیکن گولکنڈے کی حالت دوسری تھی اس کے پرسکون حالات کی وجہ سے اس میں لڑنے کا کافی دم خم تھا۔ ملکھیڑ پر پہلا مقابلہ ہوا لیکن یہاں قطب شاہی فوجوں کو شکست ہوگئی اور مغلوں نے حیدرآباد کی طرف پیش قدمی کی۔ چونکہ شہر بالکل کھلا ہوا تھا اس لیے ابوالحسن قطب شاہ شہر کو مغل حملہ آوروں کے حوالے کر کے قلعہ گولکنڈہ میں محصور ہو گیا اور شہزادہ معظم سے صلح کی سلسلہ جنبانی شروع کی۔ شہزادہ صلح کی طرف مائل تھا لیکن شہنشاہ صلح کے بہت مخالف تھے بیجاپور کی تسخیر سے فارغ ہو کر حیدرآباد پہنچ گئے اور قلعے کا محاصرہ شروع کر دیا۔ جو بہت کٹھن ثابت ہوا۔ اس میں مغلوں کی بڑی بڑی فوجیں اور بڑے سپہ سالار کام آئے۔ پورے آٹھ مہینے اس محاصرے میں صرف ہوئے اور تسخیر بھی اس طرح ہوئی کہ چند بیوفاؤں نے قلعے کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اس طرح گولکنڈے کا محاصرہ مغل تاریخ کے اہم واقعات میں سے ہے ہندوستان کی تاریخ میں ایسے واقعات بہت کم ہوئے۔ ابوالحسن قطب شاہ نے جس اولوالعزمی کے ساتھ اپنے کو مغلوں کے حوالے کیا تھا اس کی بھی مثال نہیں ملتی یہ دولت آباد کے قلعے میں نظر بند کر دیا گیا۔ اسی وجہ سے گولکنڈے میں بیجاپور کے ساتھ ۱۶۸۷ء میں مغل سلطنت میں ضم کر لیا گیا۔

گولکنڈے کی تسخیر کے بعد مغل فوجیں مرہٹوں کی سرکوبی کی طرف متوجہ ہوئیں شہنشاہ حیدرآباد سے بیدر اور اس کے بعد بیجاپور پہنچ گئے۔ فیروز جنگ کو قلعۂ ادھونی کے لیے اور شہزادۂ اعظم کو سنبھاجی کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ قلعہ ادھونی تو اسی سال فتح ہو گیا لیکن سنبھاجی کی گرفتاری میں دو سال لگ گئے اس کی عیش پسندی اور تساہل کی وجہ سے مغلوں کو موقع مل گیا۔ شیخ نظام حیدرآبادی نے جو قلعۂ پرنالہ کی تسخیر میں مصروف تھا اس کے ٹھکانے کا پتا لگایا۔ معلوم ہوا کہ

یہ قلعہ کھیلنا میں ہے۔ مغل فوجوں نے ڈھا دیا کر دیا۔ اسی قلعے کے قریب یہ اور اس کے تمام اہل و عیال گرفتار ہوئے ۱۶۸۹ء اس کے پسماندگان کے ساتھ تو نہایت اچھا سلوک کیا گیا لیکن سنبھاجی کو اس کی ہیکڑی اور بدزبانی کی سزا میں قتل کر دیا گیا۔ لیکن اس کے قتل سے خاطر خواہ اطمینان نہیں ہوا کیونکہ مرہٹوں نے اس کے سوتیلے بھائی راجہ رام کو جو قید میں تھا رہا کر کے اپنا راجہ بنا لیا۔ اس نے قلعہ راہری میں اپنا قدم جمایا تھا۔ اورنگ زیب کے مشہور جنرل ذوالفقار خاں نے اس قلعے پر حملہ کر دیا لیکن راجہ رام جوگیوں کا لباس پہنکر فرار ہو گیا۔ دریائے تنگبھدرا پر ایک لڑائی ہوئی لیکن وہاں سے بھی نکل بھاگا اور ساحل کارومنڈل کے قلعہ مشہور قلعۂ جنجی میں قدم جمایا۔ اس کے مقابلے کے لیے ذوالفقار خاں اور اس کا باپ اسد خاں اور شاہزادہ کام بخش مامور ہوئے تھے ۱۶۹۰ء میں یہ قلعۂ جنجی پہنچ گئے۔ لیکن اس قلعے کی تسخیر بہت دشوار گزار ثابت ہوئی پے در پے دار و گیر کے بعد بڑی مشکل سے یہ قلعہ ۱۶۹۷ء میں فتح ہوا لیکن راجہ رام یہاں سے بھی بچ کر نکل گیا اور یہ کئی سال کے بعد برار کی بادیہ نوردی میں مرا۔ قلعۂ جنجی کی تسخیر کے بعد مرہٹوں کے دوسرے قلعے یعنی ستارا۔ پرنالہ۔ بھوسان گڑھ اور پرلی وغیرہ فتح ہو گئے اور مرہٹوں کے مشہور جنرل سنہاجی اور دھناجی قتل ہو گئے۔ ۱۷۰۷ء میں شہنشاہ اورنگ زیب کا انتقال ہوا۔ اس کے انتقال سے دو سال پہلے دکن کا سیاسی مطلع بہت کچھ صاف معلوم ہوتا تھا۔ دکھنی سلطنتوں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ مرہٹوں کے تمام قلعے مفتوح اور ان کے تمام سردار تہ تیغ ہو چکے تھے۔ اور جب شہنشاہی کیمپ دریائے کرشنا کے کنارے قائم ہوا تو جنوبی راج دھانیوں نے بھی اطاعت اختیار کر لی لیکن یہ صورت حال کچھ امید افزا نہیں ثابت ہوئی۔ یوں دیکھنے کو تو دریائے کاویری تک مغلیہ عملداری قائم ہو گئی تھی لیکن غور سے دیکھا جائے تو وہ طاقتیں جن کو زیر کرنے کے لیے شہنشاہ دکن آئے تھے وہ نہیں پیوند خاک ہو گئے صحیح معنوں میں مغلوب نہیں ہوئی تھیں۔ خود یہ مسئلہ اب تک زیر بحث ہے کہ دکن کی اسلامی سلطنتوں کا خاتمہ کہاں تک

باب ۵

مغل سلطنت کے لیے مفید مطلب تھا۔ مگر ان سلطنتوں کے خاتمے سے یہ مطلب تھا کہ مرہٹوں کا کوئی سہارا باقی نہیں رہے اور مرہٹے بے دست و پا ہوجائیں تو وہ بھی پورا نہیں ہوا کیونکہ ان سلطنتوں کے ٹوٹنے کے بعد ان کے بے روزگار سپاہی مرہٹوں سے مل گئے اور مرہٹوں سے زیادہ مغل سلطنت کے دشمن ہوگئے۔ نیز سیواجی کے عہد میں مرہٹوں میں جو قومی روح پھونک دی گئی تھی وہ فنا ہونے والی نہیں تھی۔ اگرچہ شہنشاہ نے ان کے تمام سردار قتل کردیے اور ان کے تمام قلعے مسخر کرلیے لیکن قوم باقی تھی اور اس کو ہر وقت کوئی نہ کوئی رہنما ملجاتا تھا راجہ رام مرگیا تو اس کی بیوی تارا بائی نے قوم کی عنان اپنے ہاتھ میں لے لی اور مغل سلطنت کا مقابلہ کیا گو ان کی متحدہ قوت باقی نہ تھی لیکن ان کی منتشر ٹولیاں جگہ جگہ حملہ کرتی تھیں اور مغل فوجوں کو دق کرتی تھیں۔ اورنگ زیب کے انتقال تک یہ صورت حال رہی اور اس کے بعد جب اس قوم کو اچھے پیشوا مل گئے تو یہ پھر غیر معمولی طاقت بن گئی اور بالآخر مغل سلطنت کا خاتمہ کردیا۔ اس طریقے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اورنگ زیب کا تمام دکھنی منصوبہ ناکام ثابت ہوا گو اس کی کچھ ذمہ داری اس کے کمزور جانشینوں پر بھی عائد ہوتی ہے۔

تاریخ ہند جلد سوم (درمیان صفحات ۱۶۶ و ۱۶۷)
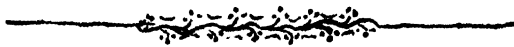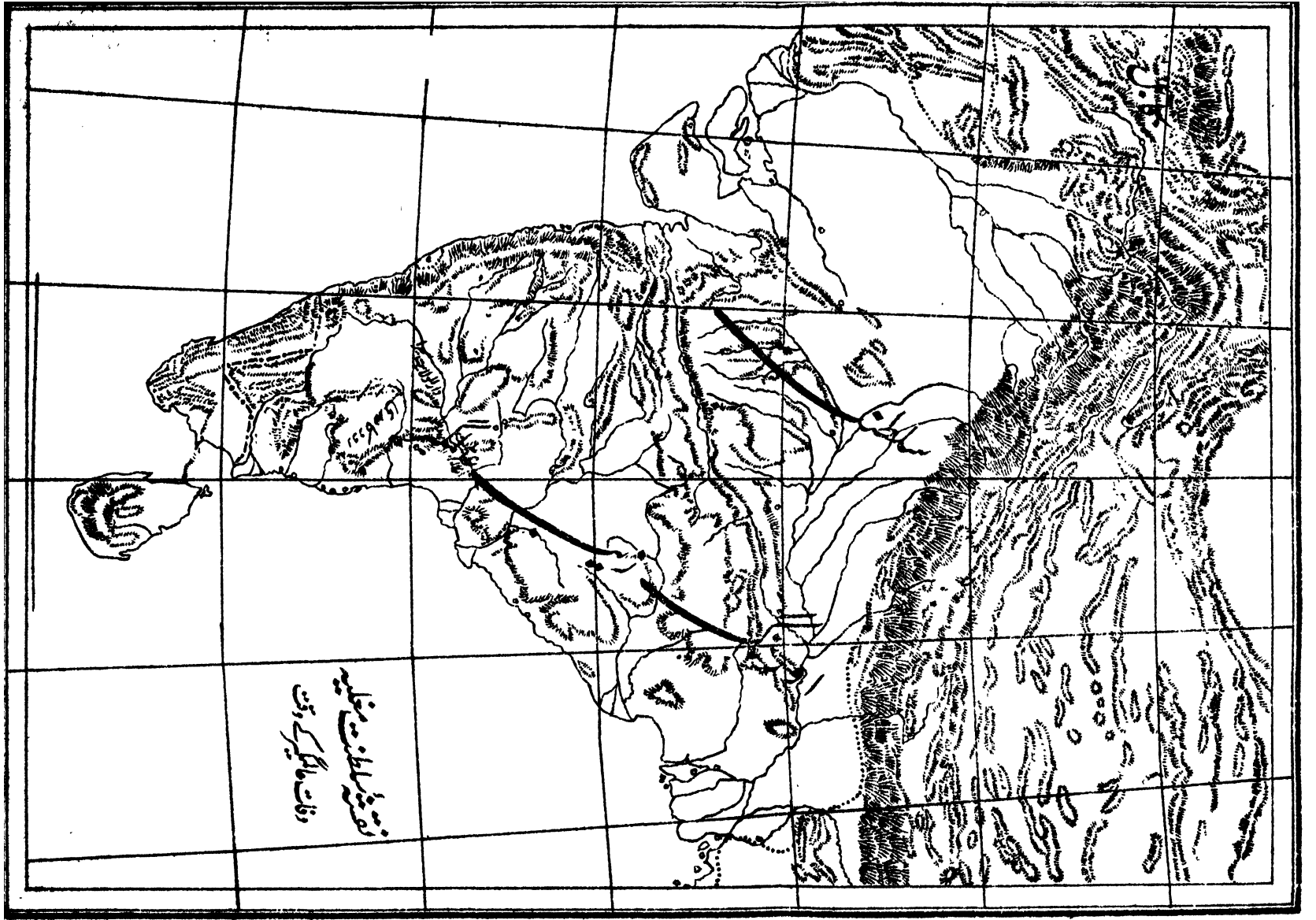
نقل عہد نامہ کہ بموجب التماس پادشاہ زادہ محمد مراد بخش قلمی شد

(آداب عالمگیری ورق ۱۳۳ و ۱۳۴)

چوں دریں ہنگام خجستہ آغاز فرخندہ انجام کہ آوان طلوع نیّر سعادت و اقبال و زمان سطوع صبح عظمت و اجلال است و شاہباز بلند پرواز ہمت جہاں کشا در ہوائے صید مقصود بال کشادہ اعدائے اعلام دین متین سید المرسلین علیہ من الصلوة ابہاھا و من التحیات ازکاھا. وجہ قصد گردیدہ و تمامی نیت حق طویت مصروف آنست کہ بمساعی غازیان ظفر لوا و زور بازوئے مجاہدان نصرت انتما خار الحاد و زندقہ از گلشن ہمیشہ بہار دیار اسلام برافتد و رئیس الملاحدہ با اتباع و احزاب خویش نیست و نابود شود و گرد تفرقہ بر ساکنان عرصۂ وسعت آباد ہندوستان بہشت نشان کہ از مساعی جدو اجتہاد اجداد عظام گردوں مقام و آبائے کرام فلک احتشام جزاہم اللہ تعالیٰ عن المسلمین خیر الجزاء از لوث کفر و شرک مصفا گشت

بحوزه درآمده بشنیدند برادر بجان برابر اعزار رشد ارجمند کامگار نامدار عالی تبار
بمقتضائے رائے صواب نمائے خرد آرائے دولت افزا که اجل مواهب الٰہی است
عمل نموده دریں مہم عاقبت محمود توفیق موافقت و مرافقت یافته بود مواخات
و موالات را که بروابط عهود و مواثیق استحکام پذیرفته بود مجدد اً چنانچه باید بایمان
کثیر الایقان موسس ساخته باخود مقرر کرده که بعد استیصال آن دشمن دین و دولت
و استقرار و انتظام امور سلطنت بر جادهٔ تو یم وفاق و اتفاق ورزیده ہمیں
و تیره ہمه وقت و ہمه جا در ہمه کار رفیق بوده شریک باشند و با دوست ما دوست
و با دشمن ما دشمن بوده در ہیچ حال از مرضیات خاطر عاطر بیروں نروند و از جمله ممالک محروسه
آنچه حسب الالتماس آں درة التاج حشمت و کامگاری بایشاں واگزاشته شود
قانع و خورسند گشته افزوں طلبی نه نمایند بنا براں از روے وفور شفقت و عاطفت
و نظر بمراتبے که پاس عهد آں نموده اند مرقوم قلم والا رقم می گردد که انشاء اللہ تعالے
تا آں زماں که ازاں برادر ارجمند خجسته اطوار نیکو خصال خلاف اخلاص و یکرنگی
و حق شناسی بوقوع نیاید اشفاق و مہربانی ہائے ما در بارهٔ ایشاں روز بروز خواہد بود
و نفع و ضرر جانبین را یکے دانسته در جمیع اوقات اتحاد را بالغ وجہے
مرعی خواہیم داشت و الطاف و مراحمیکه امروز نسبت به آں
عزیز از جاں مبذول است پس از حصول مامول و بر افتادن ملحد نامقبول
بہماں نمط بلکه بہتر ازاں معمول گشته دقیقهٔ از دقائق آں مہمل نخواہیم گزاشت بوفائے وعده
پرداخته چنانچه سابق مقرر شده بود صوبهٔ لاہور و کابل و کشمیر و ملتان و بھکر و
تمام آں ضلع را تا ساحل خلیج عمان بآں نامدار والا تبار واگزاشته دریں باب
مضائقه را مجال نخواہیم داد و بعد فراغ از استیصال ملحد نکوہیده افعال و قمع خاربن شر و فساد
از چار چمن دولت خدا داد ابد اتصال که رفاقت و ہمراہی آں تازه نہال بوستان
سلطنت و اقبال دراں کار لازم و ناگزیر است بے توقف ایشاں را بداں حدود روانه
نموده اصلاً مطلقاً بتاخیر رخصت راضی نخواہیم شد و شرف عذت محبت و مودت و صداقت
و فتوت را از غبار التباس ارباب غرض که اشر الناس اند از صفا نینداخته جز بہبود دارین و
کامیابی نشأتین آں عین الانسان و انسان العین نخواہیم اندیشید و در صدق ایں دعوی

۱۵۰

خدا و رسول خدا را گواہ گرفتیم و ایں وثیقہ را بجہت مزید اطمینان و استظہار خاطر آں گرامی برادر بمہر نقش پنجۂ مبارک خاص مزین گزرانیدم باید کہ ایشان نیز منطوق آیہ کریمہ "اوفوا بالعہد ان العہد کان مسئولا" را مطمح نظر سعادت اثر داشتہ در پاس لوازم معاہدت کہ مورث نیکنامی دنیا و آخرت است باقصی الغایۃ کوشیدہ بریں منہج صواب مستقیم باشند و اوضاع پسندیدۂ خود را از وصمت بغیر و جہی کہ شاید صیانت نمودہ گفتۂ نابخردان کوتہ اندیش را کہ از رو غایت دنائت ہمت و رکاکت فطرت جلب منافع رویہ و تحصیل اغراض فاسدۂ خویش بر صلاح حال و مآل ولی نعمت می دارند و از انواع طرق در آمدہ باقاویل باطلۂ مموہہ ہنگامۂ شورش و فساد را گرم می سازند و ازاں دست اشرار دریں جزو زماں بسیار و بے شمار اند بسمع رضا اصغا نہ کنند و پیوستہ بنور شمع سعادت افروز خرد دوربیں و عقل صلاح گزیں در مسالک معاشرت سلوک نمودہ ایں مشعل خورشید ضیا را از باد دم سرد آں نگاہدارند

وَفقنا اللہ تعالیٰ وَایّاکم بِمَا یُحبّ وَیَرضیٰ " واللہ یحق الحق وَھُو یَھدِی السّبیل"
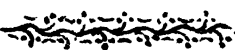
آخری مغل بادشاہ

پہلی فصل مغلیہ تمدّن

نورالدین جہانگیر (۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء) سے معزالدین جہاندار شاہ (۱۱۲۳ھ / ۱۷۱۲ء) تک جس قدر تیموری سلاطین تخت ہندوستان کے وارث ہوئے سب کے سرکاری القاب میں دنیا کی فرماں روائی کا ادعا پایا جاتا ہے۔ اور اگر اس مبالغۂ شاعرانہ سے محض ان بادشاہوں کی عظمت و اقبال کا اظہار مقصود ہو تو یہ بالکل صحیح ہے کہ ٹھیک یہی زمانہ ان کے انتہائی عروج و اقتدار کا زمانہ ہے جس میں کل (بحری) دنیا کا ایک خمس اور متمدن دنیا کا ایک ثلث کے قریب حصہ ان کے زیر نگین تھا!

یہ ہم اوپر پڑھ چکے ہیں کہ شاہ اورنگ زیب عالمگیر کے آخر زمانے تک اس سلطنت کی وسعت و قوت میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن

باب ۶

جس وقت اس درویش مزاج فرماں روا نے وفات پائی تو معلوم ہوتا تھا کہ سلاطین مغلیہ کا آفتاب سطوت و اقبال نصف النہار پہ پہنچ کر تھم گیا اور چند سال بعد سے اس میں ہبوط و زوال کے آثار نظر آتے ہیں۔ مگر اس انقلاب کے اسباب و واقعات لکھنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ہم بیچ کے چھ سال کے مختصر حالات بیان کرنے کے بعد اس عہد کے تمدن پر ایک سرسری نگاہ ڈال جائیں جسے بعض اعتبار سے ہندوستان کا بہترین زمانہ سمجھا جاتا ہے۔

شاہ عالم بہادر شاہ

اورنگ زیب نے اپنی زندگی میں بڑے بیٹے شہزادۂ محمد معظم کو شمالی ہند اور کابل کی حکومت سونپ دی تھی۔ وسط ہند و گجرات باپ کے چاہیتے بیٹے محمد اعظم کے زیر انتظام تھے اور جنوبی ہندوستان شہزادۂ کام بخش کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اسی انتظام کے مطابق وہ سلطنت کو اپنے بیٹوں میں تقسیم کرنا چاہتا تھا اور بظاہر شہزادۂ محمد معظم کا بھی منشا یہی تھا کہ ممکن ہو تو اپنے دلیر و جنگجو بھائی کو کچھ اور ملک دیکر جنگ سے بچا جائے لیکن باپ کی تجہیز و تکفین سے فرصت پاتے ہی محمد اعظم نے بڑے بھائی پر فوج کشی کی اور آگرے کے قریب ایک خونریز جنگ میں مارا گیا (جنگ سرائے جاجو ربیع الاول ۱۱۱۹ھ) پھر معظم نے چھوٹے بھائی سے اطاعت و خراج گزاری کا مطالبہ کیا اور اس کے انکار پر لشکر لے کر حیدرآباد تک بڑھا۔ بدمزاج کام بخش سے مزاحمت کی کوئی خاطرخواہ تدبیر نہ بن پڑی اور وہ بکمال بے سروسامانی کے باوجود محض جوش تہور میں لڑکر زخمی ہوا اور اسی زخم سے وفات پائی (ذوقعدہ ۱۱۱۹ھ) ہندوستان کے تمام ممالک پھر ایک مطلق العنان شہنشاہ کے زیر نگیں آگئے جو تاریخ میں شاہ عالم بہادر شاہ (اول) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

دکن کی اسی لشکر کشی کے زمانے میں بعض مرہٹہ سرداروں نے بھی بادشاہ کی رفاقت کے صلے میں جاگیر و مناصب حاصل کئے۔ سنبھاجی کے فرزند ساہوجی (ثانی) کو جو اورنگ زیب کے انتقال کے بعد رہا کر دیا گیا تھا پہلے ہی ایک باجگزار کی حیثیت سے پونا کا راجہ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اور اگر اس کے چچا رام راجا کی بیوہ تارا بائی جھگڑا نہ کرتی تو

بہادر شاہ اس بات پر آمادہ تھا کہ دکن میں وصول مالگزاری کا ٹھیکہ بھی ساہو کے نام منظور کرلے اور اس کے معاوضے میں اسے کل سرکاری جمع کا چوتھائی حصہ دیدیا جایا کرے۔ اور گو اس وقت مرہٹوں کے اندرونی تنازعات کی وجہ سے یہ معاملہ ملتوی رہ گیا تاہم یہی زمانہ ہے جس میں کچھ تو بادشاہ کے ذاتی حلم و بردباری کے اثر سے اور کچھ مرہٹوں کے پچھلے نقصانات کی تلافی اور دلجوئی کے خیال سے حکومت نے ان کے ساتھ رعایت و آشتی کا طریق عمل اختیار کیا اور انھیں دوبارہ اطمینان سے سانس لینے کا موقع ملا۔

مرہٹوں کے برخلاف راجپوتانے کے بعض سرداروں نے شہزادہ کام بخش کی حمایت کے حیلے سے جنگ و بغاوت پر کمر باندھی تھی، اور پنجاب کے سکھ سرہند و سلطانپور میں فتنہ و فساد برپا کر رہے تھے۔ لیکن وہ بادشاہی فوجوں کا مقابلہ نہ کرسکے اور یہ مفسدے بزور فرو کردیے گئے۔ چار سال کی حکومت کے بعد ضعیف العمر بہادر شاہ نے ستر سال چند ماہ کی عمر میں وفات پائی (محرم ۱۱۲۴ھ ۱۷۱۲ء) تو ملک میں ہر طرف امن و امان تھا۔

جہاندار شاہ

بہادر شاہ کی اولاد میں سب سے لایق شہزادہ عظیم الشان تھا لیکن وہ اپنے بڑے بھائی معز الدین کے ساتھ لڑائی میں مارا گیا اور باقی دو بھائیوں کو مغلوب کرنے کے بعد یہی فتحمند شہزادہ جہاندار شاہ کے لقب سے تخت ہندوستان کا مالک ہوا۔ مگر یہ کامیابی عارضی تھی اور سال کے ختم ہوتے ہوتے وہ اپنے بھتیجے فرخ سیر کے مقابلے میں شکست کھاکے قتل کرادیا گیا جس کا حال آگے آتا ہے۔ لیکن جہاندار شاہ کی اسی شکست اور فرخ سیر کی تخت نشینی سے مغلوں کی سیاسی قوت میں اس انحطاط کے آثار نمایاں ہوتے ہیں جو درحقیقت ان کے سیاسی نظام حکومت اور نیز طرز معاشرت کا لازمی نتیجہ تھا۔

موروثی بادشاہی کے نقائص

ہندوستان کی اسلامی حکومتوں کے عیب و صواب پر ہم نے اس کتاب کے گزشتہ اوراق میں کہیں کہیں اجمالی بحث کی ہے حقیقت میں موروثی بادشاہی کے اصول نقائص اسقدر آشکارا و مسلم ہیں کہ ان پر

زیادہ بحث وگفتگو کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ خیال کہ ممالک ایشیا میں لوگوں کو ان خرابیوں کا احساس نہ تھا یا یہ کہ یہاں کے باشندے طبعاً غلامی پسند اور اہل یورپ سے زیادہ بادشاہ پرست ہیں، محض لغو اور جدید یورپ کے خود پسند مصنفوں کا مشتہر کردہ ہے۔ اس کے برعکس تاریخی واقعات سے یہ ثابت کرنا کہ یورپ کے لوگ اس قسم کی غلامانہ اشخاص پرستی کے مرض میں اہل مشرق سے بھی زیادہ مبتلا رہے ہیں، کچھ دشوار نہیں مگر یہاں ہم کو صرف ہندوستان کے حالات سے غرض رکھنی ہے کہ گو سلاطین مغلیہ کے عہد میں اس موروثی مطلق العنان بادشاہی کو پہلے سے بھی زیادہ تقویت حاصل ہوئی لیکن اس کا سبب محض لوگوں کی بے حسی کو قرار دینا سخت ناانصافی اور ان مغل بادشاہوں کی بڑی قدر ناشناسی ہے جو با برسے شاہ عالم (اول) کے زمانے تک حکمرانی کے بہترین اوصاف سے متصف تھے۔ ملک میں عدل و انصاف کے ساتھ امن و انتظام قائم کرنے اور مختلف عناصر و طبائع کو خدمت سلطنت کے لیے متحد کر لینے کی ان میں کامل اہلیت و استعداد موجود تھی اور حکومت کی پائداری کی حقیقی اور بنیادی شرائط یہی ہیں۔ ورنہ فروعی اصلاحات، تمدنی ترقی یا بیرونی فتوحات کو ایک صحیح وقوی حکومت کے ضمنی لوازم سمجھنا چاہئیے! اب غور سے دیکھئے تو خود یہ امر کہ شاہ عالم کے بعد نالائق بادشاہوں کے تخت نشیں ہوتے ہی تیموری خاندان کی حکومت میں زوال آگیا، اس بات کا بدیہی ثبوت ہے کہ کم سے کم ہندوستان کا طبقۂ امرا محض موروثی بادشاہ کے سامنے سر اطاعت خم کرنے پر آمادہ نہ تھا بلکہ اس کی "بادشاہ پرستی" بھی اسی وقت تک تھی جب تک کہ خود بادشاہ لائق و منتظم اور اطاعت گزاری کے سزاوار تھے!

لیکن یہ جتانے کے بعد کہ اتنے عرصے کی شخصی حکومت اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اہل ہندوستان سیاسی آزادی اور انسانی حقوق کے خیالات سے عاری ہوگئے تھے، یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ مذکورۂ بالا طرز بادشاہی نے ان میں کسی ایک مطلق العنان اور بالادست فرماں روا کے بغیر باہم مل کر

باب ۳

حکومت کرنے کی قابلیت باقی نہ چھوڑی تھی۔ اور وہ بالعموم خود غرض اور تنگ نظر ہو گئے تھے۔ دوسرے تیموری خاندان کے بادشاہوں کی اطاعت نے ان کے حوصلے پست کر دیے تھے اور اس خاندان کے انحطاط کے بعد ان میں کوئی ایسا اولوالعزم نہ پیدا ہوا کہ پھر ممالک ہند کو ایک مرکزی حکومت کے ماتحت متحد کر دیتا۔

دولت و عشرت

طبقۂ امرا کے قوائے اخلاقی و جسمانی کو ضعیف کرنے کا ایک اور کبر اسبب کثرت مال اور عیش پسندی کو سمجھنا چاہیئے۔ مگر اس میں اہل ہند یا مغلوں کی کچھ خصوصیت نہیں۔ نفس انسانی کے لیے دولت و حکومت سخت آزمائش ہیں۔ انھیں پا کر اپنے جذبات و افعال پر قابو رکھنا کوئی سہل بات نہیں۔ گر بہ دولت برسی، مست نہ گردی، مردی! قدیم فلاسفہ اور اہل مذہب نے بالعموم دولت کی بے اعتباری اور برے نتائج بتا کر لوگوں کو اس سے نفرت سکھائی ہے۔ اسلامی تعلیم اس میں یہ ترمیم و اضافہ کرتی ہے کہ دولت محض خدا کی دی ہوئی امانت ہے اور ایک دیانت دار خدا شناس بندے کا فرض ہے کہ وہ اسے محض دینے والے (خدا) کی رضا جوئی میں صرف کرے؛ مگر مسلمان من حیث القوم ان اخلاقی مواعظ و حکم کو مدت سے فراموش کر چکے تھے۔ عیش پسندی اور لہو و لعب مغل سلاطین کی سرشت میں داخل تھے۔ جنگ کے وقت وہ جیسے مدبر سپہ سالار، منچلے سپاہی اور دلدادۂ رزم و قتال تھے، حالتِ امن و فراغت میں اسی قدر انھیں بزم عیش و طرب سے دلچسپی تھی اور تمام طبقۂ امرا پر یہی رنگ چڑھا ہوا تھا! اورنگ زیب کی پنجاہ سالہ بادشاہی اس عشرت پسندی کے خلاف ایک عظیم الشان جد و جہد تھی اور اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنی ذاتی مثال اور سرکاری ضوابط کے زور سے اہل دربار کی حالت میں انقلاب پیدا کر دیا تھا اس کے اکثر عمال و امرا نیز خاندان شاہی کے افراد نہایت سادگی پسند متقی پرہیزگار نظر آتے ہیں۔ لیکن در اصل یہ "کامیابی" عارضی اور ایک حد تک جبری کامیابی تھی بلکہ سچ پوچھئے تو اسی نے بہت سے امیر گھرانوں کو بادشاہ سے ناخوش کر دیا۔ انھیں قولاً و فعلاً

یا عقلاً و اخلاقاً تو بادشاہ سے مخالفت کی کوئی گنجایش ملتی نہ تھی لیکن مدتوں کی عادتیں اور سامان عیش و عشرت چھوڑنے سے بھی دل میں سخت جزبز ہوتے تھے اور ان کا نفس بادشاہ پر اعتراض و حرف گیری کے نئے نئے حیلے سمجھاتا تھا۔ چنانچہ اس زمانے کی اکثر کتابوں میں اس درپردہ ناراضی اور بدگمانی کے شواہد موجود ہیں۔

امیرانہ تکلف و معاشرت

اورنگ زیب اپنے خطوط میں بیٹوں یا امرا کو جا بجا بیہودہ مراسم اور مسرفانہ تکلفات پر ٹوکتا ہے۔ یہ رسمیں اکبر کے آخری عہد یا کہنا چاہیئے کہ استقلال حکومت و ثروت کے ہم قدم شاہی درباروں اور امیرانہ محلات میں داخل ہوئی تھیں۔ ان بادشاہوں کے جشن یا خاص خاص درباروں کے حالات پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ ہندوستان میں اس وقت دولت کی کوئی حد بھی تھی؟ دربار کی تزئین و آرایش، فیاضانہ داد و دہش اور بے حساب خیرات و صدقات میں بلا مبالغہ کروروں روپیہ خرچ ہوجاتا تھا امرائے شاہی جو نذریں یا ہدیے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتے تھے وہ علٰحدہ علٰحدہ لاکھوں روپے کے ہوتے تھے۔ بیش قیمت سے بیش قیمت جواہرات، نادر سے نادر قدرتی اور مصنوعی اشیا اور بے مثل مصنوعات اور ظروف و اسباب ساری دنیا سے کھنچ کھنچ کر ہندوستان آتے اور یہاں کی سرکاروں میں منہ مانگی قیمتوں پر خرید لیے جاتے تھے۔ دراصل یہی تاریخی زمانہ ہے جس میں ہند کی دولت و احتشام کے قصے ملک ملک مشہور ہوئے اور یہاں کے شاہانہ جاہ و جلال نے ساسانی درباروں کی داستان عظمت کو ماند کر دیا۔ مغل بادشاہوں کے یہ حالات جن میں جنگی مہمات اور اہم انتظامات سے لے کر ان کے طعام و لباس نشست و برخاست وغیرہ ذاتی مشاغل و عادات کی جزئیات تک داخل ہیں، اس زمانے کی تاریخوں میں بہت تفصیل سے مرقوم ہیں۔ انھیں یہاں بیان کرنے کی گنجایش نہیں مگر یہ بات یاد دلانے کے قابل ہے کہ بادشاہوں کی اسی طرز معاشرت کا ملک یا کم سے کم اعلیٰ طبقے پر اثر پڑتا تھا اور ہر امیر و رئیس اپنی اپنی جگہ بقدر وسعت

وبضاعت شاہی اوضاع و اطوار کی تقلید کرنی چاہتا تھا۔ اگر بادشاہوں کے جنگی ساز و اسلحہ، ظروف و اسباب آرائش، نئے نئے لباس اور کھانے تیار کرانے کے یا محلات کی تعمیر باغات کی تیاری[1] کے بڑے بڑے محکمے اور کارخانے تھے تو امرا کی سرکاریں بھی اس سے خالی نہ تھیں۔ جس طرح بادشاہوں کی دلچسپی یا راحت رسانی کے واسطے ہزاروں ملازم، مصاحب، شاعر، داستان گو، مختلف فنون کے باکمال استاد، داروغہ، چپراسی، برقنداز، کہار، فراش، مشعلچی، پہرے مقرر ہوتے تھے اسی طرح امیروں کے پاس بھی نوکروں کی فوج کی فوج رہتی تھی۔ البتہ انفرادی ذوق کے مطابق بعض امیروں کے ہاں علما، فضلا، انشا پرداز، شعرا کا مجمع رہتا تھا، بعض فنون سپہگری کے قدرداں تھے اور بعض سرکاریں صنعت و حرفت کی قدردانی میں مشہور تھیں۔

اس میں کچھ کلام نہیں کہ عیش دوستی کے ساتھ مغل امرا نہایت زندہ دل، خوش مذاق اور سلیقہ مند حاکم تھے اور گزشتہ سو ڈیڑھ سو برس کی حکومت و سکونت میں انھوں نے ہندوستان کو گلزار بنا دیا تھا۔ ہر قسم کے فنون و صناعات اور لوازم معیشت و مسرت کو جو اس زمانے کا تمدن فراہم کر سکتا تھا، انھوں نے ترقی دی۔ مصوری، موسیقی اور شعر گوئی کو اسلامی تعلیم مخرب اخلاق نہیں تو بے کار لہو و لعب میں ضرور داخل کرتی ہے

[1] اس زمانے میں عام طور پر ہر محل میں پائیں باغ ضرور ہوتے تھے۔ مکانات کی طرز بالعموم وہی تھی جس کے بعض نمونے قدیم شہروں میں اب تک کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں۔ یعنی صدر میں شمال رویہ وسیع اور عالیشان دہرے دالان، شہ نشین، سامنے چبوترہ، مہتابیاں، اور ادھر ادھر نوکروں کے مکانات۔ جدید قسم کے کمروں کا بہت کم رواج تھا اور کواڑوں کے کمروں یا کوٹھریوں سے زیادہ تر اسباب رکھنے کا کام لیا جاتا تھا۔ سردی کے زمانے میں دالانوں کے پرتکلف گرم پردوں اور انگیٹھیوں سے گرم رکھتے تھے۔ گرمیوں میں دن کا زیادہ حصہ تہ خانوں اور خس خانوں میں گزارا جاتا تھا۔

باب ۶

اس زمانے میں انھیں "فنون لطیفہ" کا دلاویز خطاب دیا گیا ہے اور اس لیے یہ لکھنا بے محل نہ ہوگا کہ ان فنون کو دسویں اور گیارھویں صدی ہجری میں نہایت فروغ حاصل ہوا، اور عہد اکبر و جہانگیر کی بعض تصاویر کی اب تک یورپ میں تعریف و قدر کی جاتی ہے۔ انگریزی سفیر طامس رو کی یہ دلچسپ شہادت محفوظ ہے کہ دیگر تحائف کے ساتھ اس نے جو بہترین تصویر نذر کی تھی چند ہی روز میں شاہی مصوروں نے اس کی چند ایسی نقلیں تیار کر دیں کہ طامس رو کو اپنی اصلی تصویر کے پہچاننے میں بہت دشواری پیش آئی[1] فنون لطیفہ سے

[1] الفنسٹن، صفحہ ۵۴۰ وغیرہ وغیرہ ان تحائف میں ایک گھوڑا گاڑی یا بگھی بھی طامس رو نے پیش کی تھی اور شاہی کاریگروں نے اسی طرز پر کہیں بہتر گاڑیاں تیار کر دیں۔ انھی "فرنگی طرز کی گاڑیوں" کا ہمعصر فارسی تواریخ میں کہیں کہیں ذکر آنے سے طامس رو کا دربار جہانگیری میں آنا ثابت ہوتا ہے (دیکھو الیٹ جلد ششم حاشیہ صفحہ ۳۴۷) ورنہ بادشاہ سے اپنی بے تکلف ملاقاتوں کے متعلق یا دربار کے جو کچھ حالات سفیر مذکور نے تحریر کئے ہیں وہ بالکل ناقابل اعتبار رہیں۔ تزک جہانگیری، واقعات جہانگیری، اقبال نامہ جہانگیری وغیرہ متعدد فارسی تواریخ ایسی موجود ہیں جن میں جہانگیر کے روزانہ مشاغل کا یہ تفصیل ذکر کیا ہے اور بہت معمولی سی نئی بات بھی قلم انداز نہیں ہوئی ہے۔ اگر طامس رو کی واقعی ایسی ہی تکریم و تواضع ہوئی ہوتی تو یہ ممکن نہ تھا کہ ان کتابوں میں اس کی سفارت کا مطلق ذکر اور اس کا کہیں نام تک نہ آتا اور جن تجارتی مراعات کی درخواست کرتا تھا، وہ خود اس کے بیان کے مطابق کامل تین سال کی تگ و دو کے بعد بھی ارکین حکومت نے تمام و کمال منظور نہیں کی۔ حالانکہ بادشاہ کی معمولی نظر عنایت بہت جلد اس کو امیر و زیر کی امداد سے مستغنی کر سکتی تھی۔ غرض درایتہً انگریزی سفیر کی اکثر تحریریں محض فرضی معلوم ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ جو پادری ٹیری آیا تھا وہ اس سے بھی کہیں زیادہ بے باک دروغ گو ہے۔ چند سال پہلے تک انگلستان کے "اہل تحقیق" اس قسم کی تحریروں کو بجنسہٖ شایع کرنے سے بظاہر شرماتے تھے لیکن اب جبکہ برنیر اور منوچی جیسے مبتذل مفتری تاریخ ہند کے مستند مصنف مانے جانے لگے ہیں تو کیا عجب ہے کہ رفتہ رفتہ ٹیری اور رچرڈ ڈیل کے "وحشیانہ اور بیہودہ جھوٹ" بھی کچھ دن بعد تاریخ کے ماخذ قرار دیے جائیں جس کا ونسنٹ اسمتھ جیسے نامور "محقق" نے اپنی سب سے "تازہ اور مستند تاریخ" میں راستہ تیار کر دیا ہے۔

قطع نظر فن عمارت کے ہر شعبے نے عہد مغلیہ میں جو حیرت انگیز ترقی کی تھی وہ فی الواقع تعجب انگیز ہے۔ بعض مغل سلاطین خاص کر شاہجہاں اس فن کے بے مثل ماہر تھے اور ان کے شاہانہ شوق و ذوق نے اپنی پر شکوہ عمارات میں جو استحکام و حسن پیدا کیا ہے اس کے بعض نمونے آج تک دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتے ہیں۔

اس بات کی بہت سی دلچسپ شہادتیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ گیارھویں صدی ہجری یا سترھویں صدی عیسوی میں ہندوستان صنعت و حرفت کے اعتبار سے دنیا کے سب سے ترقی یافتہ ممالک میں داخل تھا۔ مورلینڈ کو، جس کے نتائج تحقیقات زیادہ تر فرنگی سیاحوں کے اقوال پر مبنی ہیں، اپنی تازہ ترین کتاب میں تسلیم کرنا پڑا کہ "یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ صنعت و حرفت میں ہندوستان موجودہ زمانے کی نسبت اس وقت مغربی یورپ سے کہیں زیادہ ترقی کر چکا تھا"[۱]۔ لیکن ہم کو مغربی یورپ کے موجودہ فروغ اور لاجواب مصنوعات کی کثرت دیکھ کر دھوکے میں پڑنا نہ چاہئے۔ بے شبہ عظیم الشان دخانی کلیں اور انجن جدید یورپ کا سرمائیہ امتیاز ہیں جن کی بدولت وہ آج دنیا پر مسلط نظر آتا ہے۔ بایں ہمہ وہاں کے دستکاریوں کو ایشیا کے صاحب ذوق صناعوں پر غالباً کسی زمانے میں بھی فضیلت حاصل نہیں ہوئی اور آج بھی ممالک ایشیا میں جو قدیم صنعتیں بحالت کس مپرسی باقی رہ گئی ہیں، ان کے باکمال استاد اس قسم کی چیزیں تیار کر دیتے ہیں کہ حسن و خوبی کے اعتبار سے اہل یورپ ان کا مثل پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ ان صناعات کے علیٰحدہ علیٰحدہ حالات بیان کرنے کا یہ محل نہیں۔ اجمالی طور پر اس قدر لکھنا کافی ہوگا کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں بہترین قسم کا ریشمی، اونی اور سوتی کپڑا تیار ہوتا تھا۔ لوہا، تانبا، ہیرا وغیرہ مختلف معدنیات خاصے وسیع پیمانے پر کانوں سے نکالی جاتی تھیں اور گو عام استعمالی دھاتوں کی یہ کثرت نہ تھی اور نہ ان کی اس قدر اچھی اور

---

[۱] انڈیا آیٹ دی ڈیتھ اوف اکبر صفحہ ۱۵۶۔

باب ۷

سستی چیزیں تیار ہوتی تھیں جیسی کہ اس زمانے میں عام طور پر دستیاب ہو جاتی ہیں، بایں ہمہ خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ توپ و تفنگ سے لے کر سوئی اور انگشتانے تک ضرورت کی ہر شے خود ہندوستان میں بن سکتی تھی اور یہ بالکل مسلم ہے کہ اس زمانے میں اہل ہند اپنے کثیر اسباب معاشرت کے لیے کسی بیرونی ملک کے دست نگر نہ تھے[1]

بیرونی تجارت اور وسائل سفر

بعض قیمتی اور نادر اشیا جیسے ترکی قالین، قاقم و سنجاب، چینی یا شیشے کے بیش بہا ظروف کے علاوہ اچھی دھاتیں خاص کر سونا چاندی، نیز ہاتھی دانت بیرونی ممالک سے ہندوستان میں آتا تھا مگر یہ درآمد بھی حقیقت میں یہاں کی دولت مندی کا ثبوت ہے۔ ورنہ ہاتھی دانت کے کام اور قیمتی معادن کے زیورات یا زر بافی وغیرہ صنعتوں میں خود اہل ہند کسی سے کمتر نہ تھے اور یہاں کے مختلف شہروں میں ان مصنوعات کے بڑے بڑے کارخانے قائم تھے۔ چنانچہ اس زمانے کی مشکلات تجارت و سفر پر نظر کیجیے تو خود ہندوستان سے جو مصنوعات باہر ساور جاتی تھیں ان کی مقدار حیرت انگیز تھی۔

سواحل سندھ و گجرات سے کوچین تک اور دوسری جانب مچھلی پٹم سے چاٹ گام تک بہت سی بارونق بندرگاہیں بحری تجارت کا مرکز تھیں، جس پر دسویں صدی ہجری (سولھویں عیسوی) میں عربی النسل مسلمان تاجروں کا قبضہ تھا[2] گیارھویں صدی سے اہل یورپ کے تجارتی جہازوں کی آمد و رفت شروع ہوئی اور ہندوستان کی بحری تجارت میں روز بروز ان کا دخل بڑھنے لگا۔ مگر اس تغیر سے بھی مجموعی طور پر تجارت ہند کو ترقی ہوئی اور بہت سی اجناس مقدار کثیر میں ہندوستان سے براہ راست یورپ کو ساور جانے لگیں۔

---

[1] انڈیا ایٹ دی ڈیتھ اوف اکبر صفحہ ۲۴۲ اور ۲۴۳۔

[2] دیکھو مورلینڈ کی تازہ ترین کتاب انڈیا ایٹ دی ڈیتھ اوف اکبر صفحہ ۱۹۰ وغیرہ

لیکن واضح رہے کہ دخانی جہاز کے رواج سے پہلے تجارت زیادہ تر "بری" ہوا کرتی تھی۔ اور گزشتہ اوراق میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ عربوں کی حکومت سندھ کے وقت سے غیر ممالک کے ساتھ ہند کی اس بری تجارت میں ایک انقلاب سا پیدا ہوگیا اور یورپ و افریقہ کے بعید ممالک سے تجارتی قافلے بلاد ہندوستان تک آنے جانے لگے تھے۔ ترک و مغل سلاطین ہند کے زمانے میں اس کو اور ترقی ہوئی اور دُور دُور کی مصنوعات ہندوستان کی منڈیوں میں پہنچنے لگیں، کیونکہ ملکی امن و انتظام کے ساتھ اب آمد و رفت کے راستے اور وسائل سفر بھی پہلے کی بہ نسبت بہتر ہوگئے تھے اور شیر شاہ سوری کے زمانے سے اورنگ زیب کے عہد تک حکومت ہندوستان برابر سفر میں مزید سہولتیں پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ آجکل ریل اور موٹر سے قطع مسافت میں جس قسم کی آسانیاں ہوگئی ہیں، ان کا تو عشر عشیر بھی کہیں دنیا میں آج سے ایک صدی قبل تک میسر نہ تھا۔ بایں ہمہ اس عصر کے معیار تمدن کی رو سے ہندوستان کے تمام شہروں تک صاف اور محفوظ راستوں کا تیار کر لیا جانا اور ہر منزل پر قیام اور سواری و باربرداری کا وسیع پیمانے پر انتظام ہی کچھ کم بات نہ تھی۔ نہایت گرم اور خشک سالی کے ایام کو چھوڑ کر سال کے کئی مہینے تک ہزار ہا لدو بیلوں کے قافلے دُور دُور تک ہزاروں من مال لاتے لیجاتے رہتے تھے جن کی حکومت نہایت فیاضی سے حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ اور مورلینڈ کے الفاظ میں "اہل ہندوستان نے اپنی بحری تجارت کی طرح بری تجارت و سفر کا بھی ایسا انتظام کر لیا تھا کہ اس عہد میں یقیناً اسے ان کا بڑا کارنامہ سمجھنا چاہئے"[1]

پکی سڑک اور لوہے کے ہلکے پہیوں کی گاڑی کا ان دنوں رواج نہ تھا لیکن سرعت سفر کے لیے نہایت صبا رفتار و دور دم گھوڑے اور اونٹ خاص طور پر سدھائے جاتے تھے۔ آرام اور تکلف کی سواریاں مختلف قسم کے

[1] صفحہ ۲۴۴۔

سنگھاسن، پالکی، ہوادار اور ڈولیاں تھیں جنھیں کئی کئی کہار لیکر چلتے اور بارہ پندرہ میل روزانہ کے حساب سے بہت دور تک لیجا سکتے تھے۔ سفر کی عام سواریاں رتھیں اور بیل گاڑیاں تھیں جو ہندوستان کے بعض حصوں میں اب تک کام دیتی ہیں۔ اکثر راستوں پر دو رویہ سایہ دار درخت نصب کردئے جاتے کہ گرمیوں میں مسافر کو تکلیف نہ ہو۔ ہر منزل پر بلکہ ہر دو دو میل پر ٹھیرنے کے لیے وسیع و پختہ سرائیں ہوتی تھیں جنھیں بجائے خود ایک چھوٹا سا قلعہ سمجھنا چاہئے جہاں مسافروں کی ضروریات پوری کرنے کے واسطے ایک مختصر بازار اور ایک وقت میں صدہا آدمیوں کے ٹھیرانے کا انتظام ہوتا تھا۔ اس قسم کی سرائیں بنانے پر، جن کے ٹوٹے پھوٹے آثار اب بھی ہر جگہ نظر آجاتے ہیں، سب سے اول شیر شاہ سوری نے خاص توجہ مبذول کی تھی لیکن گیارھویں صدی ہجری میں یہ کام اس وسعت کے ساتھ تکمیل کو پہنچا کہ شاید دنیا کے اتنے بڑے ملک میں اور کہیں اس قدر سرائیں راستوں پر نہ ہوں گی جتنی ہندوستان میں بن گئی تھیں۔ اصل میں اورنگ زیب اپنے اجداد کی طرح عالیشان قصور و ایوان کی تعمیر کو اسراف و خود نمائی سمجھتا تھا اور فقط ذاتی آرام اور خوشی کے لیے خزانہ عامرہ کا روپیہ خرچ کرنا نہ چاہتا تھا لہذا بادشاہ کی کثیر آمدنی بیشتر خیر و رفاہ عام کے کاموں میں صرف ہوتی جس میں تعمیر مآثر و سرا کی مد سب سے مقدم و اہم تھی۔ چنانچہ تخت نشینی کے کچھ عرصے بعد ہی اس نے احکام صادر کئے تھے کہ "در جمیع طرق و شوارع این ممالک کثیر المسالک ہر جا کہ سرا و رباط نہ باشد از سرکار خالصہ شریفہ سرائے وسیع الفضا از سنگ و خشت و آہک و گچ در کمال متانت و استحکام مشتمل بر بازار و مسجد و چاہ پختہ و حمام بسازند..... و ہمچنیں حکم والا صادر شد کہ ہر سرائے قدیم البنیان کہ محتاج مرمت باشد بہ ترمیم آں پردازند و در ہر موضع کہ پل درکار باشد بہ استحکام تمام بسازند۔ چنانچہ از خزاین جود و اکرام بادشاہی بہ مصارف ایں ابنیہ چنداں از خرج شدہ و می شود کہ مستوفی خیال..... از تخمین آں عاجز است"[۹۵]

[۹۵]۔ عالمگیر نامہ صفحہ ۱۰۸۵ نیز ملاحظہ ہو آثر عالمگیری صفحہ ۵۲۹ وغیرہ اسی طرح اس عہد میں ہر قصبے میں مدارس

ڈاک کا انتظام

ان سراؤں سے قطع مسافت اور ڈاک لانے لیجانے میں بھی بہت آسانی ہو گئی تھی۔ "ڈاک چوکی" کا مستقل انتظام جسے عہد اکبری سے منسوب کرنے لگے ہیں، درحقیقت شیرشاہ سوری کا رواج دادہ تھا[1] لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ اس کے بعد اس میں بہت کچھ وسعت و اصلاح ہوتی رہی، اس کی صورت یہ تھی کہ کم سے کم ہر آٹھ دس میل کی منزل پر چند سوار اور ہرکارے متعین ہوتے جو بادشاہی ڈاک کو جلد سے جلد اگلی منزل تک پہنچا دیتے تھے اور گو بعض روایات مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس انتظام کی بدولت افغانستان و بنگال، گجرات و دکن غرض بعید ترین حصص ملک سے پایۂ تخت اکبرآباد میں ہر دس گیارہ دن میں بادشاہ کو باقاعدہ ڈاک مل جاتی تھی۔ بادشاہ کی طرف سے زیادہ ضروری فرامین و احکام معمولی ہرکاروں کی بجائے "گرزبرداروں" کے ہاتھ بھیجے جاتے تھے جنھیں اس زمانے کی اصطلاح میں "سارجنٹ" کہنا غلط نہ ہوگا۔

شاہی ہرکاروں کے ذریعے اور لوگ بھی ہر مقام پر اپنے اعزا اور احباب کو خط بھیج سکتے تھے۔ لیکن اُمرا، حکام اور بڑے تاجروں کو ڈاک کا خود علیحدہ انتظام کرنا پڑتا تھا۔ اور بہت سی شہادتیں محفوظ ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان دنوں ایک مقام سے دوسرے مقام کے لوگوں میں خط و کتابت کا سلسلہ بخوبی جاری تھا۔ کم سے کم پایۂ تخت یا شاہی لشکرگاہ اور بڑے بڑے شہروں کی خبریں اور خطوط بہت جلد ملک کے ہر گوشے میں پہنچ جاتے تھے۔

آبادی اور بڑے شہر

مگر اس زمانے کی تمدنی ترقی کا بہترین اندازہ کثرت آبادی اور مدنیت کے حالات پڑھنے سے ہوتا ہے۔ یہ حالات اس کثرت سے (اگرچہ نہایت منتشر حالت میں) موجود ہیں کہ ہندوستان کے ایک ایک بڑے شہر کی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ بنائے گئے جن کے طلبہ اور معلمین کے تمام مصارف سرکار ادا کرتی تھی۔

[1] تاریخ شیرشاہی۔ ایلیٹ۔ جلد چہارم صفحہ ۴۱۸۔

گزشتہ عظمت و آسودگی پر ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں اور لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن مردم شماری کا رواج نہ ہونے سے لوگوں کی تعداد کے متعلق کوئی قطعی اور تحریری سند میسر نہیں آتی۔ بیرونی سیاحوں کے بیانات اور بعض فارسی تواریخ کو محنت اور غور سے مطالعہ کرنے کے بعد مورلینڈ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دسویں صدی ہجری کے خاتمے پر ہندوستان کی کل آبادی دس کروڑ اور بڑے بڑے شہروں کے باشندوں کا شمار تخمیناً ڈھائی لاکھ سے پانچ لاکھ تک تھا۔[1]

شہروں کی آبادی کے اس تخمینے کے متعلق ہمیں اختلاف ہے اور خود یہ مؤلف بھی تسلیم کرتا ہے کہ بیشی آبادی کے ثبوت میں بہت سی دلائل پیش کی جا سکتی ہیں مگر اس بحث کو چھوڑ کر اگر مذکورہ بالا نتائج ہی کو تسلیم کر لیا جائے تو بھی ماننا ہوگا کہ آئندہ ایک صدی میں یہ آبادی کم سے کم دگنی ہو گئی تھی۔ کیونکہ کلیۂ عام کے مطابق ہر خوش حال ملک کی آبادی نصف صدی میں دگنی ہو جاتی ہے اور اہل ہند میں افزائش نسل کی صلاحیت مشہور ہے۔ غرض یہ کہنا کہ اورنگ زیب کے اواخر عہد حکومت میں سلطنت مغلیہ کی کل آبادی بیس کروڑ سے کم نہ تھی، بظاہر کسی طرح غلط نہیں ہو سکتا۔

بڑے شہروں کی آبادی کا اشارۃً گزشتہ کتاب میں ذکر آ چکا ہے کہ دسویں صدی ہجری سے کچھ پہلے ہندوستان کے بعض شہر جو خود مختار سلطنتوں کے پائے تخت تھے نہایت آباد و بارونق تھے۔ ان سلطنتوں کی خود مختاری مٹنے کے بعد ان میں سے بعض میں یقیناً زوال آ گیا لیکن جہاں تجارت یا صنعت و حرفت کی گرم بازاری تھی یا جو شہر مغل صوبہ داروں کے مستقر بن گئے تھے، وہ اپنی حالت پر قائم رہے بلکہ بعض نے ترقی کی۔ مثلاً احمد آباد کی آبادی کا تخمینہ نویں سے گیارھویں صدی ہجری کے اخیر تک نو لاکھ کیا جاتا ہے۔ سلاطین مغلیہ کے پائے تخت اکبر آباد، دہلی رونق و آبادی میں کسی طرح احمد آباد سے کم نہ تھے۔ لاہور کو جو عروج اس گیارھویں صدی

---

[1] انڈیا ایٹ دی ڈیتھ اوف اکبر، صفحات ۱۳ تا ۲۲۔

باب

میں حاصل ہوا کبھی نہ ہوا تھا۔[1]
بندرگاہ سورت کی بارھویں صدی ہجری میں آبادی گھٹتے گھٹتے بھی تقریباً آٹھ لاکھ مانی جاتی تھی۔[2] آثار زوال کے باوجود برہانپور نہایت آباد و بارونق شہر تھا۔ اورنگ آباد کی مستقل آبادی کا اندازہ کم سے کم دو لاکھ نفوس کیا گیا ہے۔[3] حیدرآباد، بیجاپور، گلبرگہ، بیدر کے علاوہ جنوبی دکن میں بدنور، ترچناپلی سرنگاپٹم، مدورا، کالی کٹ وغیرہ بڑے اور ترقی پذیر شہر تھے۔ اسی طرح بنگالے میں ڈھاکہ، سات گام، خواص پور، (ٹانڈہ) کی آبادی کا اندازہ لاکھوں میں کیا جاتا ہے۔ مگر مرشد آباد کا وہ عروج جسے دیکھ کر کلائیو نے اس کو لندن پر ترجیح دی تھی[4] اورنگ زیب کے کچھ بعد یعنی بارھویں صدی ہجری کے وسط کی بات ہے۔
بہار و دو آب، سندھ و پنجاب، کشمیر و کابل، وسط ہند و دکن میں اور بہت سے آباد و بارونق شہروں کا ہم حال پڑھتے ہیں جس کے یہاں نقل کرنے کی گنجائش نہیں، اجمالی طریق پر یہ بتانا کافی ہوگا کہ زیر نظر عہد کے اواخر میں سلطنت مغلیہ کے پچیس صوبے، اور تخمیناً پانچ ہزار قصبات تھے[5]

---

[1] گزیٹیر، جلد شانزدہم صفحہ ۱۰۸۔
[2] " " " بست وسوم صفحہ ۱۶۴۔
[3] " " " ہژدہم صفحہ ۵۴۔
[4] " " " ہژدہم " ۵۴۔
[5] آئین اکبری کے حوالے سے ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ اکبر کے بارہ صوبوں ہی میں ایک سو پانچ سرکاریں اور دو ہزار سات سو سینتیس قصبات یا پرگنوں کے مرکزی مقام تھے جنھیں اس زمانے کی تحصیل یا تعلقے کے مترادف سمجھنا چاہئے۔ عہد شاہجہانی کے اواخر میں اس کے ۲۲ صوبوں میں قصبات یا پرگنوں کی تعداد ساڑھے چار ہزار کے قریب پہنچ گئی تھی (دیکھو بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۷۱۰) اورنگ زیب کی فتوحات نے دکن کے تین صوبوں کا اور اضافہ کردیا اس لیے سلطنت کے اضلاع وقصبات کی تعداد بھی اسی نسبت سے بڑھنی چاہئے۔

ہر صوبہ دار کے ساتھ جو فوج اور ملازمین و متعلقین کا گروہ کثیر صوبے کے مستقر پر رہتا تھا خود اس کی تعداد پچاس ساٹھ ہزار سے کم نہ ہوتی تھی اور ایک صوبہ دار کے رخصت ہونے کے بعد لازمی طور پر دوسرا اس کی جگہ آجاتا تھا۔ لہٰذا گو یہ لوگ شہر کے اصلی باشندے نہ ہوں تاہم ان کی تعداد کم و بیش برابر شہر میں موجود رہتی تھی۔ پس ان شہروں کی آبادی کا قیاسی تخمینہ ایک لاکھ کرنا بیجا نہ ہوگا۔ اسی طرح سرکاروں کے مرکزی مقامات کی آبادی کا کم سے کم اندازہ پچیس تا پچاس ہزار کیا جا سکتا ہے اور مجموعی طور پر اس بیان کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ غالباً اس وقت ہندوستان میں شہروں کی تعداد اور آبادی موجودہ زمانے سے زیادہ تھی[1] کیونکہ یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ گزشتہ صدی کے اندر مغربی مصنوعات کی روزافزوں برآمد نے ہندوستان کے قریب قریب تمام قدیم صنعتوں کو فنا کر دیا اور لاکھوں دستکار و کاریگر ایسے بیکار و محتاج رہ گئے کہ انھیں مجبوراً شہروں کی سکونت چھوڑ کر دیہات میں جانا اور زرعی پیشے اختیار کرنے پڑے۔ اب تیس چالیس سال سے نئے کارخانوں اور تجارتی سرگرمی کی بدولت دیہات کے مزدور پھر بڑے شہروں میں آنے لگے ہیں بایں ہمہ قرینہ کہتا ہے کہ ہندوستان کی اقتصادی دولت اور مدنیت کو یورپ کی تجارت سے جو نقصان عظیم پہنچ چکا ہے اگر اس کی تلافی ہوتی رہی تو بھی اس نقصان کے پورے ہونے میں ابھی نصف صدی اور درکار ہوگی۔

---

[1] گزشتہ مردم شماری (۱۳۲۶ھ ۱۹۱۱ء) میں ہندوستان کے (جس میں برما بھی داخل ہے) ایسے شہروں کی تعداد جن کی آبادی پچاس ہزار یا اس سے زیادہ ہے کل ۵۰ تھی اور پانچ ہزار یا زیادہ آبادی کے کل ''قصبات'' کا شمار پورا چھ سو بھی نہ تھا! (سینسس رپورٹ ۱۹۱۱ء صفحہ ۳۰ ضمیمہ کی جدول ۴)

باب ۱

دوسری فصل۔ نااہل بادشاہ

(۱) بادشاہ گر سید اور فرخ سیر

شاہ عالم بہادر شاہ نے اپنے بھائی کے مقابلے میں جن بہادر جاں نثاروں کی مدد سے تخت سلطنت جیتا تھا، ان میں سادات بارہہ کے تین بھائی پیش پیش تھے۔ چھوٹا سید نورالدین علی اسی خونریز معرکے میں کام آیا لیکن باقی دو یعنی سید حسن علی (عبداللہ) اور حسین علی مورد اعزاز و اکرام ہوئے اور چار ہزاری منصب پا کر الہ آباد و بہار کی صوبہ داری پر سرفراز کردئے گئے تھے۔ اصل میں بہار و بنگال کی حکومت پر شہزادہ عظیم الشان نامزد ہوا تھا لیکن وہ باپ کے ساتھ دربار میں رہا اور سید حسین علی اس کے نائب کی حیثیت سے پٹنہ بھیجا گیا۔ جہاں ان دنوں عظیم الشان کا منجھلا بیٹا فرخ سیر بھی سکونت گزیں تھا۔ اس شہزادے کے پٹنے میں قیام کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ جب اسے باپ کی نیابت سے علیحدہ کرکے بنگالے سے طلب کیا گیا تو چونکہ اپنے دوسرے بھائیوں کی نسبت دادا (شاہ عالم اول) کے حضور میں اس کی کچھ قدر نہ تھی، لہذا کافی زاد سفر نہ ہونے کے حیلے سے وہ پٹنے میں ٹھیر گیا اور شاہ عالم کی وفات کے وقت تک امیرانہ مشاغل میں اپنا وقت ضائع کرتا رہا[1]۔

دادا کے انتقال کی خبر سن کر اس سے پہلے کہ وراثت سلطنت کا کوئی یقینی فیصلہ ہو، فرخ سیر نے پٹنے میں اپنے باپ عظیم الشان کی بادشاہی کا اعلان کرا دیا اور جب عظیم الشان کے لڑائی میں مارے جانے کے ساتھ یہ اطلاع ملی کہ

---

[1] منتخب اللباب جلد دوم صفحہ ۷۰۰۔ مآثر الامرا جلد اول صفحہ ۳۲۲۔ سیر المتاخرین میں کسی قدر مختلف روایت تحریر ہے جلد دوم صفحہ ۳۸۷۔

باب

جہاندار شاہ اپنے بھائیوں پر غالب آگیا اور اب ان کی اولاد کے قتل وقید کی فکر میں ہے تو اس وقت فرخ سیر نے مقتول باپ کی جانشینی کے دعویٰ سے خود اپنی بادشاہی کا اعلان کردیا اور سید حسین علی کو معاون بنا کر پائے تخت دہلی پر فوج کشی کی۔

جہاندار شاہ کی شکست۔ اور قتل۔

جہاندار شاہ کی فوج سے پہلا مقابلہ کھجوہ (ضلع فتحپور) کے میدان میں ہوا تھا (شوال ۱۱۲۴ھ) لیکن بادشاہی سپاہ اپنے سرداروں کی نااتفاقی اور نااہلی سے بہت جلد متفرق ہوگئی اور اصلی معرکہ آگرے کے قریب انھی میدانوں میں ہوا جہاں تلوار پہلے بھی شہزادگان تیموری کے حق فرمان روائی کا فیصلہ کرچکی تھی۔ داراشکوہ کی طرح جہاندار شاہ بھی اس موقع پر وہ تمام جنگی سازوسامان لے کر لڑنے آیا تھا جو اس کے اقبالمند اجداد نے دہلی اور آگرے کے پائے تخت میں فراہم کردیا تھا۔ تعداد میں اس کی فوج حریفوں سے چار پانچ گنی زیادہ تھی اور آغاز جنگ میں اس کا غلبہ یقینی نظر آتا تھا۔ لیکن فریق مخالف کے تمام سردار جان سے ہاتھ دھو کر بادشاہ وقت کے خلاف شریک جنگ ہوئے تھے۔ شکست و فراری میں بھی انھیں سلامتی کی امید نہ تھی۔ لہذا مایوسانہ جانبازی سے جم کر لڑے اور شام تک ہٹ ہٹ کر حملہ آور ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ عیش دوست بادشاہ مرعوب و مضطرب ہو کر میدان سے بھاگا اور جیتی جتائی لڑائی ہار گیا۔ (ذوحجہ ۱۱۲۴ھ)

جہاندار شاہ دہلی میں صحیح سلامت پہنچ گیا اور چاہتا تھا کہ اپنے وزیر بلکہ مختار کل سپہ سالار ذوالفقار خاں کے ساتھ پنجاب کی طرف نکل جائے اور دوبارہ سلطنت کے لیے قسمت آزمائی کرے لیکن ذوالفقار خاں کے باپ اسد خاں[1] نے بیٹے کو اس فعل سے باز رکھا اور جہاندار شاہ کو قلعے میں

---

[1] امیرالامرا جملۃ الملک آصف الدولہ اسد خاں عہد عالمگیری کا نہایت ممتاز امیر تھا جس کا جہاندار شاہ کے زمانے تک سلاطین تیموری نہایت اعزاز و اکرام کرتے رہے، تفصیلی حالات کے لیے دیکھو مآثرالامرا جلد اول صفحہ ۳۱۰۔

باب ۴

نظر بند کرا دیا۔ فرخ سیر کے سپاہیوں نے یہیں اسے پھانسی دی اور گو خود اسد خاں کی سخت ذلت وخواری کے بعد جان بخش دی گئی لیکن اس کا بیٹا حلفیہ اقرار و عہد کے باوجود قتل کرا دیا گیا اور جہاندار شاہ کے اور بہت سے رفیقوں کا بھی یہی حشر ہوا بلکہ بعض لوگ محض شبہہ پر بے گناہ مارے گئے۔

فرخ سیر کی بادشاہی

فتحمند بادشاہ کی حکومت سال نو (۱۱۲۴ھ / ۱۷۱۲ء) سے شروع ہوتی ہے۔ اسی اعلان تاجپوشی کے موقع پر سید حسن (یا عبد اللہ خاں) کو خطاب قطب الملک اور وزارت کا عہدہ عنایت ہوا اور اس کا چھوٹا بھائی امیر الامرا کے خطاب سے "میر بخشی" یعنی وزارت جنگ کی خدمت پر مامور ہوا۔ انھی بھائیوں کے طفیل فرخ سیر کو بادشاہی نصیب ہوئی تھی اور اب وہ قدرتی طور پر اپنے آپ کو سلطنت کے مراتب جلیلہ کا حقدار سمجھتے تھے۔ لیکن قاعدہ ہے کہ مطلق العنان بادشاہ اپنے کسی امیر یا ماتحت کا زیادہ قوی ہو جانا پسند نہیں کرتے۔ خاص کر ایسی صورت میں جب کہ وہ اس کے شرمندۂ احسان ہوں، انھیں اس کا اقتدار حاصل کرنا اپنی سبکی نظر آنے لگتا ہے۔ فرخ سیر نے بھی اگرچہ اپنے محسنوں کو سلطنت کے سب سے بڑے عہدے دے دیئے تھے لیکن ان کی اعانت و دستگیری کا عار اس کے دل میں خلش پیدا کر رہا تھا اور سیدوں کے خلاف بدظن کرنے والوں کی بھی دربار میں کمی نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی سال میں بادشاہ در پردہ اپنے سابق مددگاروں کا دشمن ہو گیا اور اس کی بدسلوکیاں اس قدر بڑھیں کہ قطب الملک نے تاکیدی خط بھیج کر اپنے بھائی کو مہم جودھپور سے واپس بلا لیا۔

اس جگہ مختصر طور پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مذکورۂ بالا مہم راجہ اجیت سنگھ (راٹھور) کے خلاف بھیجی گئی تھی اور یہ راجہ جس کی بہادری اور حمیت قومی کی تعریف میں بابو جادو ناتھ سرکار نے کرنل ٹاڈ کی دیکھا دیکھی قابل مضحکہ مبالغے سے کام لیا ہے، جسونت سنگھ کا وہی بیٹا تھا جسے درگا داس سنہ ۱۰۹۰ھ / ۱۶۷۹ء میں شاہ اورنگ زیب کے خلاف منتا چھپا کر لے بھاگا اور راجپوتانے میں

باب ۴

شورش و جنگ کا سبب ہوا تھا صفحہ (۲۱۵) بے شبہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اسے جودھپور پر خود مختارانہ قبضہ کرنے کا موقع مل گیا تھا لیکن اول تو شاہ عالم بہادر شاہ نے جب اس پر فوج کشی کی تو اس کو عاجزانہ اطاعت و خراج گزاری کا اقرار کرنا پڑا دوسرے اب امیر الامرا حسین علی کے مقابلے میں بھی اس نے کوئی خاص جوانمردی نہیں دکھائی بلکہ چند ہی شکستیں کھا کر خراج کی رقوم حاضر کر دیں اور ڈولے میں اپنی بیٹی بادشاہ کو بیاہ دی[۱] (۱۱۲۴ھ ۱۷۱۲ء)۔

سیدوں سے مخالفت۔

امیر الامرا نے ان شرائط صلح کو صرف اس لیے قبول کیا کہ اسے دلی واپس پہنچنے کی جلدی تھی جہاں اس کا بھائی بادشاہ کی بدسلوکی سے دربار میں جانا قریب قریب ترک کر چکا تھا۔ شاہ و وزیر کی اس مخالفت میں حق یہ ہے کہ ابتداءً زیادتی فرخ سیر کی تھی۔ بے شبہ سیدوں کے دل میں اس کا قرار واقعی رعب نہ تھا اور نیز یہ کہ وہ اپنے حقوق جتانے میں بھی کسی قدر اپنی حد سے نکل جاتے تھے لیکن اگر بادشاہ میں حکمرانی کی حقیقی قابلیت ہوتی تو ان کے اس غرور کی خود بخود اصلاح ہو جاتی۔ یا دوسری صورت یہ تھی کہ فرخ سیر علانیہ ان سیدوں کے استیصال کی کوشش کرتا جس میں غالباً اسے تھوڑی سی لڑائی کے بعد کامیابی ہو جاتی۔ جس طرح بیرام خاں ترکمان کے مقابلے میں نوجوان اکبر کو ہو گئی تھی؛ لیکن فرخ سیر شجاعت ذاتی کے وصف سے عاری تھا اور اس کی عداوت و ناراضی میں بھی بزدلانہ سازش کی شان تھی جو آخر تک ناکام رہی اور بادشاہ کی بے رعبی کے ساتھ سیدوں کی قوت بڑھتی گئی اور وہ آہستہ آہستہ بادشاہ کے قابو سے بالکل باہر ہو گئے۔

امیر الامرا سید حسین علی کے فوج سمیت پائے تخت واپس آ جانے کے بعد فرخ سیر اپنی جگہ پر اور بھی مضطرب ہو گیا اور اب اس نے ظاہری مدارات و تواضع سے پھر کوشش کی کہ کسی طرح ان بھائیوں کو جدا کر دے

[۱] منتخب اللباب جلد دوم صفحہ ۷۳۰۔ مآثر الامرا جلد اول ۳۲۵ و ۳۲۶ وغیرہ وغیرہ۔

آخر ۱۱۲۵ھ / ۱۷۱۴ء میں امیرالامرا پھر اس بات پر رضامند ہوگیا کہ دکن کی صوبہ داری پر اورنگ آباد چلا جائے۔ مگر اس نے بادشاہ سے بعض شرطیں کرنے کے علاوہ اپنے بڑے بھائی کی قوت بھی کافی مضبوط کردی اور جو امیر سیدوں کے ساتھ نہ تھے انھیں کمزور کرکے پائے تخت دہلی سے دور بھجوادیا اور چلتے وقت بادشاہ کو صاف صاف سنا گیا کہ اگر قطب الملک کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی ہوئی تو اس حقیر کو تین ہفتے کے اندر دلی میں پہنچا سمجھئے گا۔

اب فرخ سیر نے راستے کے ان حکام کو جو سیدوں کے رفیق نہ تھے درپردہ امیرالامرا کا راستہ روکنے اور استیصال کرنے پر آمادہ کیا۔ لیکن سید ان سازشوں سے غافل نہ تھے اور یوں بھی دوسرے امیروں کو ایسے ناقابل اعتبار و بزدل بادشاہ کے واسطے سیدوں سے لڑائی مول لینے میں تامل تھا۔ صرف داؤد خاں حاکم گجرات نے بادشاہ کے خفیہ احکام کی تعمیل کی اور جان پر کھیل کر برہان پور کے قریب امیرالامرا کی فوج کثیر کا مقابلہ کیا (رمضان ۱۱۲۵ھ / ۱۷۱۵ء) لیکن وہ اس لڑائی میں مارا گیا اور اس جاں نثار کی شکست و موت کا حال سنکر بادشاہ کو بھی نہایت صدمہ اور مایوسی ہوئی۔[1]

آئندہ پانچ سال کے عرصہ میں ہندوستان کے چند اندرونی مفسدوں کا بھی ذکر آتا ہے۔ مثلاً عیسیٰ خاں نامی سردار نے پنجاب میں اور جاٹوں نے اکبرآباد کے قریب شورش برپا کی۔ سکھوں نے مشرقی پنجاب میں سر اٹھایا اور لاہور تک صدہا دیہات کو تاراج و پامال کرکے لوگوں پر خوفناک ظلم کئے۔ اور احمدآباد میں ہولی پر ہندو مسلمانوں میں سخت تنازعہ ہوا۔ ان میں سے سکھوں کی شورش و شکست کا حال آئندہ ہماری نظر سے گزرے گا لیکن درحقیقت یہ سب عارضی یا مقامی ہنگامے تھے جنھیں بادشاہی فوجوں نے

---

[1] خافی خاں کی روایت ہے کہ فرخ سیر نے اس رنج و ملال کا قطب الملک کے سامنے بھی اظہار کیا اور کہنے لگا کہ ایسے باوقار نامی سردار کو ناحق قتل کیا! قطب الملک نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ حضور کی خوشی تو یہ تھی کہ میرا بھائی اس پٹھان کے ہاتھ سے مارا جائے! (منتخب جلد دوم ۷۵۵)

باب۲

تھوڑے تھوڑے دن کے بعد رفع دفع کر دیا ورنہ سلطنت میں اصلی خلل بادشاہ اور سیدوں کی اسی مخالفت سے پیدا ہوا کہ قریب قریب ساری فوج اور خزانے پر تو سیدوں کا عمل دخل تھا اور ان کے خلاف منشا بادشاہ خود حکومت کرنی چاہتا تھا۔ یعنی جب موقع ملتا ان کے احکام منسوخ کر دیتا اور اندرونی طور پر انھیں زک دینے کی کوشش کرتا تھا۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ان کوششوں میں فرخ سیر کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی مگر صدر حکومت کی اس اندرونی کشمکش کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عمال سلطنت میں بے دلی اور بے اطمینانی پیدا ہو گئی اور حکومت کی کل چلنے میں جا بجا سے بگڑنے اور اٹکنے لگی۔

سیدوں کا کامل غلبہ

صاحب مآثر الامرا کا یہ قول غلط نہیں ہے کہ اگر یہ "بادشاہ گر" سید اپنے اقتدار کے وقت خود بادشاہ بن جاتے تو سلطنت تیموریوں کے ہاتھ سے نکل کر غالباً عرصۂ دراز تک سادات بارہہ کے خاندان میں رہتی[1] اور اس بات کے تمام قرائن بھی پیدا ہو گئے تھے کہ مغل سلاطین پر سیدوں کے کامل تسلط کا عنقریب یہی نتیجہ ہوگا۔ لیکن بڑی حکومتوں کے انقلاب ظاہرا کارکنان قضا و قدر کی ایسی پوشیدہ مصلحتوں پر مبنی ہوتے ہیں، جن تک انسانی سعی و فکر کی رسائی نہیں۔ سیدوں کو بھی عین عروج کے زمانے میں زوال کا منہ دیکھنا پڑا اور ان کی تباہی کے اسباب اس قدر تیزی سے رونما ہوئے کہ چند ہی مہینے میں ان کی تمام قوت و شوکت اور امیدیں خاک میں مل گئیں۔

شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ جب قطب الملک نے بادشاہ کی عداوت سے تنگ آکر اپنے بھائی کو دکن سے طلب کیا اور وہ ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء کے شروع میں فوج کثیر کے ساتھ پائے تخت میں پہنچ گیا تو اس وقت فرخ سیر کچھ بزدلی اور کچھ اپنی بے بسی کی وجہ سے بالکل ان بھائیوں کے قبضے میں آگیا اور چونکہ انھیں اس سے اپنے منشا کے موافق چلنے کی امید نہ رہی تھی لہذا انھوں نے اسے معزول و محبوس کر کے آخر میں کمال ذلت و عقوبت کے ساتھ

---

[1] جلد اول صفحہ ۳۳۲۔

باب

قتل کرا دیا اور شاہ عالم بہادر شاہ کے ایک مدقوق پوتے رفیع الدرجات کی بادشاہی کا اعلان کر دیا جو محض نام کا بادشاہ تھا؛ (۱۱۳۱ھ ۱۷۱۹ء)۔

سیدوں کی اس ظالمانہ حرکت نے یقیناً ملک میں سناٹا ڈال دیا ہوگا کم سے کم دلی کے لوگ تو انھیں علانیہ گالیاں دیتے تھے اور سادات بارہہ کا بے ہتھیار تنہا شہر میں نکلنا مخدوش ہو گیا تھا۔ سیدوں کے رفیقوں میں اجیت سنگھ (راٹھور) جس نے اپنی بیٹی فرخ سیر کو دی اور اب اس کے قاتلوں کا معین و مددگار بن گیا تھا، سب سے زیادہ مطعون ہوا۔ بایں ہمہ سلطنت کی باگ اور اصلی قوت سیدوں کے ہاتھ میں تھی۔ دکن میں امیر الامرا نے تھوڑی مدت پہلے مرہٹوں سے اتحاد کا جدید معاہدہ کیا اور دس لاکھ روپے سالانہ خراج اور ۱۵ ہزار امدادی فوج کے معاوضے میں انھیں (دکن میں) چوتھ اور سردیس مکھی کا حق عطا کر دیا گیا تھا (۱۱۳۰ھ ۱۷۱۸ء) جس کی عہد محمد شاہی میں باضابطہ تصدیق و توثیق ہوئی[1] دوسرے رفیع الدرجات کی تخت نشینی کے پہلے ہی روز دیوان وزارت سے جزیہ کی منسوخی کا اعلان شائع کیا گیا تھا[2] کہ میواڑ و مارواڑ کے راجپوت نیز شہروں کی ہندو رعایا کے دل میں جگہ ہو جائے اور اگر مسلمان رعایا سیدوں کی مخالفت میں بلوہ کرے تو ہندو ان کا ساتھ نہ دیں۔

الغرض، گو جرم کی اندرونی خلش اور لوگوں کی ناراضی نے قطب الملک اور امیر الامرا کے قلبی سکون و اطمینان کو مٹا دیا ہو، جس کا حال لکھنے میں ہمارے فارسی مورخوں نے شاعرانہ انشا پردازی کا حق ادا کر دیا ہے، بایں ہمہ سیدوں کی ظاہری قوت و اقتدار میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا تھا اور جب

---

[1] اس معاہدے کی شرائط کو گرانٹ ڈف نے مرہٹوں کے سرکاری کاغذات کی بنا پر تفصیل سے بیان کیا ہے (جلد اول، صفحہ ۳۶۸ و ۳۶۹) نیز دیکھیے منتخب اللباب جلد دوم (صفحہ ۷۸۳ تا ۷۸۶) فرخ سیر نے اس معاہدے کو منظور نہیں کیا اور اس کی دو سال بعد عہد محمد شاہی میں باضابطہ تصدیق ہوئی۔

[2] منتخب اللباب جلد دوم صفحہ ۸۱۷ وغیرہ وغیرہ۔

رفیع الدرجات نے چند ہی ماہ میں وفات پائی تو انھوں نے اس کے دوسرے بھائی رفیع الدولہ کو جو پہلے سے بھی زیادہ مریض و کمزور تھا، شاہجہاں ثانی کے لقب سے بادشاہ بنادیا اور وہ بھی دو مہینے کے اندر تمام ہوگیا تو انھوں نے خاندان تیموری کے ایک اور شہزادے[1] کی بادشاہی کا اعلان کردیا جو تاریخ میں ابو المظفر ناصر الدین محمد شاہ کے لقب سے مشہور ہے۔ (ذو قعدہ ۱۱۳۱ھ ۱۷۱۹ء)

[1] ان آخری سلاطین تیموریہ کا نسب ذہن نشین کرنے کے لیے ذیل کا شجرہ سامنے رکھنا مفید ہوگا:-

(۱) شاہ عالم بہادر شاہ اول

- (۲) معز الدین جہاندار شاہ
- عظیم الشان
  - (۳) فرخ سیر
- رفیع الشان
  - (۴) رفیع الدرجات
  - (۵) رفیع الدولہ (الملقب بہ شاہجہاں ثانی)
- جہاں شاہ
  - (۶) روشن اختر محمد شاہ
    - (۷) احمد شاہ

(۸) عالمگیر ثانی
(۹) شاہ عالم ثانی
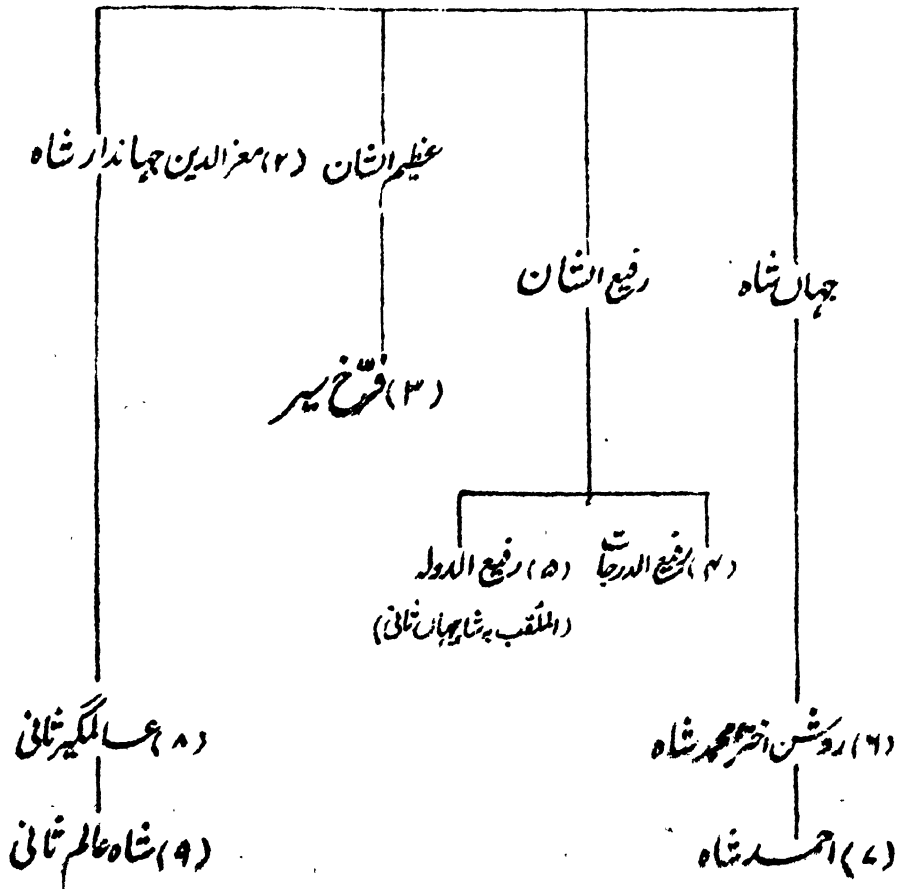
سلطنت کے بڑے امیروں میں اب سیدوں کو سب سے زیادہ دو کی طرف سے خطرہ تھا۔ ایک تو نواب نظام الملک فتح جنگ سے اور دوسرے جے پور کے راجہ جے سنگھ سے جس نے علانیہ ان کی مخالفت پر کمر باندھی اور شہزادہ نیکو سیر کی حمایت کرنی شروع کی۔ اس تیموری شہزادے کو بعض لوگوں نے قید سے نکال کر آگرے میں بادشاہی کا مدعی بنا دیا تھا اور شاہ رفیع الدولہ کی وفات کے وقت بادشاہ گر سید اسی فتنے کو فرو کرنے میں مصروف تھے۔ آخر کچھ جنگی قوت کے رعب اور کچھ دوستانہ خط و کتابت سے جے سنگھ نے دب کر سیدوں کی رفاقت قبول کر لی اور اسی کے چند روز بعد نیکو سیر بھی گرفتار ہو گیا (رمضان ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء) سیدوں نے نواب نظام الملک کے استیصال کی تدبیر شروع کی۔

نواب نظام الملک کا انحراف

سلطنت مغلیہ کے اس نامور امیر کے حالات کسی قدر تفصیل سے آئندہ ہماری نظر سے گزریں گے۔ یہاں یہ لکھنا کافی ہے کہ نواب موصوف نے گزشتہ سیاسی انقلابات میں کمال احتیاط و دور اندیشی سے کام لیا اور سیدوں کو اپنی مخالفت کا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔ لیکن دربار شاہی کے قدیم اور خاندانی امرا اب نظام الملک ہی کو اپنا سردار سمجھتے تھے اور یہی رسوخ و اثر سیدوں کی نگاہ میں خار تھا۔ فرخ سیر کے قتل کے زمانے سے انھوں نے نواب موصوف کو پائے تخت سے دور، مالوے کی صوبہ داری پر بھیج دیا تھا لیکن جب دوسرے خرخشوں سے فرصت ہوئی اور معلوم ہوا کہ اس چھوٹے سے صوبے میں بھی نظام الملک نے اپنی لیاقت و محنت سے خاصی قوت بہم پہنچا لی ہے، تو وہ جا و بیجا اعتراضات کے پردے میں مخالفت کے لیے حیلے تلاش کرنے لگے۔

آخر دربار کے امرا اور خود بادشاہ کے خفیہ خطوط سے نواب نظام الملک کو یقین ہو گیا کہ نہ صرف سلاطین تیموری کی خیر خواہی بلکہ خود اپنی مدافعت کے لیے میان سے تلوار نکالنا ناگزیر ہے۔ قسمت آزمائی کے واسطے دکن سے بہتر کوئی میدان نہ تھا جہاں امیر الامرا کے عزیز اور نائب حکمران تھے۔

باب ۱۲

مرہٹوں کی مدد اور حکومت کے زور سے ان کی قوت بھی نسبتہً بہت زیادہ تھی لیکن نظام الملک کی علانیہ مخالفت کی خبر نے سلطنت کے بہت سے نمک حلالوں کو جو ان بادشاہ گر سادات کی غاصبانہ حکومت سے بیزار تھے! بلا منت رفیق و مددگار بنا دیا چنانچہ اجین سے کوچ ہوتے ہی (رجب ۱۱۳۲ھ) چند روز میں اسیر گڑھ اور برہانپور کے قلعے دار بغیر جنگ نواب نظام الملک سے آملے اور ان مستحکم قلعوں پر نواب نظام الملک کا قبضہ ہوگیا۔

پھر اس باتدبیر سردار نے حیرت انگیز شجاعت و کاردانی کے ساتھ پہلے سید دلاور علی خاں کی فوج کو شکست دی (جنگ حسن پور۔ (قریب برہانپور) شعبان ۱۱۳۲ھ) اور پھر دکن کے نائب صوبہ دار سید عالم علیخاں کا مقابلہ کیا جو اورنگ آباد سے لشکر جرار کے ساتھ پیش قدمی کر رہا تھا۔ بالاپور (برار) کے قریب فریقین میں نہایت خونریز جنگ واقع ہوئی (شوال ۱۱۳۲ھ) سادات بارہہ اور ان کے حلیف بڑی بہادری سے لڑے لیکن تقدیر نے نواب نظام الملک کی قلیل التعداد سپاہ کے حق میں فیصلہ صادر کیا۔ سیدوں کو سخت ہزیمت نصیب ہوئی اور ملک دکن ان کے قبضے سے نکل گیا۔

"بادشاہ گر" سیدوں کا خاتمہ۔

امیر الامرا اور قطب الملک بادشاہ کے ساتھ آگرے میں مقیم تھے کہ ان شکستوں کی سراسیمہ کن اطلاع ملی۔ ممالک دکن کے ہاتھ سے نکلنے کے علاوہ ان لڑائیوں میں ان کے بہت سے عزیز اور بہادر سردار کام آئے تھے۔ ملک میں عام طور پر بلکہ خود دربار میں لوگوں کو ان سے دلی نفرت تھی اور دل ہی دل میں ان کی شکست و زوال کی دعائیں مانگتے تھے۔ بعض سپاہی دکن جانے سے بُعد و مصائب سفر کے حیلے سے انکار کرنے لگے۔ غرض امیر الامرا کو تنہا نواب نظام الملک کے مقابلے میں فوج کشی کی جرأت نہ ہوئی اور آخر میں یہ فیصلہ قرار پایا کہ وہ بادشاہ کو ساتھ لے کر دکن جائے اور قطب الملک پائے تخت میں رہ کر ملک کا انتظام کرے۔

اس تجویز کے مطابق قطب الملک دلی روانہ ہوا اور لشکر شاہی نے

باب

دکن کی جانب کوچ کیا تھا کہ راستے میں نواب اعتماد الدولہ محمد امین خاں کے اشارے سے (جو نواب نظام الملک کا قریبی عزیز اور سیدوں کی جانب سے اندیشہ مند رہتا تھا) امیر الامراحسین علی خاں پر قاتلانہ حملہ ہوا اور ایک مغل امیرزادے نے عرضی دکھانے کے بہانے قریب آ کر خنجر کے ایک ہی بھرپور وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ (ذوحجہ ۱۱۳۲ھ/۱۷۲۰ء) مقتول کے رفیقوں نے اس مصیبت ناگہانی پر شاہی لشکر گاہ میں سخت بلوہ مچا دیا تھا لیکن دو تین دن کی خونریزی میں ان کے بعض سردار قتل و قید ہوئے۔ اکثر نے ساتھ چھوڑ کر بادشاہ کی اطاعت قبول کر لی اور جو باقی بچے تھے وہ بھاگ کر دلی چلے آئے۔ لشکر بادشاہی نے اب علانیہ قطب الملک اور ان باقی ماندہ سادات کے قلع قمع کے ارادے سے پائے تخت کی طرف مراجعت کی۔

ان یاس انگیز حالات میں بھی قطب الملک نے ہمت نہ ہاری اور میدان جنگ میں ایک مرتبہ اور قسمت آزمانے پر تیار ہو گیا۔ اول تو اس نے ایک اور تیموری شہزادے (سلطان ابراہیم بن رفیع الشان) کو کسی طرح رضامند کر کے تخت شاہی پر بٹھا دیا پھر نئی فوج بھرتی کرنے میں خزانوں کے منہ کھول دئے اور بے دریغ روپیہ خرچ کر کے ایک مہینے کے اندر نوے ہزار سوار فراہم کر لیے[1] اور دلی سے باہر نکل کر بادشاہی فوج کا مقابلہ کیا۔ لڑائی پلول سے چند میل آگے موضع حسن پور کے میدان میں ہوئی (ماہ محرم ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۰ء نومبر) سادات بارہہ نے سپہ گری اور جانبازی کا جو کمال دکھایا اس کے صراحتاً بیان کرنے کی گنجائش نہیں۔ ان کی نئی بھرتی کی ہوئی فوج تو پہلے ہی دن کی زد و خورد میں متفرق ہو گئی لہذا لڑائی کا سارا بار سادات بارہہ اور ان کے سچے مددگاروں پر پڑا جن کی کل تعداد بیس ہزار بھی نہ تھی۔ مقابلے میں کہیں زیادہ فوج اور سلطنت مغلیہ کا بہترین توپ خانہ تھا اور اس نے دن بھر کی شدید خونریزی

---

[1] منتخب التواریخ جلد دوم ۹۱۸۔ مورخ اس وقت پائے تخت دہلی میں موجود تھا اور جہاں تک ممکن ہے اس قسم کی معلومات کو سرکاری دفاتر سے حاصل کرتا ہے۔

باب ۴

اور پر مشقت بھاگ دوڑ کے بعد رات کو بھی سیدوں کو چین نہیں لینے دیا بلکہ چودھویں رات کی چاندنی میں برابر ان پر گولے چلاتا رہا۔

آخر دوسرے دن وہ دلیر سردار جو میدان جنگ سے قدم ہٹانا گوارا نہ کرتے تھے چند گھنٹے کی مزید کشمکش میں یا تو مارے گئے یا زخمی اور بیکار ہو کر قید ہو گئے۔ قطب الملک اور نام نہاد بادشاہ سلطان ابراہیم بھی زندہ اسیر ہوئے تھے۔ محمد شاہ نے ان کی جاں بخشی کی لیکن عام روایت کے بموجب سید حسن علی قطب الملک کو آئندہ سال (۱۱۳۴ھ ۱۷۲۱ء) زہر دلوا دیا گیا۔

محمد شاہ کی تاریخ

بادشاہ گر سادات کے خاتمے اور محمد شاہ کے قوت و اختیار حاصل کرنے کی ملک میں عام طور پر خوشی منائی گئی۔ لیکن یہ خوشی اگر جذبہ بادشاہ پرستی پر نہیں بلکہ آئندہ نظم و نسق کی بہتری اور ملکی رفاہ و بہبود کی امیدوں پر مبنی تھی تو اس کا انجام رنج و مایوسی کے سوا کچھ نہ تھا۔ کیونکہ اکبر و اورنگ زیب کا نیا جانشین درحقیقت اپنے اقبالمند اجداد کی شاہانہ صفات سے عاری تھا۔ اسے اپنے عیش و عشرت کے شغلوں میں معاملات ملک پر توجہ کرنے کی فرصت نہ تھی۔ وہ محلسرائے شاہی کی بیگمات سے بھی زیادہ سلطنت کے حالات سے بے خبر اور اس کی خرابی کی طرف سے بے پروا تھا۔ حتیٰ کہ اس کی دادی (شاہ عالم بہادر شاہ کی ملکہ) مہر پرور کی نسبت ہم جا بجا پڑھتے ہیں کہ وہ بھی اپنے مدہوش پوتے کو بار بار اس خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کرتی تھی جس کا صریح نتیجہ زوال و ادبار تھا۔

بہت سی ہمعصر تصانیف و تواریخ[1] کے دیکھنے سے یہ توصاف ظاہر

---

[1] اس عہد کی بہت سی تاریخیں کامل یا ناقص حالت میں اب تک محفوظ ہیں اگرچہ ان کی بڑی تعداد یورپ کے کتب خانوں کے سوا ہندوستان میں نہیں ملتی۔ ایلیٹ ہی نے اس قسم کی ساٹھ سے زیادہ ہمعصر تواریخ جمع کی تھیں جن میں زیر نظر عہد کے متعلق تاریخ چغتائی، تاریخ ہندی، جوہر صمصام

باب

ہے کہ اہل ہند بادشاہ کی اس نا اہلی کا پوری طرح احساس رکھتے تھے اور نادر شاہ کے حملے نے یقیناً انھیں اس کے بُرے انجام سے بھی گویا پیش از پیش آگاہ کر دیا تھا۔ لیکن ان کے ہاں جس شخصی بادشاہی کا صدیوں سے رواج پڑ گیا تھا یہ اسی کا خمیازہ تھا کہ وہ اس خرابی کا کوئی علاج نہ کر سکتے تھے۔

طبقۂ امرا

جیسا کہ بار بار پہلے بیان ہو چکا ہے، درحقیقت اس خرابی کا چارہ کار صرف یہی ہو سکتا تھا کہ طبقہ امرا میں سے کوئی ایک یا چند اولوالعزم امیر مل کر ایسے نا اہل بادشاہ یا اس کے خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر دیں۔ لیکن ہم اجمالاً پہلی فصل میں لکھ چکے ہیں کہ ہندوستان کی دولت و ثروت نے خود اس طبقۂ امرا کو نہایت عیش پسند اور تن آسان بنا دیا تھا اور اگر ان میں اس قسم کا انقلاب حکومت پیدا کرنے کی قابلیت تھی بھی تو کچھ باہمی رقابت اور زیادہ تر سادات کی گزشتہ ناکامی ارادوں کو پست کر دینے کے واسطے کافی تھی۔ دوسرے محمد شاہ کو کبھی کبھی سطوت بادشاہی دکھانے کا جوش آجاتا تھا اور ہم دو چار مرتبہ اس کی سیاست اور خود فوج کشی کرنے کا حال بھی پڑھتے ہیں۔ بہر حال آئندہ تیس چالیس برس تک ہم ان امیروں کی ساری کوشش و قابلیت ادنیٰ اغراض کے لیے سازش و ریشہ دوانی میں صرف ہوتے دیکھتے ہیں، اور فقط عہدۂ وزارت یا سپہ سالاری ان کا مطمح نظر رہ جاتا ہے حتیٰ کہ محمد شاہ کے ستائیس اٹھائیس برس (۱۱۶۱ھ ۱۱۳۱ھ) تک تخت نشیں رہنے کے طویل زمانے میں، انقلاب سلطنت اور حصول بادشاہی درکنار کسی مسلمان امیر کو اپنے اپنے مقام پر علانیہ خود مختاری کا اعلان کرنے کی بھی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ تذکرہ آنند رام، تاریخ احمد شاہ، بیان واقع قابل ذکر ہیں (البٹ جلد ہشتم، خاص کر ملاحظہ ہوں صفحات ۱ تا ۱۴۰) ایک اور قلمی رسالہ "واقعہ خرابی دہلی" بھی راقم الحروف کے سامنے ہے جس میں ایک ہمعصر راوی نے نادر شاہ کے حملے کے حالات بیان کیے ہیں۔

جسارت نہ ہوئی اور اس عرصے میں ادھر تو نظم و نسق کی اندرونی خرابیاں بڑھتی رہیں اور ادھر حکمراں طبقے کے افراد سے انتظام حکومت اور اشتراک عمل کی صلاحیت ہی رفتہ رفتہ مفقود ہو گئی۔

نادر شاہ کا حملہ۔

مگر غالباً اہل ہند کی اس داستان زوال و ادبار کا سب سے عبرتناک واقعہ یہ ہے کہ اسی زمانے میں نادر شاہ کے حملے اور پایۂ تخت دہلی کی بربادی نے بھی ان کے ارباب حل و عقد کو ان خرابیوں کی اصلاح پر متوجہ نہ کیا جن کی بدولت انھیں یہ روز بد دیکھنا پڑا تھا!

ہمارے بعض ہمعصر مورخ اس حملے کو دربار محمد شاہی کے ایرانی امرا کی سازش و غداری کا نتیجہ بتاتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے دہلی کے لوگوں میں اس قسم کے شبہات بہت بعد میں اس وقت پیدا ہوئے تھے جب کہ برہان الملک سعادت خاں حملہ آوروں سے جا ملا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی سرحدوں تک نادر شاہ کے آنے کا سبب سلطنت ایران کی اندرونی لڑائیاں تھیں۔ ان لڑائیوں کے متعلق اجمالاً اس قدر بیان کرنا ضروری ہے کہ بارھویں صدی ہجری کے آغاز میں مغربی افغانستان کے ان قبائل میں جو مدت سے ایرانیوں کے حلقہ بگوش تھے 'حریت و خود مختاری کی ایک نئی روح سرایت کر گئی تھی اور ۱۱۲۱ھ میں ان کے مشہور سردار میرویس نے قندھار چھین کر غلزیوں کی ایک آزاد حکومت قائم کر لی تھی۔ پھر ایرانیوں کے پیہم حملوں کی ناکامی نے افغانوں کی جرأت اس قدر بڑھائی کہ انھوں نے نہ صرف ہرات و خراسان کے علاقے چھین لیے بلکہ ایران خاص کے اقطاع پر حملہ کیا اور میرویس کے بہادر فرزند نامور محمود نے تھوڑی سی فوج سے چند سخت شکستیں دے کر پایۂ تخت اصفہان کو تسخیر کر لیا (۱۱۳۵ھ — ۱۷۲۲ء) ایرانیوں کی ہمت پستی کے آخری مدارج تک پہنچ گئی تھی اور ان کی اس سے زیادہ ذلت شاید کبھی نہ ہوئی ہو گی کہ شاہان صفوی کے تخت پر آئندہ چھ سال تک غلزئی چرواہے بادشاہی کرتے رہے!

آخر ملک ایران کے دن پھرے نادر قلی جو ابتدا میں نیم قزاقانہ زندگی

بسر کرتا تھا شہزادۂ طہماسپ بن حسین صفوی کا معین و مددگار ہو گیا اور اسی نے اپنے ہموطنوں میں دوبارہ قومی جوش پیدا کیا۔ پھر چند سال کی مسلسل جدوجہد اور جنگی کامیابیوں سے نہ صرف ایران کو اغیار کی محکومی سے نجات دلائی بلکہ خراسان و ہرات کو بھی دوبارہ داخل سلطنت کیا اور یہی جنگی کارنامے تھے جن کے صلے میں، طہماسپ کی معزولی کے کچھ عرصے بعد، حکام اور فوجی سرداروں نے ایک جلسہ عام میں اسے اپنا بادشاہ منتخب کر لیا (سنہ ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۶ء)۔

اب نادر شاہ نے اپنے قدیم دشمنوں کے سب سے پہلے اور نیز سب سے آخری، مرکز پر فوج کشی کی اور بڑے ساز و سامان کے ساتھ قندھار پر حملہ آور ہوا۔ ہرات کے ابدالی یا درانی قبائل بھی جن کی اپنے ہموطن غلزئیوں سے ان بن رہتی تھی اس موقع پر ایرانیوں کے ساتھ ہو گئے تھے بایں ہمہ غلزئیوں نے ہمت نہ ہاری بلکہ تقریباً ایک سال تک قندھار میں قلعہ بند ہو کر نہایت سرفروشی سے جنگ کرتے رہے۔ اور ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۸ء میں جب یہ مستحکم قلعہ فتح ہوا تو اس وقت بھی نادر شاہ نے ایسے بہادر دشمنوں پر کوئی خاص تشدد کرنا پسند نہ کیا بلکہ تا امکان کوشش کی کہ وہ گزشتہ عداوتوں کو بھول کر پھر ایران کے ماتحت و مددگار بن جائیں۔

لیکن غلزئیوں کی یہ دلیرانہ مدافعت سلطنت مغلیہ کے حق میں نہایت ناسازگار ثابت ہوئی کیونکہ بظاہر قندھار کے اسی طویل محاصرے کے زمانے میں نادر شاہ حکومت دہلی کی خرابی اور کمزوری معلوم کرنے کا موقع ملا۔ اس نے دربار دہلی سے خط و کتابت بھی کی تھی کہ بعض افغان سردار جو مغلوں کے علاقے میں پناہ گزیں ہوئے ہیں وہاں سے نکال دیئے جائیں یا گرفتار کر لیے جائیں۔ لیکن یہاں کسی نے اس کے مراسلے پر توجہ نہیں کی اور تسخیر قندھار سے فرصت ملتے ہی نادر شاہ نے اسی حیلے سے غزنی اور کابل کو بلا دقت فتح کر لیا جہاں مغلوں کی تھوڑی سی فوج رہتی تھی۔

اس موقع پر جب ہم یاد کرتے ہیں کہ شاہ اورنگ زیب کے

باب ۱

آخری عہد تک اس کے فرزند اور امرا نہ صرف قندھار بلکہ ہرات و بدخشاں کو بھی دوبارہ فتح کرنے کی آرزو اور تیاریاں کیا کرتے تھے تو اندازہ ہوتا ہے کہ گزشتہ پچاس برس نے ہندوستان کے حکمران طبقے میں کتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا تھا کہ آج انھی اجداد کے جانشینوں کے دیکھتے دیکھتے خود سلطنت کا ایک صوبہ بیرونی دشمنوں کے قبضے میں آگیا اور انھوں نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی! پھر یہ کہ صوبۂ کابل درحقیقت ان دنوں سلطنت ہند کا سب سے ضروری اور مضبوط مورچہ تھا اور اس کا ہاتھ سے نکل جانا گویا آئندہ بیرونی حملوں کا دروازہ کھل جاتا تھا۔ مگر کمال حیرت و عبرت کی بات ہے کہ محمد شاہی دربار میں ایک امیر، نواب نظام الملک آصف جاہ، کے سوائے کوئی شخص بھی اس نقصان کی اہمیت کو نہ سمجھتا اور نہ سمجھنا چاہتا تھا۔ اور گو سیدوں کے قلع قمع ہونے کے بعد نواب نظام الملک کو خطاب "آصف جاہ" اور پھر عہدۂ وزارت دے کر بادشاہ نے قدر افزائی نیز اظہار احسان مندی میں کوتاہی نہ کی تھی، لیکن دراصل وہ اور اس کے نو دولت امیر یا خوشامدی مصاحب نواب نظام الملک سے بالطبع گھبراتے تھے "و در مجلس او باشی خود ذات معزالیہ را مخل می دانستند" حتیٰ کہ اول اول جب خاندان صفوی کی مشکلات و پریشانی کا حال سنکر آصف جاہ نے مشورہ دیا کہ یہ وقت ہے کہ حکومت ہندوستان شاہ ایران کی مدد کرے تاکہ بابر و ہمایوں پر اس خاندان کے بادشاہوں کے جو احسانات ہیں، ان کا عوض ہو، تو کسی نے اس قول پر اعتنا نہ کی[1] اور دوسری مرتبہ جب نادر شاہ کے قندھار پر پیش قدمی کی اطلاع ملی اور نواب موصوف نے بادشاہ سے اصرار کیا کہ احتیاط کا مقتضی یہ ہے کہ اس وقت ہندوستانی افواج آراستہ اور سرحدوں کے قریب رکھی جائیں، تو بادشاہی مصاحبوں نے طرح طرح سے اس کی تردید کی اور بعض نے علانیہ کہا کہ بادشاہ کو پایۂ تخت دہلی سے

---

[1] منتخب اللباب جلد دوم صفحہ ۹۲۰۔

باب ۲

باہر لے جانے میں آصف جاہ کی کچھ دغا نظر آتی ہے ورنہ والئ ایران کی یہ مجال کب ہے کہ ہندوستان کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھ سکے[1]۔

کابل کی فتح کے بعد پھر آصف جاہ نے محض سلطنت کی رفاقت و خیر خواہی سے بادشاہ کو سمجھایا تھا کہ جب تک خود بدولت اس مہم پر متوجہ نہ ہوں گے کوئی امیر یا سردار ایرانیوں سے لڑنے نہ جائے گا اور بادشاہ نے بھی جوش میں آکر فوج کے کوچ کا حکم صادر کیا اور جنگی علم شہر کے باہر نصب کرادئے گئے تھے لیکن یہ مئی جون (۱۷۳۸ء) کی گرمی کا زمانہ تھا (ربیع الاول ۱۱۵۱ھ) شاہی امرا جنھیں دن کے وقت خسخانوں سے باہر نکلنا ناگوار ہوتا تھا جنگی سفر کے نام سے لرز گئے اور انھوں نے بادشاہ کو، جو ان سے بھی زیادہ آرام طلب تھا، پھر سمجھا بجھا کر سفر سے باز رکھا۔ جھنڈے تین چار مہینے تک بادلی کے میدانوں میں کھڑے ہی رہے اور نادر شاہ دریائے سندھ کو عبور کر کے لاہور پہنچ گیا! اب محمد شاہ کو واقعی تردد و انتشار ہوا اور جہاں پناہ شہر سے ایک دو منزل باہر بھی تشریف لے آئے۔ لیکن پھر مصاحبوں نے اطمینان دلا دیا اور جب تک لاہور فتح ہو کر نادر شاہ کے خاص دہلی پر بڑھنے کی خبر نہ ملی، افواج شاہی پائے تخت ہی کی نواح میں مقیم رہیں۔

جنگ کرنال

آخر محمد شاہ کو خطرے کا بخوبی احساس ہو گیا اور اب ہندوستانی فوج منزل بہ منزل بڑھ کر کرنال کے قریب خیمہ زن ہوئی جس سے چند میل فاصلے پر نادر شاہی لشکر آپہنچا تھا۔ اس موقع پر جنگ کی بہترین تدبیر وہ تھی جسے آزمودہ کار آصف جاہ نے اختیار کیا۔ یعنی نہایت مستحکم مورچے بنا کر ایک دائرے میں اپنی فوجیں اتار دیں کہ توپ خانے کی آڑ میں مدافعانہ جنگ کریں جو یقیناً چند روز میں ایرانی حملہ آوروں کو مایوس و ناکام واپسی پر مجبور کر دیتی۔ لیکن اس طرح خود محصور ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ لشکر شاہی میں رسد رسانی کی دقت اور اجناس کی گرانی زیادہ ہو گئی۔

---

[1] : واقعہ خرابی دہلی، صفحہ ۱۱ و ۱۲۔

اب

احمق سپاہی اور آصف جاہ کے دشمن امرا اسے بزدلی اور غلط رائی کا الزام دینے لگے اور آخر میں برہان الملک سعادت خاں (والئ اودھ) نے پہنچکر جنگ کا یہ نقشہ ہی الٹ پلٹ کردیا۔

یہ سردار وسط ذوقعدہ میں اپنی فوج لے کر شاہی لشکر سے آملا تھا اور آتے ہی اسی روز مصر تھا کہ مورچوں سے نکل کر ایرانیوں پر حملہ کیا جائے لیکن آصف جاہ نے اس کی اجازت نہ دی اور محمد شاہ بھی اتنی سمجھ رکھتا تھا کہ اس موقع پر اس نے تمام اختیارات نواب نظام الملک آصف جاہ کے حوالے کردیئے تھے۔ بایں ہمہ دوسرے دن برہان الملک نے بلا اجازت خود ہی ایرانیوں پر حملہ کردیا اور فوج بادشاہی کا نادان و ناتجربہ کار سپہ سالار صمصام الملک بھی اپنی جمعیت لے کر اس کی مدد کو پہنچ گیا اور گھر کر مارا گیا۔ خود برہان الملک نے ہتھیار رکھ کر گرفتار ہونا قبول کرلیا۔ اس واقعے سے جیسا کہ بعض ہمعصر مورخ بیان کرتے ہیں اکثر لوگ اور خود بادشاہ یہ نتیجہ نکالتے تھے کہ برہان الملک پہلے سے دشمن سے ملا ہوا تھا۱ اور حقیقت میں اس طرح بادشاہی اجازت کے بغیر آتے ہی اپنے مورچوں سے نکل کر غنیم کی صفوں میں ایسے مقام پر پہنچ جانا کہ بلا دقت نرغے میں آگیا اور پھر بہت جلد ہتھیار ڈال دینا اس قیاس کو کافی تقویت پہنچاتے ہیں برہان الملک ایک ایرانی نژاد، خود مطلب آدمی تھا اور بہت ممکن ہے کہ اس نے اپنے ہم وطن ہم مذہبوں کے مقابلے میں ہندوستان کے سنی بادشاہ سے بے وفائی کرنے میں تامل نہ کیا ہو لیکن اگر اس حملے اور گرفتاری کو صرف اس کے جوش تہور و جلد بازی کا نتیجہ سمجھا جائے تو بھی اس میں کچھ کلام نہیں کہ گرفتار ہونے کے بعد اس نے اپنے ولی نعمت اور سلطنت ہند کے حق میں سخت بے وفائی کی اور علانیہ نادر شاہ کے ساتھ ہوگیا۔

مصالحت و دغابازی

بایں ہمہ جنگ کا ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ لشکر شاہی اپنے مستحکم

۱ مثلاً دیکھو واقعۂ خرابی دہلی صفحات ۹، ۲۳، ۴۲، ۵۰ وغیرہ۔

باب

مورچوں میں اسی طرح توپیں نصب کیے مقیم تھا اور ان استحکامات پر نادر شاہ کو یورش کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی ادھر تعویق فریقین کے لیے کمزوری اور پریشانی کا موجب تھی لہٰذا وہ ان شرائط پر آمادۂ مصالحت ہو گئے کہ حملہ آوروں کو دریائے سندھ کے پار کا ملک اور دو کروڑ روپیہ تاوان دے کر صلح کر لی جائے۔
یہ بات صاف طور پر نہیں معلوم ہوتی کہ نادر شاہ نے برہان الملک کی اغوا سے فریب کا ارادہ کس وقت کیا۔ لیکن یہ مسلم ہے کہ مذکورۂ بالا قرار داد کے بعد جب محمد شاہ اور اکثر ہندوستانی امیر اس کے لشکر میں دوستانہ طریق پر ملاقات کے واسطے آئے تو اس نے انھیں دغا بازی سے حراست میں لے لیا اور قزلباشوں کے چند دستوں کو لشکر شاہی، نیز دہلی بھیج کر قلعے کے شاہی کارخانوں پر اپنے پہرے لگا دیئے۔ ان قزلباشوں کی رہنمائی اور سرداری کی خدمت برہان الملک نے انجام دی[1]

پھر نادر شاہ، بادشاہ اور امرائے دہلی کو ساتھ لیے ہوئے پائے تخت میں آیا (ذوحجہ ۱۱۵۱ھ ۱۷۳۹ء) اور قلعۂ شاہی میں جس قدر زر و جواہر، قیمتی ساز و سامان اور نادر و بے بہا اشیا صدیوں سے جمع تھیں قریب قریب سب پر قبضہ کر لیا۔ اتفاق سے انھی دنوں اس کے ایرانی سپاہیوں اور اہل شہر میں ہنگامہ ہو گیا جس میں بہت سے قزلباش مارے گئے اور نادر شاہ کو قتل عام اور شہر کی تاخت و تاراج کا خداداد حیلہ مل گیا۔ یہ ظالمانہ قتل جس میں "مرد و زن، جوان و پیر، تندرست و بیمار، بچہ و معصوم" کسی کی رعایت نہیں کی گئی کامل "دو پہر" یعنی آٹھ نو گھنٹے تک جاری رہا اور اس میں کام آنے والوں کا کم سے کم اندازہ تیس ہزار نفوس کیا گیا ہے[2] پھر شہر کے

---

[1] واقعہ خرابی دہلی، صفحہ ۶۳۔

[2] یہ خود نادر شاہ کے ملازم مرزا مہدی مؤلف نادر نامہ کا اندازہ ہے۔ بعض مصنفوں نے مقتولین کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زیادہ بتائی ہے۔ لیکن "واقعہ خرابی دہلی" اور دیگر قرائن سے بھی مذکورۂ بالا قول قرین صحت معلوم ہوتا ہے۔

باب

ہر مکان کی تلاشی لی گئی اور جو کچھ زرِ نقد، زیورات یا قیمتی سازوسامان ملا سب ایرانیوں نے لوٹ لیا۔ اس خانہ تلاشی اور زرستانی میں نہایت اہتمام و بے دردی سے کام لیا گیا کیونکہ نادر شاہ کو ہندوستان میں ملکی مقبوضات یا مستقل قیام کی امید نہ تھی۔ وہ ڈیڑھ دو مہینے کے بعد ہی دہلی سے واپس ایران چلا گیا (صفر ۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء) البتہ ہندوستان کے دولتمند پائے تخت سے وہ اور اس کے سپاہی بے حساب دولت لوٹ کر لے گئے جس میں کروڑہا روپے کے لاثانی جواہرات، گراں بہا کپڑے اور ظروف و زیورات، ہاتھی گھوڑے اور مختلف سازوسامان کے علاوہ کم سے کم پندرہ کروڑ روپیہ نقد تھا۔[1]

تیسری فصل۔ زوال سلطنت

نادر شاہ کے حملے نے مغل بادشاہ کی نااہلی اور مرکزی حکومت کی کمزوری کو عالم آشکارا کر دیا تھا بایں ہمہ اس وسیع سلطنت کا شیرازہ بکھرنے میں بہت دیر لگی اور اس گئی گزری حالت میں بھی، کم سے کم محمد شاہ کے جیتے جی کسی ہندوستانی امیر یا صوبہ دار کو علانیہ سلطنت مغلیہ سے انحراف یا خود مختاری کا دعویٰ کرنے کی جسارت نہ ہوئی۔ حتیٰ کہ بعض دوسرے صوبہ داروں یا رئیسوں کی طرح نادر شاہ کے جانے کے بعد خود مرہٹوں نے، جو سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر سب سے زیادہ قوی اور سرکش ہوتے جاتے تھے، بادشاہ کو باضابطہ اپنی اطاعت و ہوا خواہی کا یقین دلایا۔[2]

---

[1] نادر نامہ مرزا مہدی۔

[2] گرانٹ ڈف، تاریخ مرہٹہ، جلد اول صفحہ ۴۵۶۔

باب صوبوں کی حالت

مذکورۂ بالا حالات کو خاص طور پر ذہن نشین کرانے کی ضرورت ہے کیونکہ اس زمانے کے انگریز تاریخ نویس اورنگ زیب کے بعد ہی مغلیہ سلطنت کا خاتمہ منانے لگتے ہیں جو محض ان کی نافہمی یا رقیبانہ تعصب کی دلیل ہے۔ جیساکہ ہم نے اوپر بیان کیا یہ بالکل سچ ہے کہ محمد شاہ کی نااہلی سے مرکزی حکومت میں کمزوری اور امرا کی باہمی عداوت و سازش سے نہایت بے استقلالی پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن تمام تاریخی شہادتیں متفق ہیں[1] کہ محمد شاہ کے انتقال تک (ربیع الثانی سنہ ۱۱۶۱ھ) سلطنت کی ظاہری وسعت و شان میں کوئی نمایاں فرق نہ آیا تھا۔ نادر شاہ کے جانے کے بعد ہی مختلف حصص ملک سے رئیس و راجا، حکام و نظما نذرانے اور پیش کش ارسال کر رہے تھے جنکی نادر شاہی تاخت و تاراج کے بعد دربار دہلی کو سخت ضرورت تھی۔ بنگالے کے سب سے بعید صوبے میں علی وردی خاں (مہابت جنگ) نے لڑکر سرفراز خاں سے حکومت چھین لی تھی (سنہ ۱۱۵۳ھ) لیکن خود برابر بادشاہ کی اطاعت و ماتحتی کا اقرار کرتا اور کئی سال تک مقررہ مالگزاری بھی حضور میں بھیجتا رہا۔ بالفاظ دیگر اگرچہ مرکزی حکومت اسے بزور اپنا ماتحت نہ رکھ سکتی تھی لیکن خود اس نے ماتحتی سے علانیہ انحراف نہیں کیا۔[2] اسی طرح دکن کے صوبے محمد شاہ کی وفات تک نظام الملک آصف جاہ اول کی حکومت میں رہے اور نواب موصوف نے بادشاہ کی رفاقت و نمک حلالی میں کبھی کمی نہیں کی حالانکہ دربار میں اکثر اس کے ساتھ ناقدر شناسی کا برتاؤ ہوا۔

برہان الملک سعادت خاں نادر شاہ کے دہلی پہنچنے کے بعد ہی مرگیا تھا، اور اب اس کا بھتیجا صفدر جنگ والئ اودھ مقرر ہوا تھا۔ وہ بھی احمد شاہ کے زمانے تک دربار دہلی کا امیر اور یہاں کی اندرونی سازشوں میں برابر کا حصہ دار رہا اور اس کی زندگی تک حکومت اودھ

[1] دیکھو الیٹ جلد ہشتم جس میں متعدد ہمعصر تاریخوں کا انگریزی خلاصہ کردیا ہے۔
[2] ریاض السلاطین صفحہ ۳۲۵۔ سیر المتاخرین ۴۹۴ وغیرہ۔

کو علمِ خود مختاری بلند کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

البتہ مالوے اور گجرات کا تعلق مرہٹہ حملہ آوروں نے قریب قریب سلطنت مغلیہ سے منقطع کر دیا تھا اور اپنی جگہ پر خود مرہٹہ ریاست کو آزاد سمجھنا چاہئے جس کا حال آگے آتا ہے۔ خاص پائے تخت کے قریب روہیل کھنڈ کے پٹھان نہایت قوی اور سرکش ہو گئے تھے اور اسی طرح آگرے کے نواح میں جاٹوں نے شورش بپا کر رکھی تھی اور نہ صرف بادشاہی مالگزاری نہ ادا کرتے تھے بلکہ جب کبھی موقعہ ملتا دیہات و قصبات کو لوٹ لیتے تھے۔ سکھوں کا پنجاب میں ابھرنا کچھ بعد کا واقعہ ہے مگر مذکورۂ بالا اجمالی حالات ہی کو پڑھ کر یہ نتیجہ نکالنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ محمد شاہ کے آخر زمانے تک صرف ان علاقوں میں سلطنت مغلیہ سے آزادی حاصل کرنے کی خواہش اور شورش کے آثار نمایاں ہوئے جہاں ایک ہی قوم کے بہت سے لوگ آباد اور جنگجوئی یا قزاقی کا فطری میلان رکھتے تھے۔ ورنہ جہاں کہیں طبقۂ اعلیٰ کے منتظم افراد کے ہاتھ میں حکومت تھی، وہاں مغل بادشاہ کا خطبہ و سکّہ جاری تھا اور بے شبہہ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گو دہلی کے تاجدار کو بزمِ عیش سے نکلنا گوارا نہ تھا، لیکن اگر وہ چاہتا تو اب بھی بہت کافی جنگی قوت فراہم کر سکتا تھا۔

جنگ سرہند

اس کا بیّن ثبوت سرہند کی جنگ ہے جو محمد شاہ کے آخری ایّام حیات میں ہوئی اور جہاں مغل سرداروں کو باہمی ناچاقی اور بری تدابیر جنگ کے باوجود ہندوستانی سپاہ نے افغان حملہ آوروں کو سخت شکست دی اور دور تک ان کا تعاقب کیا، لیکن اسی ضمن میں ہم کو ان حملہ آوروں کے سردار احمد شاہ ابدالی کے حالات پر ایک نظر ڈالنی چاہئے کیونکہ اس نے سرہند میں شکست کھانے کے بعد پھر ہندوستان پر کئی حملے کئے اور دربارِ دہلی کے معاملات میں اس کی مداخلت بھی (اگرچہ وہ ہمدردی سے خالی نہ تھی) زوال پذیر سلطنت مغلیہ کے تار و پود بکھرنے کا ایک بالواسطہ سبب بن گئی۔

احمد شاہ ابدالی

ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ نادر شاہ کو فتح قندھار میں خراسان کے ابدالی

دیا درّانی) قبائل سے بھی مدد ملی تھی جو اپنے غلزئی ہمسایوں کے رقیب اور دشمن تھے۔ انھی ابدالیوں میں سب سے معزز قبیلۂ سدوزئی کا سردار احمد خاں تھا اور جب نادر شاہ اندرونی سازشوں کا شکار ہوا (۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۷ء) تو وہی اس کے مشرقی مقبوضات کا مالک بن گیا۔ قندھار میں اس کی تخت نشینی کی رسم منائی گئی اور ایک طرف خراسان و بلخ، اور دوسری طرف سندھ، کابل اور کشمیر پر بلا وقت اس کا قبضہ ہو گیا۔ افغانی قبائل کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کیا بات ہو سکتی تھی کہ خود ان کا ایک ہمقوم اور لائق سردار اتنی وسیع سلطنت کا خود مختار بادشاہ ہو۔ اور سلطنت ایران یا ہندوستان میں یہ قوت نہ تھی کہ اس موقع پر وہاں کے بادشاہ اپنے مقبوضات واپس لینے کی کوشش کرتے؛ درحقیقت ان کی اندرونی کمزوری نے خود احمد شاہ کو ان پر چیرہ دست کر دیا اور ممالک ایران پر صرف مشہد کے قریب تک قبضہ رکھنا خود اس کی احتیاط پسندی اور مصلحت اندیشی تھی ورنہ اہل ایران اسے اور آگے بڑھنے سے بھی نہ روک سکتے تھے؛ قریب قریب یہی حال ہندوستان کا تھا۔ وہ حکومت جس نے مرہٹوں کے گجرات و مالوہ بلکہ آگرے تک بڑھنے اور لوٹ مار مچانے کا تدارک نہ کیا، افغانوں کو پنجاب میں بڑھنے سے کب باز رکھ سکتی تھی؟ جو کہیں زیادہ جفاکش اور دلیر سپاہی تھے اور قبضۂ پنجاب کے جواز میں جھوٹی سچی بہت سی دلیلیں بھی پیش کر سکتے تھے؛ غرض احمد شاہ ابدالی[1] نے تخت نشین ہونے کے تھوڑے ہی عرصے بعد ہندوستان پر فوج کشی کی اور محض مغل امراء کی باہمی عداوت اور کمال نااہلی کی بدولت بغیر لڑے بھڑے لاہور پر قابض ہو گیا۔

یہ ۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۷ء کے بالکل آخری ایام کا ذکر ہے۔ اور حملہ آوروں نے دہلی کی طرف ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء کے اوائل میں پیش قدمی کی۔ اسی زمانے میں بادشاہ کا

---

[1] احمد شاہ نے حکماً اپنی قوم کا نام بدل کر "درّانی" کر دیا تھا لیکن اکثر ہندوستانی تاریخوں میں خود اسے "ابدالی" ہی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

باب ۵

مرض موت شروع ہو گیا تھا لہذا اپنی بجائے ولی عہد سلطنت شہزادۂ احمد کو اس نے مقابلے کے لیے روانہ کیا مگر جنگ کی اصلی ذمہ داری وزیر الممالک قمر الدین خاں کے سپرد تھی اور سرہند کی لڑائی میں درحقیقت اسی کی تدابیر نے احمد شاہ ابدالی کی ہمت پست کر دی۔ میدان میں آخری معرکہ ہونے سے پہلے ہی حملہ آور صلح پر آمادہ تھے لیکن قمر الدین خاں کی پہلی شرط یہ تھی کہ احمد شاہ ابدالی خود حاضر ہو کر مغل شہزادے کو نذر دکھائے[۱] ابدالی نے یہ ذلت قبول نہ کی اور گو توپوں کی آتش باری سے قمر الدین خاں میدان میں کام آیا لیکن اس کے فرزند معین الملک اور دیگر رفقا نے حق نمک حلالی ادا کر دیا اور ایک خونریز جنگ میں افغانوں کو سخت شکست دی (ربیع الاول ۱۱۶۱ھ) شکست خوردہ حریف کا تعاقب کر کے نہ صرف پنجاب بلکہ کابل تک تمام ملک خالی کرانے کا یہ بہترین موقع تھا لیکن صفدر جنگ نے جو قمر الدین خاں کی بجائے سپہ سالار ہو گیا تھا۔ شہزادے کو آگے جانے کی اجازت نہ دی اور آخر کار بادشاہی منظوری سے صرف معین الملک کو ابدالی کے تعاقب اور حکومت پنجاب پر نامزد کر کے شاہی لشکر دہلی کی طرف واپس آگیا (ربیع الثانی)۔

مجاہد الدین احمد شاہ

انھی دنوں میں محمد شاہ بادشاہ نے وفات پائی (۲۷ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ مطابق اپریل ۱۷۴۸ء) اس کی ذاتی کمزوریوں کے باوجود ایک ہمعصر بے درد مصنف کو بھی اعتراف ہے کہ "در عہد او خلق بہ آسائش زندگی نمودہ و تازہ مانِ دلکش بہر صورت سلطنت را آبروے و وقرے در نظر ہا بود...... گویا خاتم السلاطین بابریہ است چہ بعد او سلطنت غیر از نام چیز دیگر ندارد"[۲] کیونکہ اس کا جانشین جو مجاہد الدین احمد شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا اس سے بھی زیادہ نااہل اور ناکارہ آدمی تھا اور جب اسی زمانے میں آصفجاہ اول نے

[۱] الیٹ جلد ہشتم صفحہ ۱۰۸ (ترجمہ "تاریخ احمد شاہ")۔
[۲] سیر المتاخرین صفحہ ۸۷۰۔

بھی دکن میں وفات پائی (جمادی الثانی ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء) تو کہنا چاہیئے کہ قضا و قدر نے سلطنت کی وہ بازی ہی الٹ دی اور اب امراء میں بھی قمر الدین خاں یا آصف جاہ کی طرح کوئی ایسا ہوشمند و ذی اثر سردار نہ رہا جو اس ڈگمگاتی ناؤ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا۔ بادشاہ سلامت ہفتوں محلسرا سے باہر نہ نکلتے تھے اور قلعے کے اندرونی معاملات بھی ان کی ماں اودھم بائی اور جاوید خواجہ سرا کے اختیار میں آگئے تھے۔ باقی امیر و وزیر حسد اور خود غرضی کی بدولت ایک دوسرے کی بیخ کنی میں مصروف تھے اور ان میں کوئی اتنا قابل و ہوشیار بھی نہ تھا کہ کسی طرح اپنے درباری رقیبوں پر ہی غالب آجاتا۔ ایک اور پیچیدگی یہ پیدا ہوئی کہ نئے وزیر صفدر جنگ نے روہیلوں پر فوج کشی کی اور جب اپنا بس نہ چلا تو مدد کے واسطے مرہٹوں کو بلایا جنھوں نے شمال مغربی دوآب کے تمام زرخیز علاقے پامال کر ڈالے۔ پھر انھی حلیفوں کو ساتھ لے کر وہ پایۂ تخت میں آیا کہ اپنے درباری حریفوں کا قلع قمع کر ڈالے۔ لیکن جاوید خواجہ سرا کو دھوکے سے بلا کر قتل کرا دینے کے سوائے، اس مقصد میں اسے زیادہ کامیابی نہ ہوئی اور ایک نئے حریف نواب عماد الملک غازی الدین (ثالث) نے تھوڑے دن بعد خود اس کے مرہٹہ اتحادیوں کو توڑ لیا۔ صفدر جنگ کو جس طرح بن سکا دلی سے نکل کر اپنے صوبوں میں جانا پڑا جہاں اب اسے ہم ایک حد تک خود مختار حاکم سمجھ سکتے ہیں۔ اگرچہ وہ اودھ پہنچ کر زیادہ نہ جیا اور اس کی وفات (۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۴ء) کے بعد اس کا بیٹا شجاع الدولہ اس علاقے کا وارث ہوگیا جو موجودہ اودھ سے رقبے میں تقریباً سہ چند تھا۔

اس اثناء میں بنگال اور دکن کے صوبہ داروں کا بھی مرکزی حکومت سے رہا سہا تعلق منقطع ہوگیا تھا جس کی تفصیل ہم آگے پڑھیں گے۔ اسی طرح پنجاب کو معین الملک ذاتی قابلیت و مستعدی کے باوجود طاقتور افغانوں کی یورش سے محفوظ نہ رکھ سکا تھا اور احمد شاہ ابدالی نے دو تین حملوں کے بعد اسے خراج گزاری پر مجبور کر دیا کیونکہ دربار دہلی سے کسی قسم کی امداد اسے

۱۱ باب

نہ ملتی تھی بلکہ صفدر جنگ رقیبانہ حسد کی وجہ سے ابدالی کے ہاتھ سے اس کی ذلت وشکست سن کر خوش ہوتا تھا۔ الغرض جب معین الملک نے بھی اسی زمانے میں وفات پائی (۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء) تو اس کے نابالغ بیٹے کے نام صوبہ داری کی سند احمد شاہ ابدالی ہی نے بھیجی جس کے معنی یہ تھے کہ اب یہ صوبہ والی کابل کی ملکیت ہے، لیکن ان واقعات سے بھی بڑھ کر سلاطین مغلیہ کی کمزوری خود پایۂ تخت دہلی کے انقلابات میں نظر آتی ہے کہ جب صفدر جنگ کو نکالنے کے بعد نوجوان غازی الدین کی خود احمد شاہ سے ان بن ہوئی تو آخر غازی الدین ہی غالب آیا اور بادشاہ اور اس کی فتنہ جو ماں کو گرفتار کر کے اس نے دونوں کی آنکھیں نکلوادیں اور جہاندار شاہ بن شاہ عالم کے ایک اور بیٹے (مرزا عزیز الدین) کو عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا (شعبان ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء)۔

عالمگیر ثانی

فارسی مورخ کے منقولۂ بالا قول کے بموجب درحقیقت محمد شاہ کی وفات سے ہندوستان میں مغلوں کی برائے نام سلطنت کا بھی خاتمہ ہوگیا تھا۔ ممالک ہند میں مختلف ریاستیں اور قومیں حکومت دہلی سے ایسی بے تعلق اور خود مختار ہوگئی تھیں کہ اب خاندان تیموریہ کے نام نہاد بادشاہوں کے حالات ایک محدود و مختصر مقامی تاریخ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے لیکن ایک انگریز تاریخ نویس نے اس دور کا خاتمہ پانی پت کی تیسری جنگ (۱۱۷۴ھ/۱۷۶۱ء) کو قرار دیا ہے اور بے شبہ عالمگیر ثانی کی تخت نشینی سے جنگ مذکور تک تقریباً سات سال کے واقعات پایۂ تخت اور حکومت دہلی کے کامل زوال وخاتمہ کا آخری مرقع پیش کرتے ہیں اور مناسب ہوگا کہ ہم بھی اپنی کتاب کا یہ حصہ ختم کرنے سے پہلے سرسری طور پر ان واقعات کو یہاں بیان کردیں۔

ابدالی کا حملہ دہلی پر

دہلی میں وزارت اور پورے اختیارات حاصل کرنے کے بعد غازی الدین کو پنجاب پر دوبارہ قبضہ کرنے کی فکر ہوگئی تھی اور اس نے احمد شاہ ابدالی کے قبضے کو باضابطہ تسلیم نہیں کیا تھا۔ اتفاق سے معین الملک

کی بیٹی اسے پہلے سے منسوب تھی لہذا شادی کے بہانے وہ لاہور کے قریب تک آکر یکایک شہر میں پہنچ گیا اور اپنی بیوہ ساس اور صغیر سن سالے کو حراست میں لے کر اس نے ایک اور شخص آدینہ بیگ کو اپنی طرف سے پنجاب کا صوبہ دار مقرر کر دیا۔ (۱۷۵۷ء)۔

یہ کارروائی گویا افغانی بادشاہ سے لڑائی مول لینی تھی حالانکہ اگر گزشتہ دس برس میں ابدالی کی جنگی قوت وہی رہتی جو پہلے تھی تو بھی حکومت دہلی کی قوت اتنی جلد زائل ہو گئی تھی کہ اب اس میں افغان حملہ آوروں کے مقابلے کا دم نہ تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی اس قدر جلد اور یکایک ہندوستان میں بڑھا کہ غازی الدین اپنے مرہٹہ حلیفوں کو بھی کمک پر نہ بلا سکا اور سوائے اس کے کوئی چارۂ کار اسے نہ سوجھا کہ احمد شاہ ابدالی سے عاجزانہ معافی مانگ کر جس طرح ممکن ہو مصالحت کرے۔ اور گو کسی جنگ و جدال کی اب تک نوبت نہ آئی تھی لیکن حملہ آوروں نے غارت گری کا یہ موقع ہاتھ سے نہ کھویا اور شہر دہلی پر قابض ہو کر جس قدر مال و متاع مل سکا لوٹ لیا (جمادی الاول ۱۷۵۷ء) افغانی سپاہیوں نے اس مرتبہ اہل شہر کے ساتھ ایسی سختیاں اور بے آبروئی کی تھی کہ بعض شرفا خودکشی کر کے مر گئے اور گروہ کثیر نے اس بدنصیب شہر کی سکونت ترک کر دی۔

غازی الدین کی عیاری

دہلی کی اس مصیبت اور بے بسی کے باوجود وزیر غازی الدین ریشہ دوانی میں مصروف تھا۔ اس کے پاس کوئی قابل اعتماد فوجی قوت نہ تھی لیکن تاریخ میں اس جیسے ذہین و عیار امیر کی بہت کم مثالیں نظر آتی ہیں جو سالہا سال تک اپنے خود غرض اور قوی حریفوں ہی کو آپس میں لڑا کر کام نکالتا رہا۔ اس موقع پر بھی اس نے احمد شاہ ابدالی کی مدد لے کر شجاع الدولہ والی اودھ پر فوج کشی کی اور اسے ڈرا دھمکا کر بادشاہی مالگزاری کے نام سے کئی لاکھ روپیہ وصول کر لیا۔ اس عرصے میں احمد شاہ ابدالی مغل بادشاہ (عالمگیر ثانی) کی بے دست و پائی اور غازی الدین کی چالاکیوں کے حالات سن کر اس سے بدگمان ہو گیا تھا لہذا واپس جاتے وقت اس نے روہیلکھنڈ کے ایک

باب ۹

پٹھان سردار نجیب الدولہ خاں کو اپنی طرف سے بادشاہ دہلی کا سپہ سالار بنا دیا کہ وزیر کی بیباکانہ کارروائیوں کی روک تھام ہو جائے۔ اس کے جواب میں احمد شاہ ابدالی کے رخصت ہوتے ہی غازی الدین مرہٹوں کی فوج کثیر لے کر دہلی آ پہنچا اور نجیب الدولہ خاں کو بہ مشکل جان بچا کر وہاں سے نکلنا پڑا۔ پائے تخت اور مغل بادشاہ کی برائے نام حکومت پھر غازی الدین وزیر کے قبضے میں آ گئی۔

مرہٹوں کا زور شمالی ہند میں۔

مرہٹوں کی قوت اس زمانے میں انتہائے کمال کو پہنچ گئی تھی ان کے یکجا حالات آیندہ ہماری نظر سے گزریں گے یہاں صرف یہ بتانا کافی ہے کہ اب مغربی دکن، وسط ہند، گجرات و مالوہ پر ان کا قبضہ تھا۔ جنوبی دکن ان کے حملوں سے محفوظ نہ تھا۔ شمال مشرق میں اڑیسہ اور جنوبی بنگالے تک ان کی یورشیں پہنچنے لگی تھیں۔ راجپوتانے کی ریاستوں سے وہ جبراً "خراج" وصول کرتے تھے اور اب غازی الدین کی امداد کے حیلے سے ان کا دست غارت روہیلکھنڈ اور حکومت اودھ کے علاقوں پر بڑھ رہا تھا۔ اسی مشترکہ خطرے نے شجاع الدولہ اور اس کے قدیم حریف یعنی روہیلکھنڈ والوں کو باہم متحد کر دیا اور شجاع الدولہ نے دوآب میں مرہٹوں کو شکست دے کر گنگا کے پار بھگا دیا۔ (۱۷۵۱ء)۔

احمد شاہ ابدالی سے دوبارہ مزاحمت

مگر مرہٹوں کے اس نقصان کی پہلے ہی کافی سے زیادہ تلافی پنجاب میں ہو گئی تھی جہاں اب دریائے سندھ تک تقریباً تمام علاقہ ان کے زیر اثر تھا۔ شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ احمد شاہ ابدالی جاتے وقت اپنے فرزند تیمور شاہ کو پنجاب کا صوبہ دار بنا کے لاہور میں چھوڑ گیا تھا اور اگرچہ غازی الدین کا مقرر کردہ صوبہ دار آدینہ بیگ پنجاب کے مشرقی اور کوہستانی مقامات میں اب تک شورش بپا کر رہا تھا اور سکھوں کو فوجی قواعد سکھا سکھا کر افغانی عمال سے لڑا رہا تھا بایں ہمہ یہ تدابیر کچھ زیادہ کارگر نہ ہوئیں اور آدینہ بیگ نے بھی اپنی مدد کے واسطے مرہٹوں کو بلایا۔ ان کی تعداد کثیر کی آمد سن کر تیمور شاہ کو لاہور سے ہٹنا پڑا اور آدینہ بیگ ایک مرتبہ پھر لاہور پر قابض ہو گیا۔ مرہٹوں نے کثیر معاوضے کے اقرار پر اسے پنجاب کا صوبہ دار تسلیم کر لیا تھا

باب ۴

لیکن جب اسی زمانے میں وہ فوت ہوا (۱۱۶۶ھ) تو انھوں نے جالندھر کے اضلاع اس کی بیوہ کو دے کر خاص لاہور میں اپنے ایک مرہٹہ سردار کو صوبہ دار بنا دیا۔

لیکن یہ محض ایک بے وارثہ مال سمجھ کر اس کا مالک بن جانا تھا ورنہ جب احمد شاہ ابدالی بعض اندرونی مفسدات فرو کر کے پنجاب پر بڑھا تو مرہٹے جس آسانی سے قابض ہوئے تھے اسی سبک پائی سے پنجاب چھوڑ چھوڑ کر پیچھے ہٹے اور افغانوں سے ان کی پہلی لڑائی سرہند کے قریب ہوئی جہاں شکست کھا کر وہ دوبارہ دہلی کے قریب جمع ہوئے۔ اور ان کے قیام کی وجہ بھی ظاہرا یہ تھی کہ احمد شاہ ابدالی سیدھے راستے کو چھوڑ کر (جس کے تمام علاقے مرہٹوں نے لوٹ کر تاراج کر ڈالے تھے) جمنا کے پار اتر گیا تھا اور وہیں نجیب الدولہ خاں اور روہیلکھنڈ کے دوسرے سرداروں نے اس سے ملاقات کی اور شجاع الدولہ سے بھی اتحاد کی گفتگو شروع ہوئی۔

مرہٹوں کی ہزیمتیں

اس عرصے میں غازی الدین وزیر نے عالمگیر ثانی کو اس گناہ پر کہ وہ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتا ہے قتل کرا دیا (ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ) اس کا بیٹا شہزادۂ عالی گہر، جو بعد میں شاہ عالم ثانی کے نام سے وارث تخت ہوا، پہلے ہی غازی الدین کے خوف سے نکل کر بنگالے چلا گیا تھا کہ ممکن ہو تو وہاں دوبارہ اپنی حکومت قائم کرے۔ ادھر مرہٹوں کی سرہند ہی پر شکست کی خبر سن کر غازی الدین خوف زدہ ہو گیا اور اپنے مرہٹہ اتحادیوں کو تقدیر کے حوالے کر کے خود بھرت پور کے جاٹوں میں پناہ گزیں ہوا جو اس زمانے میں (بھرت پور سے بلم گڑھ تک علاقے کے) خود مختار حاکم بن بیٹھے تھے۔ الغرض احمد شاہ دوبارہ جمنا کو اتر کر جب یکایک مرہٹوں کے سر پر پہنچ گیا جو دلی کے قریب مقیم تھے اور ان میں سے بہت کم مرہٹے جان سلامت لے کر فرار ہو سکے تو شہر دہلی پر بھی درانیوں کا قبضہ ہو گیا اور احمد شاہ انتظام کے لیے یہاں تھوڑی سی فوج چھوڑ کر خود دوبارہ دوآب کے علاقے میں چلا آیا جہاں رسد رسانی اور نیز شجاع الدولہ

ابؐ

سے خط کتابت میں سہولت تھی۔

تیسری جنگ پانی پت

مذکورۂ بالا پے در پے ہزیمتوں کی خبر نے دکن کے مرہٹوں میں انتقام کا جوش پیدا کر دیا۔ اسی زمانے میں نواب نظام الملک پر فتح پا کے وہ پھولے نہ سماتے تھے اور غالباً اتنی بڑی باقاعدہ فوج کبھی ان کے پاس نہ پہلے تھی نہ آئندہ ہوئی جس قدر کہ اس موقع پر آراستہ ہو کر افغان حملہ آوروں سے لڑنے شمالی ہندوستان کو روانہ ہوئی پیشوا (بالاجی راؤ) کا نوجوان بیٹا وسواس راؤ فوج کا سپہ سالار تھا لیکن اصلی انتظامات اس کے چچا (سداشیو راؤ) بھاؤ کے ہاتھ میں تھے۔ سپاہ کی کل تعداد میں بہت اختلاف ہے لیکن پانی پت کی جنگ کے وقت مرہٹوں کی لشکر گاہ میں کم سے کم تین لاکھ آدمی موجود تھے جن میں سے ایک تہائی لڑنے والے سمجھنے چاہئیں جو احمد شاہ ابدالی کی افغانی اور روہیلہ فوج سے قریب قریب دگنے تھے اور ان کی توپیں بھی تعداد اور قوت میں افغانی توپوں سے کہیں زیادہ خوفناک تھیں۔

آخر اس لاؤ لشکر کے ساتھ ۱۱۷۳ھ کے آخری مہینوں میں بھاؤ شمالی ہند میں آگیا اور دلی پر قبضہ کرنے میں بھی اس کو زیادہ دقت اٹھانی نہ پڑی۔ درانی جمعیت چند روز مقابلہ کرنے کے بعد ہٹ گئی شاہجہانی قلعے میں مرہٹہ سپہ سالار فاتحانہ شان و شوکت کے ساتھ داخل ہوا اور کہتے ہیں اس نے اپنے بھتیجے کو تخت پر بٹھا کر یہ اعلان کرانا چاہا تھا کہ اب ممالک ہند کی شہنشاہی مرہٹہ برہمنوں کی ملکیت ہے لیکن لوگوں کے کہنے سننے سے جنگ کے فیصلے تک اس ارادے کو ملتوی کر دیا اور پھر کرنال کی طرف کوچ کیا جہاں کنجپورے میں درانیوں کی ایک اور فوجی جمعیت متعین تھی۔

اس عرصے میں شجاع الدولہ بہت کچھ خط کتابت کے بعد احمد شاہ ابدالی سے (انوپ شہر میں) آملا تھا۔ اس کی یہ شرکت بے دلی سے تھی اور اس کی تیس ہزار فوج نے جنگ میں کوئی حصہ بھی نہیں لیا تاہم

اس کی محض ہمراہی بھی فائدے سے خالی نہ تھی اور اس اطلاع نے ضرور مرہٹہ سپاہیوں کو دشمن کی طرف سے کچھ نہ کچھ اندیشہ مند کر دیا ہو گا اور جب یہ دشمن خود بڑھ کر ان سے لڑنے چلا اور جمنا کا پانی چڑھے ہونے کے باوجود باغپت کے قریب جس طرح ممکن ہوا اسے عبور کر آیا تو معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹے مرعوب ہو گئے اور انھوں نے دریا پر روکنے یا فوراً بڑھ کر لڑنے کی بجائے پانی پت کے میدان ہی میں اپنے خیمے ڈال دیے اور توپیں لگا کر مورچہ بندی کر لی۔ احمد شاہ ابدالی کا لشکر ماہ ربیع الاول ۱۱۷۴ھ (اکتوبر ۱۷۶۰ء) میں مرہٹوں کے سامنے پہنچ گیا تھا لیکن اس نے اپنی طرف سے لڑائی کی پیش قدمی نہ کی اور پہلے تو تھوڑی سی سوار فوج بھیجکر ان مرہٹہ دستوں کا سدباب کیا جو اس کے لشکر میں رسد پہنچنے نہ دیتے تھے پھر خود اس کے دستے مرہٹہ لشکرگاہ کے گرد منڈلانے لگے اور انھوں نے مرہٹوں کی رسد رسانی کے ذرائع اس طرح مسدود کر دیے کہ ان کی فوج میں فاقہ کشی کی نوبت پہنچ گئی۔ آخر بھاؤ نے مجبور ہو کر فیصلہ کن جنگ کا ارادہ کر لیا اور ۶ جمادی الثانی ۱۱۷۴ھ (۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء) کے دن پانی پت سے چند میل مشرق میں نہایت خونریز لڑائی ہوئی۔ مرہٹے جان سے ہاتھ دھو کر حملہ آور ہوئے تھے اور ان کی تعداد بھی کہیں زیادہ تھی لیکن پہلا ریلا روکنے کے بعد جب غنیم نے قلب اور میسرے کی فوج سے ایک ساتھ حملہ کیا تو لڑائی کا رنگ بدل گیا اور وسط میں سمٹتے ہی احمد شاہی توپ و تفنگ نے ان کی پیوستہ صفوں میں تہلکہ ڈال دیا۔ ان کے بڑے بڑے سردار (یعنی بھاؤ اور وسواس راؤ) اسی مقام پر مارے گئے اور وہ بہت جلد میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ فتحمندوں نے دور دور تک تعاقب کیا اور مشہور ہے کہ مرہٹوں کے تقریباً دو لاکھ آدمی اس لڑائی میں مارے گئے۔

نئی طاقتیں

پہلی فصل:۔ مرہٹوں کا فروغ

میدان کرنال و پانی پت کی پہلی لڑائیاں ہندوستان میں کسی نئے خاندان کی بہتر و قوی تر بادشاہی کا افتتاح کرتی ہیں۔ لیکن یہ آخری لڑائی اہل ہند کی مرکزی سلطنت کا ایسا خاتمہ ثابت ہوئی جس کے بعد پھر اہل ہند خود تمام ممالک ہند میں کوئی متحد اور مرکزی حکومت نہ قائم کر سکے اور خود احمد شاہ ابدالی کے دل میں اگر اس قسم کا ارادہ تھا بھی تو اس کے ہموطن سپاہیوں نے رفاقت نہ کی اور اسے مجبوراً صوبۂ پنجاب پر اکتفا اور دہلی سے دو تین ہی مہینے میں مراجعت کرنی پڑی۔ شاہ جہاں کے اس ویران شدہ دارالسلطنت میں شہزادہ عالی گہر پسر عالمگیر ثانی کی بادشاہی کا اعلان کرا دیا گیا تھا جو باپ کے مرنے کے بعد (شاہ عالم ثانی کے لقب سے) صوبۂ بہار کے ایک مقام پر پٹنے میں تخت نشین ہوا (جمادی الثانی ۱۱۷۳ھ ۱۷۶۱ء) لیکن ظاہر ہے کہ یہ محض رسم قدیم کو پورا کرنا تھا

باب

ورنہ بہار و بنگال میں شاہ عالم کی پیہم ناکامیوں نے اس بات کا بھی امکان باقی نہ رکھا تھا کہ وہ کم سے کم شمالی ہند ہی کا فرماں روا ہو جائے گا۔

سلطنت ہندوستان کے تازہ ترین آرزومند سداشیو (بھاؤ) کا وہ سر ہی نہ رہا جس میں سلطنت کی آرزو تھی۔ پانی پت کے "مقتل" میں اس کی لاش بے سر کی ملی اور بہت دن تک شبہہ رہا کہ یہ لاش اسی کی تھی یا کسی اور کی؟

شمالی یا جنوبی ہند کی کسی طاقت میں نہ یہ قابلیت تھی نہ ہوس کہ سلاطین تیموریہ کی جگہ لینے کا تہیہ کرتی غرض نئے نئے خود سرگروہ پیدا ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ ممالک ہند کا سیاسی شیرازہ بکھر گیا اور دستور کے مطابق جا بجا نئی ریاستیں یا تو بن خود مختار ہو گئیں اور تقریباً نصف صدی تک سارے ملک میں اسی طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا۔ ان ریاستوں کے مفصل حالات لکھنے کا یہ محل نہیں ہے اور جہاں تک ممکن ہو ہم ممالک ہند کی مجموعی حالت کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، بایں ہمہ اس باب میں اس قسم کی بعض نوخیز اور بڑی ریاستوں کا علحدہ علحدہ اجمالاً ذکر کرنا پڑے گا تا کہ انگریزی تاجروں کی آمد اور آئندہ تمام ممالک ہند پر تسلط پانے کے واقعات سمجھنے میں آسانی ہو۔

مرہٹوں کی ریاست

سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں دکن کی مرہٹہ قوم کو جو سیاسی قوت حاصل ہوئی اس کا بانی عام طور پر سیوا جی کو سمجھا جاتا ہے لیکن تاریخی لحاظ سے وہ مرہٹوں کی قومی تاریخ کے سلسلے میں ایک بیچ کی کڑی ہے ورنہ اس قوم کو سب سے پہلے ملک عنبر حبشی نے، یا کہنا چاہئے کہ احمد نگر و بیجاپور کی جنگی ضرورتوں نے، سپہ گری سکھائی اور خود مرہٹوں میں ساہوجی (بھونسلہ) پہلا شخص ہے جس نے اس تعلیم سے فائدہ اٹھا کر اپنے ہم قوم سپاہیوں کو ایک ممتاز فوجی جمعیت میں منتظم کیا اور اپنے واسطے تاریخ ہندوستان میں جگہ نکال لی۔ بے شبہہ سیوا جی کی یورش و دلیری نے دور دور کے مرہٹوں میں جنگی جذبات پیدا کر دیے اور ان میں قومی اتحاد کی روح پھونک دی، جو اس کا بہت بڑا کارنامہ ہے لیکن خود اس کا طرز عمل کسی باقاعدہ اور مستقل حکومت کے مقابلے میں کامیاب

باب ۶

نہ ہو سکتا تھا اور قرائن کہتے ہیں کہ راجہ جے سنگھ اور دلیر خاں کی تادیبی مہم (۱۶۶۵ء) نے اس بات کا خود سیواجی کو یقین دلا دیا تھا چنانچہ آئندہ اس کی قزاقانہ تاخت و تاراج میں فی الجملہ کمی ہو گئی اور وہ اپنے علاقے میں ایک باقاعدہ ریاست قائم کرنے پر متوجہ ہو گیا، لیکن یہ ریاست بھی کوئی خاص قوت و پائداری حاصل کرنے نہ پائی تھی کہ سنبھاجی کی شوریدہ سری نے مغلوں کے ہاتھ سے اس کا خاتمہ کرا دیا اور مغل بادشاہ (اورنگ زیب) کے طویل قیام دکن اور کارگر انتظامات نے مرہٹوں کی نیم آزادانہ حیثیت باقی نہ رہنے دی۔

سنبھاجی کے فرزند ساہوجی نے اورنگ زیب کے لشکر میں پرورش پائی اور گو اس کی حیثیت ایک شاہی قیدی کی سی تھی بایں ہمہ مغل بادشاہ کی مہر و عنایت کی بہت سی روایتیں فارسی اور نیز مرہٹی تحریروں میں محفوظ ہیں کہ وہ ساہو کے ساتھ اپنے خاندانی لڑکوں کا سا برتاو کرتا تھا، اور غالباً یہ بھی ایک وجہ تھی کہ جب اسے باج گزاری کی شرط پر مغلوں نے رہائی دی تو وہ خود اس شرط کی خلاف ورزی کرنی نہ چاہتا تھا لیکن آئندہ ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ مرہٹوں کی حکومت اول اول بالقوہ اور آخر کار علانیہ ہندوستان کی ایک خود مختار و قوی سلطنت بن گئی۔

پیشوا کا اقتدار

یہ اہم تغیر یعنی پہلے جبراً دبے قاعدہ اور پھر باقاعدہ حکومت و بادشاہی کرنے کا شعور مرہٹوں میں بہت کچھ ساہوجی کے ان برہمن وزیروں کی محنت و ذہانت کا نتیجہ تھا جو ''پیشوا'' کے لقب سے مشہور رہیں۔ ابتدا میں یہ عہدہ دار دوسرے درجے کا وزیر سمجھا جاتا تھا لیکن جب بالاجی (وشوناتھ) پیشوا مقرر ہوا (۱۷۱۴ء) تو اس کے ذاتی رسوخ سے رفتہ رفتہ یہ منصب سب سے اعلیٰ اور آخر میں موروثی اور اصلی حاکم کے مرادف ہو گیا۔ بالاجی نے راجہ ساہو کے بہت سے اندرونی جھگڑے رفع کئے اور اسی ضمن میں امیر الامرا سید حسین علی خاں سے چوتھ اور سردیس مکھی کے متعلق وہ سند حاصل کی جس کا پچھلے حصے میں ذکر آ چکا ہے۔ اس سند کی تصدیق محمد شاہ کے عہد میں ہوئی (۱۷۱۹ء) اور اس نے اول تو ساہو کو تارا بائی اور اس کے فریق کے مقابلے میں مرہٹوں کا مسلمہ سردار بنا دیا

باب ۵

بنا دیا اور دوسرے وصول مالگزاری کی غرض سے بالاجی کو ایک وسیع محکمہ قائم کرنے کا موقع مل گیا۔ اس کے ماتحت عمّال ممالک دکن کے قریب قریب ہر ضلع میں نظر آنے لگے اور اس واقعے نے نہ صرف مرہٹہ حکومت کی وقعت بلکہ مرہٹوں میں خود پیشوا کا اعزاز و اقتدار بڑھا دیا۔

بالاجی کے بعد اس کا بیٹا باجی راؤ پیشوا ہوا (سنہ ۱۱۳۲ھ / ۱۷۲۰ء) وہ اپنے باپ سے کہیں زیادہ بلند حوصلہ اور جنگجو سردار گزرا ہے اور اگر (سیواجی کے بعد) اسے مرہٹہ قوم کا سب سے بڑا شخص کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ وہ اپنی فراست سے یہ بات بخوبی سمجھ گیا تھا کہ سلطنت مغلیہ کی جڑ میں گھن لگ چکا ہے اور ایک عالمگیر اصول کے مطابق کسی نئی قوم کے ابھرنے کا ٹھیک وقت وہی ہے جبکہ کوئی دوسری قوم حالت زوال میں ہو اور نئے لوگ کمال مستعدی کے ساتھ اس کی گرتی دیوار سے اپنی عمارت کے لیے سنگ و خشت جمع کر لیں۔ یہاں دوبارہ یہ وضاحت کر دینی مناسب ہوگی کہ آج جب کہ سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ہوئے مدت گزر چکی ہے اس کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کو یہ سمجھنا کچھ دشوار نہیں معلوم ہوتا کہ محمد شاہ کے عہد ہی سے اس سلطنت میں زوال پیدا ہو گیا تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ خود محمد شاہ کے معاصرین بھی اس بات کا یقین رکھتے تھے' یا یہ کہ وہ سلطنت کی روز افزوں خرابی کو اسی وقت سے ناقابل اصلاح سمجھنے لگے تھے' اس کے برعکس جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں' محمد شاہ کی زندگی تک ہندوستان کے ذی اثر لوگوں پر مغل بادشاہ کا بہت کافی رعب رہا اور مرہٹوں کی قوم کو اس کی زندگی میں علانیہ خودمختاری کا دعوے کرنے کی ہمت نہ ہوئی البتہ یہ پہلی قوم تھی جو پیشوا کی سرکردگی میں مرکزی سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں گھس پڑی اور جہاں گنجائش ملی' قابض ہو گئی۔

گجرات و مالوہ میں نفوذ

گجرات اور مالوے کے صوبہ داروں نے مرکزی حکومت سے اختلاف اور اپنے ذاتی رقیبوں سے جھگڑوں کی وجہ سے مرہٹوں کو امداد کے واسطے خود طلب کیا اور وہاں بھی چوتھ وصول کرنے کا حق انھیں دے دیا تھا لیکن اول تو حکومت دہلی نے ان کے اس حق کو باضابطہ تسلیم نہیں کیا دوسرے نواب نظام الملک آصفجاہ کے

خوف سے وہ بہت دن تک اس "حق" سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکے تاآنکہ نواب آصفجاہ نے اس خیال سے کہ کہیں بالاجی شہنشاہِ دہلی سے حکومت دکن کی کوئی سند نہ حاصل کرلے بالاجی سے مصالحت کرلی جو ایک طور پر مرہٹوں کے لیے اجازت ہوگئی کہ وہ نربدا کے شمال میں تاخت وتاراج کریں[1] ۱۷۳۲ء۔

ان صوبوں میں چوتھ وصول کرنے کے واسطے حسب دستور باجی راؤ نے چند مرہٹہ سردار مقرر کئے تھے اور انھی کے خاندان گائیکواڑ سندھیا اور ہلکر کے نام سے اب تک گجرات و مالوہ کے اقطاع پر حکمراں ہیں، مرہٹوں کا چوتھا مشہور خاندان بھونسلہ پہلے سے برار میں راجہ ساہو کی نیابت کرتا تھا باجی راؤ کی اس خاندان کے سردار رگھوجی بھونسلہ سے مخالفت تھی اور اس نے پیشوا کو دو ایک مرتبہ سخت زک بھی دی۔

آئندہ چند سال تک باجی راؤ کچھ اندرونی جھگڑوں میں اور کچھ دربار دہلی سے خط کتابت میں مصروف رہا کہ گجرات و مالوہ میں چوتھ وصول کرنے کی باقاعدہ سند حاصل کرلے، اس میں بلا دقت کامیابی کی امید اس لیے تھی کہ ان دنوں خان دوراں خاں اور ایرانی امرا کا دربار محمد شاہ میں بہت رسوخ ہوگیا تھا اور یہ لوگ تورانی امیروں کی رقابت میں چاہتے تھے کہ ممکن ہو تو مرہٹوں سے مصالحت کرکے انھیں نواب آصفجاہ سے لڑادیں جو تورانیوں کا مسلمہ سرگروہ تھا اور ناعاقبت اندیش خان دوراں خاں (وزیر جنگ) کا محسود، چنانچہ دہلی کے یہ امرا دکن کے صوبوں میں بادشاہ کی طرف سے مرہٹوں کو یک عشر کے بجائے یک خمس ("سردیش پانڈی گری") کا حق نیز راجپوتانے کی ریاستوں سے چوتھ وصول کرنے کی اجازت دینے پر آمادہ ہوگئے لیکن باجی راؤ کا اصلی مطالبہ گجرات اور مالوے کے متعلق تھا اور نواب آصفجاہ کو حکومت دہلی کا مخالف سمجھ کر وہ بادشاہ کی فوجی قوت کو بہت حقیر سمجھنے لگا تھا۔ لہٰذا اس نے

---

[1] گرانٹ ڈف کا بیان ہے کہ اس کے متعلق نواب نظام الملک اور پیشوا کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا تھا (جلد اول صفحہ ۵۰۴) لیکن مولف نے اس کی مفصل شرائط تحریر نہیں کیں نہ اپنے ماخذ کا حوالہ دیا۔

اپنے مطالبات میں کوئی کمی نہیں کی اور یہ سن کر کہ دہلی میں بھی مقابلے کی جنگی تیاریاں ہو رہی ہیں وہ بندھیل کھنڈ سے آگرے کی طرف بڑھا اور ایک فوج کو اس نے جمنا کے پار بھیج دیا کہ دوآب کا علاقہ تاراج کر دے اس فوج کو برہان الملک سعادت خاں صوبہ دار اودھ نے سخت شکست دی اور ادھر مرہٹوں کی اصلی فوج سے مقابلہ کرنے کے لیے وزیر الممالک قمر الدین خاں اور خان دوراں خاں آگرے کے آگے تک بڑھ آئے (۱۱۴۹ھ/۱۷۳۷ء) باجی راؤ نے مقابلے سے پہلو تہی کی اور پہاڑوں کے دشوار گزار راستوں سے چکر کھا کر یک بہ یک پائے تخت دہلی کے قریب آنکلا۔ خاص شہر پر اسے پھر بھی حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور حوالی میں صرف کچھ ہندو اس کی غارت گری کا شکار ہوئے جو شہر کے باہر کالکا کے مندر میں تہوار منانے اور پوجا کرنے آئے تھے[1]۔ پھر بادشاہی فوجوں کا اپنے تعاقب میں آنا سن کر وہ بعجلت میوات کے راستوں سے دکن واپس ہو گیا (۱۱۵۰ھ/۱۷۳۸ء) اور اس ناکامی نے غالباً اسے یقین دلا دیا کہ گو حکومت دہلی میں اپنے بعید صوبوں کا انتظام درست رکھنے کی صلاحیت باقی نہیں ہے تاہم مغل بادشاہ کی فوجی قوت پر خاص اس کے مرکز میں حملہ کرنا جوکھوں سے خالی نہیں، چنانچہ آئندہ نادر شاہ کے حملے اور اہل دہلی کی سخت پریشاں حالی کے باوجود باجی راؤ نے چنبل سے اوپر کوئی حملہ نہیں کیا۔ اس کی باقی زندگی جنوبی ہند اور مالوے کی لڑائیوں میں صرف ہوئی اور ہر چند اپنی وفات کے وقت (۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء) وہ بہت سی مشکلات اور پریشانیوں میں گرفتار ہو گیا تھا، لیکن سچ یہ ہے کہ مرہٹوں کو صحیح معنی میں حکومت و سلطنت کے راستے پر اسی نے ڈالا اور اسی کی اولوالعزمی کی بدولت وہ قزاقوں کے بے ترتیب گروہ کے بجائے ہندوستان کی سب سے ترقی پذیر قوم بن گئے اسی کے ساتھ یاد رکھنا چاہیے کہ مرہٹوں کے اصلی رئیس کا پیشوا کے سامنے محض برائے نام راجہ رہ جانا، ایسی اندرونی خرابی تھی جس نے ان کی قوم کی مجموعی قوت کو زیادہ عرصے تک مستقل اور متحد نہ رہنے دیا، ان کے

[1] گرانٹ ڈف جلد اول صفحہ ۴۴۱ بحوالہ مراسلۂ باجی راؤ۔

باب ۵

مختلف سردار جس قدر زیادہ طاقتور ہوتے گئے اسی قدر اپنی صدر حکومت کے قابو سے باہر ہوتے گئے، اور حق یہ ہے کہ اس خرابی کے ذمہ دار ایک حد تک ہی برہمن پیشوا تھے جنھوں نے حکومت کے اصلی وارث کو رفتہ رفتہ عضو معطل کر دیا تھا۔

بہر حال، اب نہ صرف پیشوا بلکہ خود مرہٹہ قوم کے آئندہ اقتدار و ترقی کا انحصار اس پر تھا کہ جہاں تک ممکن ہو مرہٹہ سرداروں کی اندرونی تفریق پر ظاہری اتحاد و مصالحت کا پردا پڑا رہے اور اس کی تدبیر یہی تھی کہ وہ بیرونی یا غیر طاقتوں سے جنگ و جدال میں مصروف رہیں۔ برار کا مرہٹہ حاکم رگھوجی بھونسلہ تو باجی راؤ کے بعد بھی پیشوا کی حکومت سے آزاد ہی رہا بلکہ اس کی جنگی قوت بڑھتی گئی اور چند حملوں کے بعد وہ بطور خود گونڈوانہ اور اڑیسہ کے اکثر اضلاع پر قابض ہو گیا، لیکن اکثر مرہٹہ سردار بیرونی لڑائیوں میں تیسرے پیشوا بالاجی یا اس کے سپہ سالار سداشیو (بھاؤ) کے ساتھ رہے اور اسی کے زمانے میں صوبۂ مالوہ کی چوتھ کی سند شاہی بھی مرہٹوں کو حاصل ہو گئی (۱۱۵۶ھ) جس کے واسطے باجی راؤ بہت روز تک جد و جہد کرتا رہا تھا۔

مرہٹوں کا دخل شمالی ہند میں

یہ سند محمد شاہ نے بالاجی کو اس خدمت کے صلے میں دی تھی کہ اس نے بنگالے پر رگھوجی بھونسلہ کی یورش روکنے میں بادشاہی صوبہ دار مرزا محمد علی (علی وردی خاں) کو فوجی مدد دی اور خود اپنے ہمقوموں سے لڑ کر انھیں بنگالے سے خارج کر دیا۔ لیکن اس واقعے سے جہاں مرہٹوں کا اندرونی نفاق ظاہر ہوتا ہے ہی کے ساتھ دہلی کی صدر حکومت کی کمزوری بھی آشکارا ہے کہ وہ اپنے بعید صوبوں کو بچانے کے واسطے مرہٹوں کی دست نگر ہو گئی تھی، اور جیسا کہ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں محمد شاہ کے انتقال کے بعد تو خاص پائے تخت کے تنازعات میں وہ مدد کے واسطے طلب کئے جاتے تھے ادھر دکن میں انھی دنوں ایسے واقعات پیش آئے جن سے پیشوا کو مزید قوت اور شمالی ہند کے معاملات میں دخل دینے کی فرصت حاصل ہو گئی۔

شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ اول تو ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں نواب نظام الملک آصفجاہ اول نے انتقال کیا اور نواب ناصر جنگ کی مسند نشینی کے ساتھ ہی کرناٹک

باب

میں وہ لڑائیاں چھڑ گئیں جن کی وجہ سے دکن کی یہ اسلامی طاقت عرصے تک اندرونی خلفشار میں مبتلا رہی اور مرہٹوں کو اس خطرناک ہمسائے کی طرف سے کوئی خاص اندیشہ نہ رہا، دوسرے سنہ ۱۱۶۲ھ میں راجہ ساہو نے لاولد وفات پائی اور ہر چند پہلے اس کی بیوہ اور بعد میں تارا بائی نے بہت کچھ کوشش و سازش کی کہ اس موقع پر پیشوا کا زور توڑ دیا جائے لیکن اس میں انھیں کامیابی نہ ہوئی اور آخر کار بالاجی اپنے سب حریفوں پر غالب آگیا اور اس نے تارا بائی کے پوتے رام راجا کو ساہو کا جانشین اور مرہٹہ حکومت کا برائے نام راجہ تسلیم کرا دیا پھر اس نے رگھوجی بھونسلہ کو بھی مصالحت سے اور داماجی گائیکوار کو شکست دے کر آخر میں اپنا ساتھی بنا لیا تھا اور اسی اندرونی انتظام کے بعد اب مرہٹے تازہ قوت کے ساتھ مالوے اور راجپوتانے کے علاقوں میں چوتھ وصول کر رہے تھے۔ (سنہ ۱۱۶۹ھ - ۱۷۵۶ء)۔

جنگ پانی پت اور اس کے نتائج

یہی زمانہ ہے جبکہ مرہٹوں کی روز افزوں طاقت سے غازی الدین ثالث (عماد الملک) کو فائدہ اٹھانے کا خیال آیا اور اس نے عالمگیر ثانی اور اس کے امیر الامرا نجیب الدولہ کے مقابلے میں مرہٹوں کو اپنی مدد کے واسطے طلب کیا اور اسی سلسلے میں وہ آدینہ بیگ خاں کی مدد کے نام سے پنجاب میں پہنچ گئے جس کا حال پہلے ہماری نظر سے گزر چکا ہے یہ مرہٹوں کے انتہائی عروج کا وقت تھا اور بے شبہہ اگر پنجاب پر قبضہ کر کے وہ احمد شاہ ابدالی سے جنگ مول نہ لیتے تو غالباً شمالی ہند کے دوسرے علاقوں پر بہت جلد ان کا اثر قائم ہو جاتا، اسی طرح دکن میں ایک ہی معرکے نے ان کو چیرہ دست کر دیا تھا جنگ اودگیر (سنہ ۱۱۷۳ھ - ۱۷۶۰ء) اور نواب صلابت جنگ کو مجبور ہو کر نہ صرف خاندیس بلکہ دولت آباد و بیجاپور کے اقطاع بھی پیشوا کے حوالے کرنے پڑے تھے جو صوبہ دار دکن کی انتہائی کمزوری کی دلیل تھی۔ اگر ان کامیابیوں نے مرہٹہ سرداروں کے دل میں غرور و خودنمائی کے جذبات پیدا کر دیے تو یہ کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔ ملکی مقبوضات کے ساتھ ان کے ہاں بادشاہی کے لوازم اور ساز و سامان میں بھی نمایاں اضافہ ہو رہا تھا بے قاعدہ جرگوں اور رہزن گروہوں کے بجائے اب پیشوا کے تحت میں ایک

ا ب

باقاعدہ اور تنخواہ دار فوج تھی جس میں ابراہیم خاں گاردی کے وہ دس ہزار پیادے خاص طور پر مشہور ہیں جنھیں فرانسیسیوں کے طرز پر قواعد جنگ سکھائے گئے تھے اور جو اسی زمانے میں نواب صلابت جنگ کی ملازمت چھوڑ کر حکومت پونا[1] کے نوکر ہو گئے تھے اسی طرح پیشوا کے توپ خانے میں اب اتنی توپیں تھیں کہ ہندوستان کی اور کسی طاقت کے پاس نہ ہوں گی۔

بایں ہمہ جب اس جنگی قوت اور سازوسامان کی سب سے بڑی آزمائش کا وقت آیا تو مرہٹوں کی نااہلی یا کہنا چاہئیے کہ اس زمانے کے اہل ہند کی نااہلی کا راز فاش ہو گیا کہ نہ ان میں جانباز و مستقل مزاج سپاہی تھے نہ ایسے کاردان سپہ سالار جو ایک دلیر و ہوشیار دشمن سے لڑ کر فتح حاصل کر لیتے۔ کم تعداد اور کم سامان افغانی حریفوں سے پانی پت کے میدان میں جو شکست انھوں نے کھائی وہ کئی اعتبار سے تاریخ میں اہل ہند کی سب سے بڑی شکست ہے جب رفتہ رفتہ اس کی تفصیلی خبریں دکن میں پہنچیں تو مرہٹی علاقوں میں بمشکل کوئی گاؤں ایسا ہوگا جہاں پانی پت کے مقتولین کا ماتم بپا نہ ہو گیا ہو، خود پیشوا کی نسبت عام خیال ہے کہ اسی قومی مصیبت اور جوان بیٹے وسواس راؤ کے غم نے جو اس لڑائی میں مارا گیا تھا اس کی جان لی اور وہ جنگ پانی پت کے چند مہینے بعد مر گیا (۱۷۶۱ء/۱۱۷۴ھ) نیز یہی شکست تھی جس نے مرہٹوں کے سیلاب کو عین طغیانی کے وقت شمالی ہند میں بڑھنے سے روک دیا اور کم سے کم چند سال کے واسطے چنبل کے شمال میں ان کی حکومت کا نشان باقی نہ رہا۔

لیکن اس شدید نقصان و ذلت کے باوجود یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ پانی پت کی اس لڑائی نے مرہٹوں کی قوت بالکل توڑ دی۔ اس کے برخلاف ہم انھیں آئندہ تقریباً نصف صدی تک ہندوستان کی ریاستوں میں سب سے طاقتور پاتے ہیں، اپنے ملکی حریفوں سے ان کے دبنے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی

---

[1] مرہٹوں کا برائے نام راجہ ستارا کے [illegible] ہی میں نظربند رہا لیکن [illegible] سے پیشوا کا مستقر یعنی اصلی دارالحکومت پونا بن گیا تھا۔

باب

کیونکہ انھوں نے اپنے ہم وطنوں سے نہیں بلکہ ایک بیرونی دشمن سے شکست کھائی تھی جو فتح حاصل کرنے کے بعد ہندوستان سے واپس چلا گیا، اور پانچ سات برس کے بعد ہی مرہٹہ سوار چنبل اتر کے پھر جمنا تیور و آگرے کی نواح میں نظر آنے لگے اور جب مغل بادشاہ شاہ عالم (ثانی) مشرقی صوبوں سے مایوس و ناکام اپنے پائے تخت میں واپس آیا (۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۱ء) تو روہیلکھنڈ اور شمال مشرقی راجپوتانے کے سرکشوں کو زیر کرنے میں اسے مرہٹوں ہی سے مدد ملی جن کو رفتہ رفتہ دربار دہلی میں دوبارہ رسوخ حاصل ہو گیا اور آخر میں سندھیا کے ذریعے پیشوا کو تمام ہندوستان میں بادشاہ کی نیابت کی سند حاصل ہو گئی (۱۱۹۸ھ / ۱۷۸۴ء)

مگر ظاہر ہے کہ یہ سند یا فرمان شاہی عملاً کچھ زیادہ وقیع نہ تھا۔ بے شبہہ ہندوستان میں مغل بادشاہ کا ابھی تک سب لوگ ادب و احترام کرتے تھے اس کے اجداد نے اہل ہند میں سیاسی اتحاد کا جو احساس پیدا کر دیا تھا اس کا فطری مقتضیٰ تھا کہ ان کی آنکھیں تمام ممالک ہند کا کوئی مرکز واحد تلاش کریں اور یہ مرکز اگر کہیں نظر آتا تھا تو وہ اسی مغل بادشاہ کی ذات تھی[1] لیکن سیاسی دنیا میں عمدہ جذبات اور محض رسمی اطاعت سے کوئی حکومت نہیں چلتی، شاہ عالم کی براہ راست حکومت صرف مغربی دوآب۔ روہیلکھنڈ، شمالی مشرقی راجپوتانہ غرض دلی سے تقریباً دو دو سو میل کے فاصلے تک محدود تھی۔ اور اس میں بھی روہیلے اور جاٹ جا بجا بغاوت و سرکشی کرتے رہتے تھے۔ ستلج کے اوپر پنجاب کا صوبہ پہلے ہی افغانوں کے تحت میں آ گیا تھا اور جب ان سے چھٹا تو وہاں سکھوں کی خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں۔ مشرقی دوآب میں والی اودھ کی حکومت تھی اور اس کا بادشاہ سے بس اتنا ہی تعلق رہ گیا تھا کہ اب تک اس کا سرکاری لقب "نواب وزیر" تھا ورنہ حکومت کے اندرونی انتظام میں اس کو بالکل آزاد سمجھنا چاہیے۔ باقی جنوب میں مدت سے مغل بادشاہ کی سرحد دریائے چنبل بن گیا تھا جس کے آگے مرہٹوں یا مقامی رئیسوں کا راج تھا۔

[1] سندھیا کا مشہور جرنیل ڈی بوئنی شہادت دیتا ہے کہ اگرچہ تمام جنوبی ہند شاہ عالم کی حکومت سے آزاد ہو چکا تھا لیکن ہنوز اس کا اتنا اثر باقی تھا کہ ہندوستان بھر میں کسی رئیس و راجہ کو علانیہ "بادشاہ" کا لقب اختیار کرنے کی جرأت نہ تھی۔ (سندھیا مؤلفہ کین صفحہ ۹۴)

الغرض ایسے بادشاہ سے اگر نیابت کی سند ملی بھی تو وہ کچھ بہت مفید مطلب نہ ہوسکتی تھی دوسرے یہ سند جو پیشوا کے نام پر حاصل کی گئی تھی اس سے جو کچھ نفع ممکن تھا وہ خود مادھوجی سندھیا اٹھانا چاہتا تھا اور گو دربار دہلی میں وہ اپنے آپ کو پیشوا کا ماتحت و قائم مقام ظاہر کرتا تھا مگر درحقیقت حکومت پونا سے اس کا یہ تعلق محض سیاسی اور ذاتی اغراض پر مبنی تھا ورنہ بجائے خود اس کے مختار کامل ہونے میں کوئی کسر نہ رہی تھی' شمالی مالیے اور نواح دہلی میں جو مرہٹہ عامل اور مرہٹہ فوجی دستے متعین تھے وہ بھی براہ راست سندھیا ہی کے ملازم تھے اور حکومت پونا کو ان کے معاملات میں کوئی دخل نہ تھا۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ گدی کے اصلی وارث کو بیکار بنا کے برہمنوں کا حکومت پر قابض ہو جانا' مرہٹہ ریاست کی بنیادی کمزوری تھی اور دوسرے پیشوا ہی کے زمانے میں اس کے برے نتائج کا ظہور ہونے لگا تھا' لیکن بالاجی پیشوا کی وفات کے بعد جب اس کے بھائی' رگھوناتھ راؤ یا رگھوبا نے حکومت پر خود قبضہ جمانا چاہا اور اس میں اور بالاجی کے بیٹوں میں کشاکش ہوئی تو پیشوا کے رہے سہے اقتدار میں بھی کمی آنے لگی اور چوتھے پیشوا کے بعد ہی خانگی نزاع سخت نقصان رساں بن گئی اور مرہٹوں کے مختلف طاقتور سردار پونا کی مرکزی حکومت سے قریب قریب آزاد ہو گئے' اس طرح سچ پوچھیے تو مادھو راؤ (چوتھے پیشوا) کے مرتے ہی ۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء مرہٹہ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا تھا[1] اور گو ابھی تک حکومت پونا کی بیرونی لڑائیوں میں

---

[1] اس جگہ پیشواؤں کا شجرۂ نسب پیش نظر رکھنا مفید ہوگا:—

(۱) بالاجی وشوناتھ
— (۲) باجی راؤ (۱۱۳۲ھ/۱۷۲۰ء تا ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء)
 — (۳) بالاجی راؤ (تا ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۱ء)
  — وسواس راؤ
  — (۴) مادھو راؤ (تا ۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء)
  — (۵) نرائن راؤ (تا ۱۱۸۷ھ)
   — (۷) مادھو راؤ نرائن (تا ۱۲۱۰ھ/۱۷۹۵ء)
 — (۶) رگھوناتھ راؤ (رگھوبا) تا ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء
  — (۸) باجی راؤ (معزولی ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء)

باب ۵

دوسرے مرہٹہ سردار بھی شریک و مددگار ہو جاتے تھے لیکن اول تو اس امداد میں اگر خود غرضی نہیں تو خود مختاری کی شان ضرور رہتی دوسرے خود مرکزی حکومت میں یہ قوت و قابلیت نہ رہی تھی کہ وہ صحیح معنوں میں تمام مرہٹہ رئیسوں کو متحد و متفق رکھ سکتی۔ لہذا جب تک اس کا مقابلہ ہندوستانی حریفوں سے رہا جو اس سے بھی زیادہ غیر مستقل اور زوال پذیر تھے، اس وقت تک حکومت پونا ظاہرا بہت اچھی حالت میں رہی لیکن جب ایک تیسری اور تازہ دم بیرونی قوت سیاسیات کے میدان میں داخل ہوئی جس کی کامیابی کا انحصار ہی اہل ہند کے باہمی نفاق سے فائدہ اٹھانے پر تھا، تو مرہٹوں میں سب سے پہلے حکومت پونا ہی زد میں آئی اور اس نے نقصان اٹھایا اور پھر ایک ایک کرکے دوسرے مرہٹہ رئیس بھی مغلوب و سرنگوں ہوتے گئے۔

مرہٹوں کے زوال قوت کا دوسرا قوی سبب جسے ان کی تاریخ کے مشہور مصنف گرانٹ ڈف نے بجا جتایا ہے[۱] یہ تھا کہ ابتدا سے ان کی سپاہ گری قزاقانہ قسم کی تھی اور اسی طرز جنگ کے لیے وہ طبعاً موزوں تھے جس میں نہ کسی باقاعدہ اور منتظم فوج کی ضرورت ہے اور نہ کسی فن حرب کے ماہر سپہ سالار کی پس جب تک وہ دوسروں کے علاقے پر تاخت و تاراج کرتے رہے ان کا زور رہا۔ لیکن جب یہ دوسری قومیں اندرونی اسباب اور کچھ مرہٹوں کی یورشوں سے کمزور ہو کر معدوم ہو گئیں اور ان کے علاقوں پر مرہٹوں کا تسلط ہوا تو پھر انھیں قزاقی کی بجائے ریاست و حکومت کی شان بنانی پڑی، باقاعدہ فوجیں اور توپ خانے رکھنے پڑے اور یہ وہ پابندیاں تھیں جن سے مرہٹہ قوم کی کوئی مناسبت نہ تھی چنانچہ جہاں جہاں ان کی مستقل حکومت قائم ہوئی وہاں شاید دو نسلیں بھی نہ گزری تھیں کہ ان کی فوجوں میں مرہٹہ عنصر کم ہو گیا حتیٰ کہ ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۹ء میں پونا سے جو فوج آراستہ ہو کر شمال کی جانب روانہ ہوئی اس کے پیادوں اور توپ خانے میں

---

[۱] مثلاً دیکھو گرانٹ ڈف کی تاریخ مرہٹہ جلد سوم صفحہ ۱۰۵۔

باب

کوئی مرہٹہ سپاہی نہ تھا اور سواروں میں بھی وسط ہند کے بہت سے پنڈارے شامل تھے[1]۔ اسی طرح مادھوجی سندھیا جس نے مرہٹوں میں سب سے زیادہ قوت حاصل کرلی تھی اور جو توپ و تفنگ کی اہمیت کو بخوبی سمجھتا تھا غیر مرہٹہ فوجیوں کا محتاج ہوگیا تھا، اس کے بہترین سپہ سالار بھی غیر قوم بلکہ غیر ملک کے لوگ تھے، اور ان میں دو فرانسیسی سردار دبوئنی اور پیران خاص طور پر مشہور رہیں۔

دوسری فصل حیدرآباد (و میسور)

خاندان آصفجاہی

اس انقلاب عظیم کے وقت، جبکہ سلطنت مغلیہ کی پرشکوہ عمارت گر رہی تھی اور مرہٹوں کی غارت گری نے سارے ملک میں تہلکہ ڈال دیا تھا، ان کے ہمسائے میں دکن خاص کے علاقوں کا محفوظ و مصئون رہنا خاندان آصفجاہی کی حیرت انگیز قابلیت و مستعدی کا ثبوت ہے۔

یہ نامور خاندان شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی اولاد میں ہے اور اس کے جد امجد خواجہ عابد "کہ پدرش عالم شیخ از عظمائے اکابر سمرقند۔۔۔ بود" عہد شاہجہانی میں ہندوستان آئے اور عہد اورنگ زیب میں قلیچ خاں کے خطاب اور منصب چہار ہزاری سے مفتخر ہوئے، چند سال بعد ان کے فرزند میر شہاب الدین اور بھائی خواجہ بہاء الدین بھی ہندوستان چلے آئے اور سلطنت کے نہایت معزز عہدوں پر سرفراز ہوتے رہے۔ تاریخ میں میر شہاب الدین اپنے شاہی خطاب "غازی الدین فیروز جنگ" سے مشہور رہیں۔

---

[1] "سندھیا" مولفہ کین صفحہ ۵۶۔

باب ۹
دکن سے ابتدائی تعلق

دربار اورنگ زیب کے ان گرامی قدر امیروں کے تفصیلی حالات ہمعصر تواریخ میں جستہ جستہ اور مآثر الامرا میں یکجا موجود ہیں لیکن اس مختصر کتاب میں بھی یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بیجاپور اور گولکنڈے کی فتوحات میں یہ دونوں سردار بادشاہ کے سب سے عزیز و محترم رفقا میں تھے اور بیجاپور کی فتح کا جو اطلاع نامہ دفتر شاہی سے شایع ہوا اس میں قدر شناس بادشاہ نے یہ فقرہ اپنے قلم سے تحریر کیا تھا کہ بیجاپور ...... "بدستیاری فرزند بے ریو ورنگ غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ مفتوح شد" اسی طرح گولکنڈے کے محاصرے میں سپہ سالاری کے فرائض نواب قلیچ خاں کے تفویض کر دئے گئے تھے اور انھوں نے یہیں گولے کے زخم سے انتقال کیا (۱۰۹۸ھ ۱۶۸۷ء) اورنگ زیب کو اس واقعے کا نہایت ملال ہوا، مرحوم کی اولاد مزید اعزاز و اکرام شاہی سے مفتخر ہوئی مگر حق یہ ہے کہ قضا و قدر کی طرف سے اس جاں نثاری کا جو صلہ ملا وہ تمام بادشاہی انعامات سے بڑھ چڑھ کر تھا کیونکہ بادشاہ کے حکم سے جب محاصرین اپنے مرحوم سپہ سالار کی نعش کو لشکرگاہ کے قریب دفن کر رہے تھے[1] تو یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگی کہ وہ درحقیقت دکن میں اسی بہادر امیر کے خاندان کی آیندہ فرماں روائی کی بنیاد جما رہے ہیں۔

نواب نظام الملک آصف جاہ اول۔

اسی موقعے پر مرحوم کے نوجوان پوتے میر قمر الدین کو منصب چہار ہزاری اور "چین قلیچ خاں بہادر" کا خطاب عطا ہوا اور آیندہ کارناموں کے صلے میں مزید ترقی ہوتی رہی لیکن میر قمر الدین کی فراست و تدبر کی آزمایش کا سب سے نازک وقت وہ تھا جب کہ سادات بارہہ فرخ سیر کو معزول و مقتول کرنے کے بعد حکومت کے قریب قریب مالک بن بیٹھے تھے اور سلطنت مغلیہ کے قدیم امرا کا ہر حیلے سے استیصال کر رہے تھے۔ ان سیدوں کی شکست و زوال کا حال پہلے ہماری نظر سے گزر چکا ہے اور یہ مسلم ہے کہ مغل بادشاہ کو میر قمر الدین خاں کی شجاعت و قابلیت اور اسی خاندان کے دوسرے رکن محمد امین خاں

[1] یہ تاریخی مقبرہ قلیچ خاں کی بارہ دری کے نام سے حمایت ساگر کے قریب موجود ہے۔

پسر خواجہ بہاؤالدین کی سعی و کوشش نے بادشاہ گرسیدوں سے مخلصی دلائی تھی، اور آیندہ بھی یہ خاندان سلطنت کی جس خلوص ولیاقت کے ساتھ خدمت گزاری کرتا رہا، اس کی بہت سی مثالیں تاریخ میں محفوظ ہیں حتیٰ کہ یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ محمد شاہ کو اپنے طویل عہد حکومت میں جب کبھی مصائب نے خواب عشرت سے بیدار کیا تو انتہائی پریشانی کے وقت میں اسی خاندان کے افراد خاص کر نواب میر قمرالدین خاں سلطنت کے واسطے سینہ سپر ہوگئے۔ محمد شاہ کی جانب سے اس خدمت و جانسپاری کا اگر کوئی قابل یادگار صلہ ملا تو وہ صرف خطاب آصفجاہ تھا (سنہ ۱۱۳۷ھ / ۱۷۲۵ء) ورنہ اس بادشاہ نے اپنے کم عقل اور حاسد امیروں کے اغوا سے بارہا نواب موصوف کے ساتھ برا سلوک کیا اور گجرات اور مالوے کی طرح دکن کے صوبوں کو بھی آصفجاہ سے لے لینے کی درپردہ کوششیں کیں۔

یہ کوششیں خود سلطنت کے لیے موجب نقصان تھیں، خیرخواہی اور وفاداری کے باوجود نواب نظام الملک کو دہلی کی ناقدرداں حکومت کے حاسدانہ احکام کی تعمیل میں دکن سے دست بردار ہونا گوارا نہ تھا اور کچھ عرصے کے واسطے حفاظت ذاتی کی بدولت بادشاہ کا نواب نظام الملک پر عتاب بھی ہوا لیکن آخر میں محمد شاہ کو اپنے بہترین امیر کی مخالفت سے پشیمانی ہوئی اور بادشاہ کی پریشانیاں دیکھ کر نواب آصفجاہ نے بھی گزشتہ شکایات بھلادیں اور آڑے وقت میں رفاقت و جاں نثاری کے لیے پھر دہلی آنا منظور کرلیا (سنہ ۱۱۴۹ھ / ۱۷۳۶ء) لیکن پچھلے دس بارہ برس میں گجرات و مالوہ مرہٹوں کی آماجگاہ بن گئے تھے بادشاہ کا خزانہ خالی اور فوج کی تعداد بہت ہی کم رہ گئی تھی۔ لہذا اب مذکورۂ بالا صوبوں سے مرہٹوں کے اخراج میں نواب آصفجاہ کی مساعی بھی کارگر نہ ہوسکیں اور مالوے کی چند ہفتے کی لڑائی میں چاروناچار باجی راؤ سے دب کر صلح کرنی پڑی (اقرارنامہ بھوپال سنہ ۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۸ء)۔

جیسا کہ صاحب مآثرالامرا نے تصریح کی ہے مرہٹوں سے اس موقع پر

۱؎ یہ وہ مصالحت نہیں ہے جس کا پہلے ذکر آیا ہے اور جس کا زمانہ سنہ ۱۱۴۲ھ ہجری تھا۔

باب ۴

جس طرح ممکن ہو پیچھا چھڑانے اور ان کی من مانی شرائط قبول کر لینے کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ ابھی دنوں نادر شاہ کی آمد آمد کی خبر گرم تھی[۱]۔ اور حکومت دہلی سے متعلق امید نہ تھی کہ بطور خود اس نئے خطرے کا تدارک کر سکے گی پس نواب آصفجاہ کو جلد سے جلد مالوے سے واپس آنا پڑا اور نہ صرف کرنال کے میدان میں جنگی مدافعت بلکہ حملہ آوروں سے بعد کی مصالحت بھی درحقیقت زیادہ تر آصفجاہ کی سعی و تدبیر کا نتیجہ تھی جس کی خود نادر شاہ نے داد دی[۲]۔

مرہٹوں کو تھوڑے ہی دن میں معلوم ہو گیا تھا کہ بھوپال کے اقرار و مدار محض دفع الوقتی کے واسطے تھے جن کے ایفا کی کوئی امید نہ تھی[۳]، لہذا انھوں نے اس مرتبہ دکن کے علاقوں پر یورش کی جہاں آصف جاہ کا منجھلا فرزند میر احمد ناصر جنگ، نائب صوبہ دار تھا اور فوج کا بڑا حصہ دہلی گیا ہوا تھا۔ دکن کو گجرات کی طرح تاراج کرنے کا اس سے بہتر موقع نہ مل سکتا تھا لیکن ناصر جنگ کی دلیرانہ مدافعت نے مرہٹوں کی ہمت پست کر دی اور انھیں مالی زیر باری اور نقصان کے سوا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا (۱۱۵۲ھ؍۱۷۴۰ء) اور ادھر کچھ عرصے بعد خود نواب آصفجاہ نے دکن پہنچ کر عنان انتظام اپنے ہاتھ میں لی۔

اندرونی نظم و نسق

نواب آصفجاہ کے باقی ایام زندگی دکن ہی میں بسر ہوئے، یہاں پہنچتے ہی

---

[۱] مآثر الامرا۔ جلد سوم ص ۸۴۲۔

[۲] اہل دہلی اپنے ہر دلعزیز و محترم نواب آصفجاہ کی آمد سے جس قدر مسرور و مطمئن ہوئے تھے اس کی شہادت میں یہ مشہور قطعہ تاریخ نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ:-

صد شکر کہ ذات دیں پناہی آمد	رونق دہ ملک بادشاہی آمد
تاریخ رسید نش بگوشم ہاتف	گفت "آیت رحمت الٰہی آمد"

[۳] اس حقیقت کو خاص طور پر جتانے کی ضرورت ہے کیونکہ ڈف اور دیگر انگریز مورخ مذکورۂ بالا جنگ اور مصالحت کو مرہٹوں کے کامل غلبے کا ثبوت بتاتے ہیں حالانکہ خود ان کے آیندہ بیانات سے اس کی تردید ہوتی ہے اور صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ باجی راؤ کی یہ کامیابی محض عارضی اور نواب آصفجاہ کی وقتی مشکلات کا نتیجہ تھی۔

باب ۵

اول تو ناصر جنگ نے باپ سے سرکشی کی لیکن لڑائی میں زخمی ہو کر گرفتار ہوا اور قدردان باپ نے نہ صرف جان بخشی کی بلکہ بہادری کی داد دی، پھر نواب آصفجاہ نے ملک ارکاٹ کی تسخیر پر توجہ کی جس کے مفتوحہ علاقے مرہٹوں کی تاخت و تاراج اور کچھ مقامی رئیسوں کی سرکشی سے صوبہ دار دکن سے منحرف ہوگئے تھے آصفجاہی افواج نے ترچناپلی تک (جس پر مرہٹے قابض تھے) تمام اضلاع کو از سر نو فتح کیا، (۱۱۵۶ھ و ۱۷۴۳ء) پھر یہاں کی حکومت (یا نظامت) انورالدین خاں کے تفویض کر کے نواب آصفجاہ نے اورنگ آباد کو مراجعت کی۔

آصفجاہ کے جانشین

آصفجاہ اول نے برہانپور میں انتقال کیا (جمادی الآخر ۱۱۶۱ھ ۱۷۴۸ء) اور چھ بیٹیاں اور چھ فرزند چھوڑے جن میں سے ایک نو لسے اور چار بیٹوں نے کم سے کم رسمی طور پر مرحوم کی جانشینی کا شرف حاصل کیا۔ لیکن ان واقعات کو پڑھتے وقت مناسب ہے کہ خاندان آصف جاہی کے مشاہیر کا شجرہ پیش کر دیا جائے:۔

خواجہ عابد قلیچ خاں

میر شہاب الدین المخاطب بہ غازی الدینخاں (اول)

میر قمر الدین نظام الملک آصفجاہ (اول)

نواب غازی الدین خاں (فیروز جنگ) (ثانی) — عماد الملک غازی الدین خاں (ثالث) وزیر دہلی

(میر احمد) ناصر جنگ

(میر محمد) صلابت جنگ

(میر نظام علی خاں) نظام الملک آصفجاہ (ثانی)
- نواب سکندر جاہ " " ثالث
- نواب ناصر الدولہ " " رابع
- نواب افضل الدولہ " " خامس
- نواب میر محبوب علیخاں " " سادس
- اعلیٰحضرت نواب میر عثمان علیخاں بہادر نظام الملک آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ و دولتہٗ

(میر محمد شریف) بسالت جنگ

(دختر) — میر ہدایت محی الدین مظفر جنگ

باب ۵

آصف جاہ اول کا فرزند اکبر نواب غازی الدین خاں باپ کی طرف سے نیابتہً دربار دہلی میں امیر الامرا تھا اور دکن میں ضرورت کے وقت یہ خدمت دوسرا بھائی نواب ناصر جنگ انجام دے چکا تھا اس کی جنگی اور انتظامی قابلیت مسلم تھی اور باپ کے انتقال کے بعد وہی نظام الدولہ ناصر جنگ کے خطاب سے مسند صوبہ داری پر متمکن ہوا، پھر اسی زمانے میں جب احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت دربار دہلی سے طلبی ہوئی تو وہ فوج لے کر دکن سے روانہ ہوا تھا کہ ادھر تو بادشاہ نے فسخ عزیمت کی ہدایت کی اور ادھر اس کے بھانجے ہدایت محی الدین خاں نے خود دکن میں علم سرکشی بلند کیا۔ اس نوجوان امیر زادے کو نواب آصفجاہ اول کی جانشینی کا دعویٰ تھا اور چندا صاحب اور ڈو پلے جیسے سازشی رفیق مل گئے تھے، چندا صاحب کا اصلی نام حسین دوست خاں ہے اور وہ کرناٹک یا ارکاٹ کے ان مقامی (نوائت) رئیسوں کا سرگروہ تھا جنھیں آصفجاہ اول نے بے دخل کر کے انورالدین کو وہاں کا ناظم بنا دیا تھا۔ اور دو پلے دکن میں اہل فرانس کی تجارتی کوٹھیوں کا صدر عامل یا گورنر تھا جنھوں نے تقریباً نصف صدی پہلے ساحل کورومنڈل پر ایک گاؤں (پھل چری) خرید کر اسے اپنا صدر مقام اور سب سے بڑی تجارتی بندرگاہ بنا لیا تھا، یہی جگہ تاریخ میں پانڈی چری (یا "پان ڈی تیری") کے نام سے مشہور ہے۔

جنگ کرناٹک

فرنگی سوداگروں کے ہندوستان آنے اور ملک گیری کا منصوبہ سوچنے کے حالات آئندہ باب میں یکجا ہماری نظر سے گزریں گے، اس جگہ یہ کہنا کافی ہے کہ ڈوپلے پہلا فرنگی ہے جس نے اہل ہند کی کمزوریوں کو تاڑا اور انھیں آپس میں لڑا کر خود حکومت قائم کرنے کا وسیع و پیچیدہ جال تیار کیا تھا۔ اس سازش میں چندا صاحب کو تو فرانسیسیوں کے ساتھ برابر کا شریک سمجھنا چاہیئے لیکن جو صید غافل سب سے پہلے اس جال میں پھنسا وہ ہدایت محی الدین خاں المخاطب بہ مظفر جنگ ہے۔

شرکائے سازش کو شروع میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ انھوں نے انورالدین خاں

باب ۶

ناظم کرناٹک پر حملہ کیا اور وہ اتفاق سے پہلی ہی جنگ میں مارا گیا (۱۱۶۲ھ / ۱۷۴۹ء) ملک پر یہ "اتحادی" قابض ہو گئے۔ لیکن ابھی وہ خوشیاں ہی منا رہے تھے کہ نواب ناصر جنگ نے فوج کثیر کے ساتھ اورنگ آباد سے کوچ کیا اور سازش کے اصلی مرکز یعنی پانڈی چیری کے قریب تک آپہنچا۔ صوبہ دار دکن کی اس یلغار نے اتحادیوں میں ہل چل ڈال دی۔ مظفر جنگ اور چندا صاحب کے تمام رفیق سمٹ کر پانڈی چیری سے کچھ فاصلے پر جمع ہو گئے اور فرانسیسی سپاہ کی بہت بڑی تعداد ان کی امداد کے واسطے آئی۔ فرنگی سپاہی جن کی قواعد دانی اور بہادری کی بے سر و پا تعریف سے جدید تواریخ ہند کے ورق سیاہ نظر آتے ہیں، اگر غور کیا جائے تو ایشیا میں دراصل اکثر موقعوں پر فریق مقابل کی باہمی نااتفاقی اور غداری سے لڑائیاں جیتی ہیں اور اس موقع پر بھی ڈوپلے برابر سازباز میں مصروف تھا۔ لیکن اس ریشہ دوانی کا کوئی نتیجہ نکلنے نہ پایا تھا کہ فرنگی سپاہیوں نے محض مرعوب ہو کر ایک رات بغیر کسی بڑی لڑائی کے فرار اختیار کیا اور کمال بزدلی سے اپنے رفیق مظفر جنگ کو تنہا چھوڑ گئے جو صبح کو معمولی زد و خورد کے بعد گرفتار کر لیا گیا[۱] (ربیع الثانی ۱۱۶۳ھ / ۱۷۵۰ء)

فرانسیسی نفوذ دربار دکن میں

مگر اورم لکھتا ہے کہ مذکورۂ بالا ناکامی کے باوجود مکار ڈوپلے اس بات سے مایوس نہ ہوا تھا کہ نواب ناصر جنگ کے دربار میں کسی نااتفاقی کا پتہ لگائے گا یا خود کوئی ایسا نفاق پیدا کر دے گا جس سے عیاری کے ساتھ اپنا کام نکل آوے اور دوبارہ مظفر جنگ اور چندا صاحب کے بگڑے ہوئے معاملات کی اصلاح ہو سکے" اس کا خیال صحیح نکلا، چند مہینے کی ریشہ دوانی سے نواب کے چند پٹھان امیر ڈوپلے سے مل گئے اور انہی غداروں کی تحریک سے فرانسیسیوں نے نواب کی فوج پر شبخون مارا پھر جب ناصر جنگ ہاتھی پر سوار ہو کر خود سپاہیوں کی ہمت بندھانے نکلا اور ان پٹھانوں کی طرف بھی آیا تو ان میں سے ایک پٹھان امیر

[۱] مآثر الامرا جلد سوم صفحہ ۸۰۵۔ آورم جلد اول صفحہ ۱۳۹، ۱۴۰۔ میلیسن صاحب نے حسب دستور ان واقعات کے بیان کرنے میں بہت سی تاویلات پیش کی ہیں، "ہسٹری اوف دی فرینچ ان انڈیا" صفحہ ۲۴۸ وغیرہ۔

باب ۶

(ہمت خاں نامی) نے اپنے آقا ناصر جنگ کے گولی لگائی اور جوں ہی وہ مر کر ہاتھی سے نیچے گرا فوراً اس کا سر کاٹ لیا۔ (۱۱۶۴ھ)

اہل سازش نے اسی وقت مظفر جنگ کو قید سے نکال کر مسند دکن پر بٹھا دیا تھا اور جب وہ بھی تھوڑے دن بعد باہمی نفاق و شورش کا شکار ہوا تو نواب آصفجاہ اول کے تیسرے فرزند نواب صلابت جنگ کی مسند نشینی کا اعلان کر دیا جو مظفر جنگ کی طرح فرانسیسیوں کی طرف مائل تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ فرانسیسی فوج کے سردار موسیو بوسے (بوسی) کو دربار دکن میں بڑا رسوخ حاصل ہو گیا اور اس میں شک نہیں کہ اس نے ریاست کو بیرونی حملوں سے بچانے میں جانبازی اور قابلیت بھی دکھائی، یہ بیرونی حملے مرہٹوں نے کئے تھے لیکن انھیں اصلی قوت و تحریک نواب غازی الدین خاں (ثانی) سے پہنچ رہی تھی جو اپنے باپ نواب آصف جاہ اول کی وراثت کا دعوی دار تھا اور صوبہ داری دکن کی سند لے کر دہلی سے فوج کشی کی تیاریاں کر رہا تھا، اس نے اپنی مدد کے معاوضے میں مرہٹوں کو ملک خاندیس دینے کا وعدہ کیا تھا اور اس کی آمد سے پہلے مرہٹہ حلیفوں نے صلابت جنگ سے لڑائی چھیڑ دی تھی۔ لیکن اول تو یہ حملے چنداں کارگر نہ ہوئے اور ادھر نواب غازی الدین خاں کا اورنگ آباد پہنچتے ہی انتقال ہو گیا پس یہ جھگڑا جسکی نسبت خوف تھا کہ سخت خانہ جنگی کی صورت اختیار کرے گا ایک ہی سال میں رفع دفع ہو گیا (۱۱۶۵ھ ۱۷۵۲ء) اور اس اثناء میں فرانسیسیوں کو دربار میں مزید قوت حاصل ہو گئی۔ سال آئندہ جنوبی اڑیسہ کے چار بڑے بڑے اضلاع[1] کی سند بھی انھیں مل گئی جو فوجی مصارف کے لیے بطور جاگیر عطا ہوئے تھے اور انکی سالانہ آمدنی کا تخمینہ تقریباً چالیس لاکھ روپے کیا جاتا تھا۔

نواب نظام علیخاں آصفجاہ ثانی

امرائے دکن کی خود غرضی اور باہمی نا اتفاقی و نیز فرنگیوں کی ریشہ دوانیوں سے

---

[1] یعنی سرکار ہائے مصطفےٰ نگر، ایلور، راجمندر رام اور چکا کول جو اب "شمالی سرکاروں" کے نام سے احاطۂ مدراس میں شامل ہیں۔

باب

آئندہ پانچ سات برس تک ملک دکن کی حالت میں بہت ابتری رہی مگر اسی بدنظمی نے خاندان آصف جاہی کے سب سے بہتر فرد کو مسند فرمانروائی پر پہنچنے کا موقع دیا اور کچھ عرصے دیوان رہنے کے بعد نواب میر نظام علی خاں نے نظام الدولہ آصفجاہ ثانی کے خطاب سے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی (۱۱۷۵ھ/۱۷۶۲ء)۔

واضح رہے کہ نواب صلابت جنگ کی کمزوری اور غیر ہردلعزیزی کی سب سے آخری اور قوی وجہ وہ لڑائی ہوئی تھی جس میں مرہٹوں نے اسے اودگیر کے قریب گھیر کر خاندیس و برار، نیز دولت آباد و بیجاپور کے وسیع علاقے دینے پر مجبور کر دیا تھا (۱۱۷۳ھ/۱۷۶۰ء) لہذا نواب میر نظام علیخاں بہادر کی سب سے پہلی کوشش یہ تھی کہ جس طرح ہوسکے اس نقصان کی تلافی کی جائے اور پانی پت میں مرہٹوں کی سخت ہزیمت نے کامیابی کا خداداد موقع دے دیا تھا۔ چنانچہ آیندہ دو تین سال تک مرہٹوں سے برابر جنگ ہوتی رہی جس میں نواب نظام الدولہ بہادر کی فوجوں نے ایک مرتبہ خاص پونا تک بڑھ کر اس شہر کو جلا دیا (۱۱۷۷ھ/۱۷۶۳ء) اور اس کے جواب میں مرہٹوں کی اورنگ آباد و حیدرآباد پر یورش ناکام رہی آخر نصف سے زیادہ کھویا ہوا علاقہ لے کر نواب نظام الدولہ بہادر نے مرہٹوں سے صلح کر لی۔

انگریزوں کے تعلقات

اس مصالحت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اب انگریز نہ صرف اپنے فرانسیسی حریفوں پر غالب آگئے تھے بلکہ بنگال و ارکاٹ میں بھی ان کا عمل دخل ہوتا جاتا تھا اور اسی زمانے میں شاہ عالم (ثانی) سے بالا ہی بالا انھوں نے شمالی سرکاروں کا فرمان لے کر اس علاقے پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ ۱۷۶۵ء اس کارروائی کی حیدرآباد میں اطلاع ہوئی تو نواب نظام الملک کو نہایت غصہ آیا اور فوج کشی کی تیاریاں کی گئیں کہ انگریزوں کو جبراً اس علاقے سے خارج کر دیا جائے۔ لیکن پلاسی کے فاتح ابھی ہر میدان میں کود پڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ انھوں نے دب کر سات لاکھ روپیہ سالانہ خراج اور بوقت ضرورت خراج گزاری کی حیثیت سے کچھ امدادی فوج دینے کا عہد کر لیا اور ان شرائط پر نواب نظام الملک نے وہ سرکاریں انھیں کے قبضے میں

رہنے دیں[۱] (سنہ ۱۱۸۰ و ۱۱۸۱ھ ۱۷۶۶ء) بایں ہمہ انگریزوں نے یہ روپیہ کئی سال تک ادا نہیں کیا اور مختلف عذرات کی بنا پر لیت ولعل کرتے رہے نیز نواب نظام الملک کی میسور سے جنگ چھڑی تو اس میں حسب معاہدہ امدادی فوج بھی نہ بھیجی۔ حالانکہ چند سال بعد جب خود ان کو ٹیپو سلطان سے جنگ پیش آئی تو اس میں حیدر آباد کی سپاہ برابر کی شریک تھی اور تاوان جنگ اور مفتوحہ علاقے میں اس ریاست کو بھی قریب قریب برابر کا حصہ ملا۔ (محاربات میسور سنہ ۱۲۰۴ھ ۱۷۸۹ء تا سنہ ۱۲۰۶ھ ۱۷۹۲ء) لیکن اس متحدہ جنگ و فتح کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ حکومت پونا سے نواب نظام الملک کی پھر لڑائی چھڑ گئی اور بیدر کے قریب عین معرکۂ جنگ میں بعض غداروں نے دغا دی نواب نظام الملک کو ہٹ کر قلعۂ کھرڑلا میں پناہ گزیں ہونا پڑا اور مرہٹوں کے حسب منشا شرائط تسلیم کرنی پڑیں (سنہ ۱۲۰۹ھ) اس موقع پر بھی انگریزوں نے معاہدات کے خلاف کوئی کمک نہ بھیجی پس نواب نظام الملک نے ان کی امدادی فوج متعینہ حیدر آباد کو برطرف کر دیا[۲]۔

ان واقعات نے نواب نظام الملک کو دوبارہ فرانسیسیوں کی مدد سے اپنی فوج کو جدید قواعد و اسلحہ جنگ سے آراستہ کرنے پر آمادہ کیا اور چند ہی سال کی کوشش میں حیدر آباد میں ایک اعلیٰ درجے کی فوج مرتب ہو گئی جو جدید ترین آتشی اسلحہ سے مسلح تھی اور جس کی جنگی ضروریات کے لیے خود حیدر آباد میں توپ و بندوق ڈھالنے کے بڑے بڑے کارخانے بن گئے تھے ان کارخانوں کی غالباً ہندوستان بھر میں نظیر نہ تھی اور ان کے ساختہ اسلحہ کی ہمعصر انگریزوں نے جا بجا تعریف کی ہے کہ وہ یورپ کے بہترین اسلحہ سے کسی طرح کم پایہ نہ تھے[۳]۔

---

[۱] دیکھو "ہسٹوریکل اینڈ ڈس کرپٹو اسکیچ ... نظامز ڈومی نینز" صفحہ ۸۸، نیز اوکس فوڈ ہسٹری صفحہ ۵۵۸۔

[۲] " " " " " .... " " صفحہ ۹۴۔

[۳] " " " " " .... " " صفحات ۹۰ و ۱۰۳۔

باب ۵

حیدر آباد کی جدید قواعد داں فوج کو موسیو ریمون اور پیراں جیسے لائق و کارداں فرانسیسی سردار مل گئے تھے جنھوں نے مختلف معرکوں میں اپنی رفاقت و سپہ سالاری کے جوہر دکھا کر دربار دکن میں نہایت ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی اور ولیعہد ریاست (نواب سکندر جاہ) نیز دیگر امرا ریمون کے بڑے قدرداں تھے لیکن یہاں خاص طور پر یاد رکھنے کے لائق بات یہ ہے کہ یہ فرانسیسی ملازمین دوپلے کے پہلے فرستادوں کی طرح ریاست حیدر آباد کے در پردہ دشمن نہ تھے کہ اپنے قومی فوائد یا ملک ستانی کے لیے ریاست کو کمزور و بے قابو کرنے کی سازشیں کرتے۔ لہٰذا ان سے نواب نظام الملک کی قوت کو کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا، لیکن حیدر آباد کا بجائے خود ایک قوی ریاست بن جانا اور وہاں فرانسیسیوں کی موجودگی ان کے قومی رقیب انگریزوں کو گوارا نہ ہو سکتی تھی۔ وہ موقع کی تاک میں لگے ہوئے تھے اور جب ریمون نے وفات پائی (۱۲۱۳ھ ۱۷۹۸ء) تو انھوں نے یک بہ یک حیدر آباد کی جدید سپاہ کو گھیر کر ہتھیار رکھوا لیے اور اس ایک ہی چال میں نواب نظام الملک کی جنگی قوت کو ایسا نقصان پہنچا دیا کہ ونسنٹ اسمتھ کے قول کے بموجب پھر انگریزوں کو نہ ریاست حیدر آباد کی دشمنی کا خوف رہا نہ دوستی کی تمنا[۱]۔ غرض اس طرح ریاست کی خود مختاری میں روز بروز کمی ہوتی گئی ادھر انگریزی مقبوضات اور جنگی قوت میں برابر اضافہ ہوتا رہا تا آنکہ ہندوستان کی اور ریاستوں کے ساتھ ریاست حیدر آباد بھی رفتہ رفتہ ان کی سیادت کے تحت میں آ گئی۔

میسور کی آزاد ریاست

ریاست حیدر آباد اور مرہٹوں پر انگریزوں کی بالادستی کے ضروری واقعات ہم آئندہ پڑھیں گے۔ یہاں جنوبی ہند کی ایک اور اسلامی قوت کا مختصر حال بیان کر دینا مناسب ہے جو اسی زمانے میں ایک خود مختار و طاقتور حکومت بن گئی تھی اور گو اس کے قیام کا سلطنت مغلیہ کے زوال سے کوئی براہ راست تعلق نہ تھا لیکن وہ ہندوستان کے اسی عہد انقلاب کی

---

[۱] اوکسفرڈ ہسٹری صفحہ ۵۸۲۔ نیز دیکھو ہسٹوریکل ۔۔۔۔ اسکیچ صفحہ ۔۔ وغیرہ۔

باب

ابتدائی تاریخ ایمپائر سلطنت سے تعلق

سب سے دلچسپ تاریخی یادگار ہے :-

جیسا کہ ایک انگریز تاریخ نویس نے جتایا ہے "وہ تمام علاقہ جسے آجکل میسور کہتے ہیں حیدر علی سے پہلے کبھی کسی حکومت واحد کے زیر نگیں نہ ہوا تھا" بلکہ جب سے اس کی تاریخ کا سراغ ملتا ہے اس وقت سے اس علاقے میں دو تین ریاستیں قایم تھیں اور اس پورے علاقے پر سلطنت وجیانگر کا بھی قبضہ نہ تھا۔ پھر جب وجیانگر کی قوت میں زوال آیا اور چھوٹے چھوٹے پرگنوں کے زمیندار جنھیں "پالی گار" یا "نائک" کہتے ہیں خود مختار ہو گئے تو میسور یا سری رنگ پٹن (سرنگا پٹم) کے حاکم (یا "وڈیار") کی حیثیت بھی اس وقت ایک بڑے زمیندار سے زیادہ نہ تھی اگرچہ اس کے قبضے میں دوسروں کی نسبت زیادہ علاقہ تھا۔

یہ ٹھیک پتہ نہیں چلتا کہ میسور کے ان رئیسوں کا حکومت بیجاپور سے بھی کوئی مستقل سیاسی تعلق تھا یا نہیں لیکن جس وقت اورنگ زیب نے دکن کی ریاستوں کو فتح کیا تو سری رنگ پٹن کے وڈیار کی طرف سے وکیلوں نے حاضر دربار ہو کر اطاعت و باج گزاری کا اقرار کیا اور اس کے جواب میں وہاں کے رئیس کو بادشاہ کی جانب سے "راجہ" کا خطاب ملا۔ بعد کی تاریخی شہادتوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کے راجہ صوبہ دار دکن کے ماتحت اور سلطنت مغلیہ کے باج گزار سمجھے جاتے تھے اور نواب ناصر جنگ نے مظفر جنگ اور چند اصاحب کے خلاف کرناٹک پر فوج کشی کی' تو اس موقع پر سری رنگ پٹن یا میسور کے راجہ نے بھی نواب نظام الملک کو بحیثیت باج گزار امدادی فوج بھیجی تھی۔[1]

صوبہ دار دکن کے ساتھ میسور کے ان ماتحتانہ تعلقات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر ہم نواب نظام الملک اور حیدر علی میں آیندہ مخالفت کے صحیح اسباب نہیں سمجھ سکتے اور ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ دربار حیدرآباد نے

---

[1] ملاحظہ ہو "حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان" مولفہ بورنگ سابق کمشنر میسور صفحات ۱۵، ۱۸، ۲۳ نیز دیکھو مآثر الامرا جلد سوم صفحہ ۸۵۰ وغیرہ وغیرہ۔

باب

حیدر علی کا تسلط

نے میسور کی اسلامی بادشاہی کا خاتمہ کرنے میں اس قدر سرگرمی کیوں دکھائی؟

القصہ یہ سری رنگ پٹن کا لائق راجہ (چک دیوراج) جس نے اورنگ زیب سے حکومت کی سند حاصل کی تھی، فوت ہوا (سنہ ۱۱۱۶ھ/۱۷۰۴ء) تو اس کی اولاد میں کوئی راجہ ایسا نہ ہوا جو اولو العزمی یا عمدہ اوصاف حکمرانی سے متصف ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی باگ رفتہ رفتہ اس کے وزیر جنگ یا "دلوائی" کے قبضے میں آگئی اور خاندانی راجہ محض "شاہ شطرنج" سمجھے جانے لگے ادھر یہی زمانہ ہے جب کہ عام روایتوں کی بموجب حیدر علی کے قریشی النسل اجداد شمالی ہند سے ترک وطن کرکے دکن آئے اور بارھویں صدی ہجری کے وسط میں ان کا خاندان بنگلور میں آبسا، حیدر علی کا باپ (فتح محمد) کرناٹک کی لڑائیوں میں مارا گیا تھا مگر اس نے اور اس کے بھائی اسمعیل نے میسور کے دلوائی کی فوجی ملازمت اختیار کی جس میں اپنی دلیری اور کارگزاری سے وہ رفتہ رفتہ ترقی کرتے گئے اور غالباً سنہ ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۵ء میں حیدر علی ضلع ڈنڈیگل کا فوجدار مقرر ہوا، یہاں اس نے پیادہ اور سوار فوج کی ایک بڑی جمعیت فراہم کی اور فرانسیسیوں کی مدد سے گولے بارود کا بھی کافی ذخیرہ جمع کرلیا اور مجموعی طور پر اتنی قوت و شہرت حاصل کرلی کہ دو سال کے بعد جب مرہٹوں نے میسور پر یورش کی تو دلوائی نے حیدر علی ہی کو اپنا سپہ سالار مقرر کیا اور محض اس کی مستعدی اور عمدہ سپہ سالاری کی بدولت حملہ آور تاوان جنگ لے کر ٹل گئے اور میسوری اضلاع ان کے ہاتھ میں پڑنے سے بچ گئے (سنہ ۱۱۷۳ھ/۱۷۶۰ء)۔

حیدر علی کا اس قدر اقتدار دیکھ کر میسور کے موروثی راجہ کو خیال آیا کہ اس کی مدد لے کر دلوائی کے پنجے سے رہائی حاصل کرے اور جب حیدر علی نے دلوائی کو نکال کر خود حکومت کا مالک بننا چاہا تو راجہ نے مرہٹوں کو مدد کے واسطے بلایا۔ حیدر علی کو میسور سے بھاگنا پڑا اور مرہٹے واپس چلے گئے تو اس وقت بھی حیدر علی بہ مشکل اپنے رقیبوں کو زیر کرسکا لیکن تقریباً دو سال کی جدوجہد کے بعد آخر کار اسے کامیابی ہوئی اور سنہ ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۲ء سے ہم اس کو ریاست میسور کا خودمختار حاکم کہہ سکتے ہیں۔ اتفاق سے انھی دنوں نواب نظام الملک کے

بھائی بسالت جنگ نے سیرا پر فوج کشی کی تھی۔ یہ مقام میسور کے شمال میں اورنگ زیب کے سب سے جنوبی صوبے کا مستقر تھا اور ان دنوں اس پر مرہٹے قابض تھے۔ بسالت جنگ کو اسے فتح کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی لیکن حیدر علی نے اسے تین لاکھ روپے دے کر سیرا کی صوبہ داری اپنے نام لکھوالی اور اسی سند میں اسے ''نواب حیدر علی خاں'' کا خطاب دیدیا گیا۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ بسالت جنگ کی بے قاعدہ کارروائی تھی اور دربار دکن میں اس خطاب و سند کو کبھی نہیں مانا گیا چنانچہ حیدرآباد کی ہمعصر تاریخوں میں میسور کے نئے حاکم کو ہمیشہ ''حیدر نائک'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حیدر علی کی فتوحات

بہرحال اب حیدر علی ریاست میسور کا خودمختار حاکم تھا۔ موروثی راجہ کی حیثیت ایک شاہی نظر بند سے زیادہ نہ تھی اور دوسرے رقیب بھی مغلوب ہو گئے تھے لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا اس زمانے میں میسور یا سری رنگا پٹن کا علاقہ موجودہ ریاست میسور کی نسبت بہت کم تھا اور حیدر علی کی اولوالعزمی ایسی چھوٹی ریاست پر قناعت نہ کر سکتی تھی، چنانچہ آئندہ بیس برس تک اس کی تمام زندگی جنگ و جدال میں گزری جس میں سے بعض لڑائیوں کی غرض کشورکشائی تھی اور باقی ان مفتوحہ علاقوں کی حفاظت کے واسطے ہوتی رہیں، اس کی فتوحات کے تفصیلی حالات لکھنے کا یہ موقع نہیں ہے لیکن اجمالی طور پر اس قدر لکھنا مناسب ہوگا کہ حیدر علی نے غالباً چیتل ورگ اور بدنور کی ابتدائی فتوحات کے بعد ہی جنوبی ہند میں ایک وسیع سلطنت قائم کرنے کا منصوبہ سوچ کر اس کی تکمیل میں رفتہ رفتہ کورگ اور ساحل ملیبار کا تمام علاقہ فتح کر لیا تھا، مرہٹوں کی پیہم یورش اور نواب نظام الملک اور انگریزوں کی شدید مخالفت کے باوجود شمال اور مشرق کی طرف بھی اس کی حدود سلطنت برابر بڑھ رہی تھیں اور ایک زمانے میں انگریزوں کو خود کرناٹک و مدراس کی سلامتی مخدوش نظر آنے لگی تھی۔

ٹیپو سلطان

انگریزوں کے ساتھ ریاست میسور کی لڑائیوں کے حالات ہم آیندہ پڑھیں گے، جنگ کا یہی سلسلہ جاری تھا کہ اس کے دوران میں حیدر علی نے

وفات پائی (۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۲ء) اور اس کا بڑا بیٹا فتح علی ٹیپو سلطان تخت نشین ہوا "سلطان" کا لقب خود حیدر علی نے کبھی اختیار نہیں کیا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس کے آخری زمانے میں بادشاہی کے تمام لوازم جمع ہو گئے تھے، اس کی خودمختاری ۱۱۷۵ھ / ۱۷۶۲ء سے مسلم تھی، دکن کے صوبہ دار سے ماتحتی اور خراج گزاری کا تعلق بالکل منقطع ہو چکا تھا اور جنگی قوت و ریاست میں اضافے کے ساتھ حیدر علی کو اب نواب نظام الملک کی ہمسری کا دعویٰ تھا اور یہی وہ بات تھی جس نے حیدرآباد کی حکومت کو میسور کا سخت مخالف و رقیب بنا دیا۔ ۱۱۹۲ھ میں اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کی نواب ساونور کی بیٹی سے شادی کی تو سری رنگ پٹن میں یہ رسم شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ منائی گئی، اسی طرح دیگر تقریبات یا درباروں کے موقع پر ہم حیدر علی کو بادشاہی لباس میں جلوہ گر پاتے ہیں اور فیل سفید پر اس کی سواری کا جلوس اسی ماہی مراتب اور ساز و سامان کے ساتھ نکلتا ہے جو خاص بادشاہوں کی شان تھی۔

ٹیپو کے عہد میں قدرتی طور پر بادشاہی کی یہ شان زیادہ نمایاں ہو گئی ریاست میسور سرکاری طور پر "سرکار خداداد" کے نام سے موسوم ہوئی اور "حیدر نائک" کے فرزند نے "سلطان" کا پرشکوہ لقب اختیار کیا جسے دہلی کے برائے نام تاجداروں کے جیتے جی دکن کے طاقتور صوبہ داروں نے بھی اپنے واسطے جائز نہ رکھا تھا ایک اعتبار سے ٹیپو کی یہ خودنمائی کچھ بیجا نہ تھی رقبے میں تقریباً انگلستان کے مساوی ملک اس کے زیر نگین تھا، نوے[1] ہزار جنگ آزما سپاہی اس کے حکم پر سر کٹوانے کے لیے تیار تھے، روپے پیسے اور جنگی ساز و سامان کے ذخائر باپ کے ترکے سے ملے تھے اور اندرونی طور پر بھی اس کی ریاست خاصی منظم حالت میں تھی لیکن "سلطان میسور" کی یہی سطوت و قوت جس نے ٹیپو کو مغرور بنایا اس کے ہمسایوں کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی اور حیرت ہے کہ ایسے خطرناک دشمنوں سے مقابلہ ہونے کے باوجود ٹیپو سلطان نے غالباً اس بات کا

---

[1] "حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان" صفحہ ۱۱۹۔

باب ۸

صحیح اندازہ نہیں کیا کہ میسور کی نئی سلطنت کی بنیادیں نہایت ناپائدار ہیں بے شبہ حیدر علی نے اپنی ذاتی قابلیت سے ترقی کی تھی اور وقتی حالات سے فائدہ اٹھا کر بہت قوت بہم پہنچا لی تھی لیکن یہ ظاہر ہے کہ اہل ملک اسے دل میں محض غاصب سمجھتے تھے اور اس کے ہم قوم یا ہم مذہب لوگوں کی کوئی ایسی بڑی تعداد میسور میں آباد نہ تھی جو اس نئی حکومت کے استحکام کی ضامن ہوتی، ادھر ہمسائے میں تین بڑی طاقتیں موجود تھیں جنھیں کسی چوتھے رقیب کا خود مختار و قوی ہونا کسی طرح گوارا نہ تھا، اس حالت میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی بہترین حکمت عملی بظاہر یہی ہو سکتی تھی کہ جس طرح ممکن ہوتا ریاست حیدر آباد سے دوستانہ تعلقات قائم رکھتے اور کم سے کم رسمی طور پر میسور کی سابقہ باج گزاری کو نباہتے کہ ہمسایوں کو حسد کرنے کا زیادہ موقع نہ ملتا، لیکن دولت و قوت حاصل کرنے کے بعد آدمی ایسی مصلحتوں کو باعث عار سمجھنے لگتا ہے اور ٹیپو سلطان کا تو یہ قول مشہور ہے کہ دو سو برس بھیڑ بن کر جینے سے کہیں بہتر ہے کہ میں صرف دو دن شیر کی طرح زندہ رہوں[15]! چنانچہ گو ۱۲۰۷ھ/۱۷۹۲ء کی لڑائیوں میں اس کا نصف کے قریب ملک چھن گیا ("عہد نامہ سرنگا پٹم" ۱۲۰۷ھ/۱۷۹۲ء) اور وہ کبھی اپنے ملکی محصولات بڑھا بڑھا کے ازسر نو بری اور بحری فوجیں فراہم کرنے کی کوشش اور کبھی فرانسیسیوں کے ساتھ ساز باز کرتا تھا کہ اپنے تین تین دشمنوں کا کلہ بہ کلہ مقابلہ کر سکے لیکن خود ان دشمنوں کی باج گزاری یا اطاعت قبول کرنے کا اسے کبھی خیال نہ آیا اور آخر اسی جذبۂ خود مختاری کی خاطر اس نے جان دی (۱۲۱۳ھ/۱۷۹۹ء) اسی کے ساتھ جنوبی ہند کی آزاد حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

[15] "حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان"، صفحہ ۲۲۳ -

باب ۳

تیسری فصل شمالی ہند کی ریاستیں
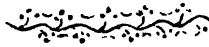
(۱) بنگالہ

بنگالہ سلطنت مغلیہ کا سب سے وسیع صوبہ تھا اور اس میں موجودہ بنگال اور بہار (و اڑیسہ) کے تمام اضلاع شامل تھے، لیکن صدر مقام ڈھاکہ تھا۔ صوبے کی زرعی خوش حالی اور بعض صنعتیں صدیوں سے مشہور تھیں اور گیارھویں صدی ہجری میں فرنگی تاجروں کی آمد و رفت کی بدولت اس کی بحری تجارت میں بھی نمایاں ترقی ہوگئی تھی، مگر اسے مرطوب آب و ہوا اور وبائی امراض نے بدنام کر رکھا تھا۔ مغل امرا اس دور دست علاقے میں آنے سے گھبراتے تھے اور مستعد کارگزار عہدہ داروں کی کمی سے اکثر یہاں کے مالی انتظامات میں ابتری رہتی تھی۔ اورنگ زیب کے آخری عہد میں اس کا عزیز اور لائق پوتا شہزادۂ عظیم الشان بنگالے کا صوبہ دار تھا لیکن غالباً ملک کی حالت اس وقت بھی اصلاح طلب تھی کہ بادشاہ نے محمد ہادی نامی (ایک نو مسلم برہمن) کو پہلے اڑیسہ اور پھر کل بنگالے کا دیوان بنا کر دکن سے ڈھاکے بھیجا اور اس نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنی قابلیت سے یہاں کی آمدنی بڑھا دی، نئے دیوان کی جز رسی نے جب شہزادۂ عظیم الشان کے مصارف کو روکا تو شہزادہ دیوان سے بہت ناخوش ہو گیا بلکہ شہزادے کے اشارے سے ایک مرتبہ چند سپاہیوں نے دیوان پر حملہ بھی کیا لیکن وہ قابو میں نہ آیا اور جب بادشاہ کو ان باتوں کی اطلاع ہوئی تو اس نے پوتے کو لکھ بھیجا کہ محمد ہادی بادشاہی نوکر ہے "اگر سر موئے ضرر جانی یا مالی بہ او خواہد رسید انتقام از ازاں باخواہد کشید!"[1]

[1] رقعات عالمگیری۔ نیز دیکھو ریاض السلاطین ۲۵۰۔

یہی محمد ہادی ہے جو چند روز بعد مرشد قلی خاں اور پھر نواب جعفر خاں کے خطاب سے بنگالے کا صوبہ دار بنایا گیا اور سنہ ۱۱۳۹ھ ؍ ۱۷۲۷ء تک اس عہدے پر سرفراز رہا ڈھاکہ چھوڑ کر مرشد آباد کے مرکزی مقام کو اسی نے بنگالے کا مستقر بنایا اس کا پرانا نام مخصوص آباد یا مقصود آباد بدل کر مرشد آباد کے نام سے اس کو نہایت رونق و ترقی دی انتظامی قابلیت کے علاوہ اس کی سخت گیری اور انصاف پسندی ضرب المثل تھی اور کہتے ہیں کہ ایک مظلوم کے قصاص میں اس نے خود اپنے بیٹے کو جان سے مروا دیا تھا[1]

جعفر خاں اپنے نواسے سرفراز خاں کو جانشین بنانا چاہتا تھا لیکن خود سرفراز خاں کے باپ شجاع الدین والی اڑیسہ نے یہ بات گوارا نہ کی۔ بیٹے نے بھی اس کے سامنے سر جھکا دیا اور دربار دہلی نے بھی شجاع الدین کو شجاع الدولہ اسد خاں کے خطاب سے بنگالے کا صوبہ دار تسلیم کر لیا آیندہ تیرہ سال تک شجاع الدولہ نے حکومت کی اور جعفر خاں کی طرح وہ بھی نہایت منتظم اور لائق صوبہ دار گزرا ہے جس کے سب فارسی اور انگریزی تاریخ نویس مداح ہیں۔

علی وردی خاں

شجاع الدولہ اور نیز اس کا بیٹا سرفراز خاں حکومت دہلی کے فرمانبردار رہے اور گو بنگالے کے صوبہ داروں نے آیندہ بھی کبھی علانیہ خود مختاری کا دعویٰ نہیں کیا لیکن صدر حکومت کی کمزوری سے سب سے پہلے جس شخص نے فائدہ اٹھایا وہ پٹنے کا حاکم محمد علی وردی خاں تھا جسے خود شجاع الدولہ نے ادنیٰ مرتبے سے ترقی دے کر امرائے شاہی میں داخل کرایا تھا۔ شجاع الدولہ کی وفات کے بعد سرفراز خاں مارا گیا اور علی وردی خاں نے پورے صوبے پر قبضہ کر لیا (سنہ ۱۱۵۳ھ ؍ ۱۷۴۰ء)۔

یہ کارروائی حکومت دہلی کی بغیر اجازت و خلاف منشا عین اس وقت عمل میں آئی جب کہ نادر شاہ کے حملے نے مغل تاجدار کو پہلے سے بھی زیادہ کمزور کر دیا تھا، ادھر علی وردی خاں نے خراج کے نام سے تحفے تحائف اور

[1] ریاض السلاطین صفحہ ۲۰۵۔

باب

کچھ روپیہ بھیجکر اطاعت و باج گزاری کا اقرار کیا، اور آئندہ بھی اس رسم کو نباہتا رہا، پس حکومت دہلی نے طوعاً و کرہاً اس کو بنگالے کا صوبہ دار تسلیم کر لیا لیکن نہ تو علی وردی خاں کی یہ اطاعت سچی تھی اور نہ بادشاہ دہلی اسے کافی سمجھتا تھا۔ چنانچہ بیس برس کے بعد شہزادۂ عالی گہر (شاہ عالم ثانی) کے ادھر آنے کی اصلی وجہ یہی تھی کہ وہ بنگالے میں مغلوں کے قدیمی حقوق بادشاہی کو از سر نو قائم کرنا چاہتا تھا اور علی وردی خاں کے جانشینوں کو بنگالے کا حاکم جائز تسلیم نہیں کرتا تھا۔

شہزادۂ موصوف کی جد و جہد کا اجمالی حال ہم آیندہ پڑھیں گے یہاں خاص طور پر جتانے کے لائق یہ امر ہے کہ علی وردی خاں کی مذکورۂ بالا بغاوت و کامیابی نے بنگالے کے مقامی امرا اور عہدہ داروں میں سخت انتشار و ناراضی پیدا کر دی اور مقتول صوبہ دار (یعنی سرفراز خاں) کے ہواخواہوں سے جب خود مقابلہ نہ ہو سکا تو انھوں نے مرہٹوں کو مدد کے واسطے بلایا، اور ایک دو مرتبہ ناکامی کے بعد آخر میں مرہٹوں کی سالانہ یورش نے علی وردی خاں کو ایسا عاجز کیا کہ اسے خاص بنگالہ بچانے کی خاطر اڑیسہ کا صوبہ مرہٹوں کے حوالے کرنا پڑا اور بہت دن تک یہ علاقہ برار کے بھونسلہ حاکموں کے زیر نگین رہا، لیکن ان کی اس "حکومت" کی صورت صرف یہ تھی کہ چھٹے چھ ماہے مرہٹہ سوار اس طرف کا گشت لگاتے اور جس قدر ممکن ہوتا روپیہ جبراً رعایا سے وصول کر کے واپس چلے جاتے تھے[۱]۔

علی وردی خاں کی وفات کے بعد اس کا نواسہ نواب سراج الدولہ اس کا جانشین ہوا (۱۱۶۹ھ ۱۷۵۶ء) لیکن اس کی حکومت کے پہلے ہی سال میں خانہ جنگیوں کے علاوہ انگریزوں سے جنگ چھڑ گئی جس نے انجام کار ان مغربی تاجروں کو ملک بنگالہ کا مالک بنا دیا۔

(۲) اودھ

شمالی ہند کی ایک اور بڑی اور نیم آزاد ریاست خاص دوآب کے

---

[۱] گزیٹیر جلد ہشتم صفحہ ۳۱۴۔

باب ۶

علاقے میں قائم ہوئی جسے سہولت کے لئے "حکومت اودھ" کہتے ہیں' اس میں روہیلکھنڈ سے حدود بہار تک کے اقطاع داخل تھے اور ایک زمانے میں روہیلکھنڈ بھی فتح ہو کر شامل ہو گیا تھا اس ریاست کا بانی ایک ایرانی سوداگر برہان الملک سعادت خاں تھا جس نے اپنی بے پایاں قابلیت سے محمد شاہ کے عہد میں بڑی ناموری پائی اور الہ آباد و اودھ کا صوبہ دار مقرر ہوا' لیکن اودھ کی جنگی قوت کو بڑھانے والا اس کا جانشین اور بھتیجا صفدر جنگ تھا جو آصف جاہ اول کے بعد سلطنت دہلی کا وزیر ہوا اور عرصے تک وہاں کی درباری سازشوں میں الجھا رہا۔ اس کی وفات اور اس کے بیٹے شجاع الدولہ کی جانشینی (۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۴ء) کا ذکر ہم پہلے پڑھ چکے ہیں' پانی پت کی تیسری جنگ کے وقت شجاع الدولہ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ تھا لیکن آخر وقت تک مرہٹوں سے ساز باز کرتا رہا اور اس کی فوج نے لڑائی میں بھی کوئی قابل لحاظ حصہ نہیں لیا اسی طرح اگرچہ شہزادۂ عالی گہر (بادشاہ عالم ثانی) کو بنگالے پر حملہ کرنے کی تحریک میں وہ پیش پیش تھا لیکن درحقیقت اس حملے کا خاص محرک شجاع الدولہ کا چچیرا بھائی محمد قلی خاں ناظم الہ آباد ہوا اور شجاع الدولہ نے اسے شہ دی تا کہ وہ اور شاہزادۂ عالی گہر اس کی حدود سے باہر چلے جائیں' اور بنگالے کی لڑائیوں میں الجھے رہیں اور خود شجاع الدولہ کو ان کی کسی سازش و رقابت کا خوف نہ رہے[1] پھر تین چار سال کے بعد میر محمد قاسم والی بنگالہ نے بہار سے بھاگ کر اس سے مدد مانگی' اور شجاع الدولہ نے شاہ عالم کے ساتھ ملکر دوبارہ بہار پر فوج کشی کی لیکن معاہدۂ اتحاد و دوستی کے باوجود شجاع الدولہ نے اپنے مہمان (میر قاسم) سے دغا کی اور اس کی فوج کے فتنہ پرداز فرانسیسی سردار سمرو یا شمرو کو ملا کر اپنا رفیق بنا لیا اور اس بے بسی میں

---

[1] سیر المتاخرین جلد دوم صفحہ ۶ وغیرہ یہ حالات اور آیندہ میر قاسم والیِ بنگالہ کے ساتھ شجاع الدولہ کی دغا بازی کا ذکر سیر المتاخرین کی دوسری جلد میں بہت تفصیل سے مرقوم ہے اور اس کتاب کا مولف ان واقعات کے وقت موجود اور اکثر معاملات میں خود شریک تھا۔

میر قاسم کو ایک عرصے تک نظر بند رکھا، اس دغا بازی سے شاید وہ بہار کے بعض اضلاع پر خود قبضہ کرنا چاہتا تھا لیکن اول تو انگریزوں نے اسے بکسر پر شکست دی (۱۱۷۸ھ ۱۷۶۴ء) دوسرے خود شاہ عالم اس کا ساتھ چھوڑ کر انگریزوں کے لشکر میں چلا آیا جنھوں نے اب خاص شجاع الدولہ کے ملک پر پیش قدمی کی اور والی بنگالہ سے فریب و حسد کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود اسے بہت سا روپیہ انگریزوں کو دینا پڑا اور اضلاع کانپور و الہ آباد و فتحپور شاہ عالم کے حوالے کرنے پڑے۔

انگریزوں کا اثر

چند سال بعد جب شاہ عالم انگریزوں سے ناخوش ہو کر دہلی گیا تو الہ آباد کو پھر شجاع الدولہ کے سپرد کر گیا تھا، لیکن اب بادشاہ کے مرہٹہ رفیقوں کا زور ہوا اور انھوں نے شاہ عالم سے الہ آباد کی سند حاصل کر لی، اسی سلسلے میں انھوں نے روہیلکھنڈ پر حملہ کیا اور شجاع الدولہ کو اپنا ملک بچانے کی خاطر انگریزوں سے امداد لینی پڑی، اس فوجی امداد کے عوض میں اس نے انگریزوں کو پچیس لاکھ روپیہ سالانہ دینے کا اقرار کیا اور اودھ کے صدر مقام فیض آباد میں مستقل طور پر انگریزی سفارت قائم ہو گئی جسے آیندہ انگریزی سیادت و حکومت کی تمہید سمجھنا چاہیے (۱۱۸۷ھ ۱۷۷۳ء) لیکن اس وقت البتہ شجاع الدولہ کو اس اتحاد سے یہ نفع پہنچا کہ اس نے انگریزوں کی مدد سے روہیلکھنڈ پر فوج کشی کی اور سوائے ریاست رامپور کے یہ تمام علاقہ فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

سال آیندہ شجاع الدولہ نے وفات پائی (۱۱۸۸ھ ۱۷۷۴ء) اور اس کے جانشینوں کے زمانے میں انگریزوں کا اثر آہستہ آہستہ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ خود سعادت علی خاں کو جو شجاع الدولہ کے بعد سب سے لائق اور باخبر نواب اودھ مانا جاتا ہے، قریب قریب آدھا ملک انگریزوں کے حوالے کرنا پڑا (۱۲۱۵ھ ۱۸۰۰ء) اور کہنا چاہیے کہ اس وقت سے اودھ انگریزی حکومت کے بالکل تحت میں آ گیا[1]۔

[1] آکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۵۹۰۔ گورنر جنرل ولزلی کی ایسی کھلی ہوئی زیادتی اور عہد شکنی تھی جس کا قریب قریب تمام انگریز مورخوں کو اعتراف کرنا پڑا۔

باب ۶

اودھ کی بعد کی تاریخ اہم سیاسی واقعات سے خالی ہے اور اس ملک پر براہ راست انگریزی قبضہ ہونے تک یہاں کے باقی نوابوں یا بادشاہوں کے حالات میں صرف ان کی عیاشی کے عبرت ناک قصے محفوظ رہ گئے ہیں ان رنگ رلیوں کا مرکز لکھنؤ میں تھا جسے آصف الدولہ نے فیض آباد کی بجائے اپنا پائے تخت بنا کے بڑی ترقی دی، ایک اور قابل الذکر بات یہ ہے کہ سعادت علی خاں کے زمانے تک اودھ کے فرمانروا سلطنت دہلی کے قدیم خطاب "نواب وزیر" سے مخاطب کئے جاتے تھے۔ لیکن سعادت علیخاں کے جانشین غازی الدین حیدر نے ۱۸۱۹ء میں انگریزوں کے مشورے سے "شاہ اودھ" کا لقب اختیار کیا اور اپنے نام کا علیحدہ سکہ جاری کیا اور یہ وہ جسارت تھی جس کا ٹیپو سلطان کے سوا ہندوستان کے کسی رئیس و راجہ نے اقدام نہ کیا تھا کیونکہ وہ اپنی خود مختاری کے اعلان کو اب تک نام نہاد سلاطین مغلیہ کے لحاظ و ادب کے خلاف جانتے تھے۔

(۳) پنجاب

یوں تو پائے تخت کے قریب ہی روہیلے اور جاٹ حکومت دہلی کے خلاف شورش و بغاوت کرتے رہتے تھے اور فرخ آباد، پیلی بھیت، رامپور، بھرتپور وغیرہ مقامات میں ان کی کئی آزاد ریاستیں قائم ہو گئی تھیں لیکن اس کتاب میں ہم صرف سکھوں کی آزاد ریاست کا ذکر کریں گے جو سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد پنجاب میں قائم ہوئی۔ قوم و نسل کے اعتبار سے یہ سکھ بھی اکثر جاٹ تھے مگر ایک خاص مذہبی فرقہ بن جانے کی وجہ سے انھیں اپنے دوسرے ہمقوموں اور عام ہندوؤں سے امتیاز حاصل ہو گیا اور بعد کے سیاسی اقتدار نے اس امتیاز کو اور بھی نمایاں کر دیا۔

مذہبی طور پر سکھ مت کے لوگ اول اول مسلمان صوفیوں کا ایک فرقہ سمجھے جاتے تھے اور بانی مذہب گرونانک صاحب نے اپنی تعلیم میں وحدت وجود اور انسانی مساوات پر ہی سب سے زیادہ زور دیا ہے لیکن بعد میں جب ان کے دینی پیشواؤں نے ان کو علیحدہ سیاسی یا فوجی گروہ بنانا چاہا تو لازمی طور پر ان کے عقائد و شعائر میں بھی ہندو مسلمانوں کے مذہب سے

باب ۵

اختلافات پیدا ہوئے اور دسویں گرو گوبند سنگھ نے ان اختلافات کو اور زیادہ واضح کر دیا حتیٰ کہ خود سکھ مت کے مقتدا اس تجدید و اصلاح سے ناراض ہو گئے اور گرو گوبند سنگھ کو بہ مشکل ان پر غلبہ حاصل ہوا۔

انگریزی تاریخوں میں اس بات کو بہت شدو مد سے بیان کیا ہے کہ گرو گوبند سنگھ کی مذہبی اصلاح کا سب سے بڑا مقصود یہ تھا کہ سکھوں کو مسلمانوں (اور نیز برہمنوں) کا سخت دشمن بنا دیا جائے[۱] لیکن جب ہم پڑھتے ہیں کہ خود یہ گرو شاہ عالم بہادر شاہ کی فوج میں بھرتی ہو کر مسلمانوں کی طرف سے لڑنے دکن آئے تو مذکورۂ بالا اقوال کی وقعت باقی نہیں رہتی البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سکھوں نے جب کبھی ست نامیوں[۲] کی طرح مشرقی پنجاب کے کوہستانی اضلاع میں سر اٹھایا، تو ان کی سختی سے تنبیہ و تادیب کی گئی اور اس سلسلے میں شاہی افواج کے ساتھ ان کی کئی خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ آخر گرو گوبند سنگھ کا جانشین بندہ فرخ سیر کے عہد میں محصور ہو کر گرفتار ہوا اور دہلی میں سخت عقوبتوں کے ساتھ قتل کرا دیا گیا (۱۱۲۹ھ ۱۷۱۶ء) تو اس وقت یہ شورش بھی فرو ہو گئی۔

سکھوں کی "بارہ مسلیں"

لیکن جس وقت احمد شاہ ابدالی کے حملوں اور اندرونی جھگڑوں نے دربار دہلی کی فوجی قوت کو کمزور کر دیا تو سکھوں کو دوبارہ سر اٹھانے کا موقع ملا اور ان کے سر برآوردہ زمینداروں نے جا بجا اسی بارھویں صدی ہجری کے وسط میں وہ "مسلیں" یعنی جتھے بنانے شروع کئے جو بعد میں خاصی قوی ریاستیں

---

[۱] مثلاً دیکھو لیپل گریفن کی کتاب "رنجیت سنگھ" نیز آکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۴۵۴ وغیرہ۔

[۲] یہ ایک محدود مذہبی فرقہ تھا جس میں بالعموم ہندو پیشہ ور داخل ہو گئے تھے اور ان کی سب سے بڑی تعداد نارنول (ریاست پٹیالہ) کی نواح میں آباد تھی۔ یہیں کسی ستنامی سے کوتوالی کے کسی جوان کا جھگڑا ہوا اور اس نے بڑھتے بڑھتے بلوے بلکہ بغاوت کی صورت اختیار کر لی۔ حتیٰ کہ شورش فرو کرنے کے لیے شاہی فوجوں کو بھیجنا پڑا اور خاصی باقاعدہ جنگ کے بعد یہ فساد رفع ہوا۔ یہ عہد عالمگیر کا واقعہ ہے اور اپنی پہلی تاریخ (برائے میٹرک) میں ہم اس کا ذکر کر چکے ہیں۔

باب ۴

بن گئیں ان مسلوں کی ابتدائی حیثیت قزاقانہ گروہوں کی سی تھی اور ان کے سرکا گرد و نواح کا علاقہ لوٹتے پھرتے تھے، ان کا اس زمانے میں زیادہ زور سرہند و لاہور کی نواح میں تھا اور انھی شہروں کو لوٹنے کی سزا میں ایک مرتبہ احمد شاہ ابدالی نے خاص سکھوں پر فوج کشی کی (۱۱۷۵ھ = ۱۷۶۲ء) اور ستلج کے پار (برنالے کے قریب) انھیں سخت شکست دی اور بہت سا تاوان جنگ وصول کیا لیکن اس شکست نے سکھوں کو بہت فائدہ پہنچایا، عام قومی مصیبت میں وہ اپنے اندرونی جھگڑے بھول گئے اور دوبارہ انھوں نے مل کر سرہند پر چڑھائی کی اور شہر کو فتح کر لیا۔ احمد شاہ ابدالی سال آیندہ بھی پنجاب آیا تھا لیکن سرہند کی طرف بڑھنے کی فرصت نہ ملی اور اس نے خود ہی سکھ سردار آلا سنگھ کو سالانہ پیش کش کے وعدے پر ضلع سرہند کی حکومت سونپ دی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب کہ ایک بادشاہ کی جانب سے سکھوں کو ایک محدود ضلع کا حاکم تسلیم کیا گیا اور اس کے بعد سے ان کی مسلیں مسلمان حکومتوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر روز افزوں قوت حاصل کرنے لگیں، ان مسلوں کے مفصل حالات اس تاریخ میں لکھنے بے محل ہوں گے، یہاں مختصر طور پر یہ لکھنا کافی ہے کہ ان کی بارہ مسلوں میں سے پانچ سب سے زیادہ طاقتور اور مشہور تھیں ا۔ پھولکیاں، اہلو والیہ، بھنگی، کہنیا، اور رام گڑھیا آخر کی چاروں مسلوں کا علاقہ دریائے ستلج کے شمال میں تھا، اور پھولکیاں کے حصے میں جو سکھ زمیندار شریک تھے ان کی اولاد آج بھی پٹیالہ، جیند وغیرہ این روے ستلج اس پار کی بڑی بڑی ریاستوں کی وارث ہے۔

رنجیت سنگھ

لیکن گو برنالے کی جنگ کے بعد بارھویں صدی ہجری کے اخیر تک ان سکھ مسلوں کی قوت برابر بڑھتی رہی تاہم ان میں باہم کوئی سیاسی اتحاد نہ تھا اور ان کے سردار آئے دن آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، یہی وہ کمی تھی جسے رنجیت سنگھ (ولادت ۱۱۹۴ھ = ۱۷۸۰ء) کی اولو العزمی نے دور کیا اور اس لیے سکھ قوم کی سیاسی قوت کا بانی مبانی اسی کو سمجھنا چاہئے اور اگرچہ یہ قوت کچھ زیادہ دیرپا نہ تھی بلکہ کہنا چاہئے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مرتے ہی اس کا

شیرازہ بکھر گیا تاہم سکھ ریاست کی یہ کمزوری بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ خود رنجیت سنگھ اپنی قوم میں نہایت غیر معمولی قابلیت کا سردار تھا۔

ابتدا میں رنجیت سنگھ اپنے باپ کے بعد سکھوں کی ایک چھوٹی مسل کا حاکم ہوا تھا جو اپنے مرکزی مقام کے نام پر سکر چکیا کہلاتی تھی سکر چک کو رنجیت سنگھ کے بزرگوں نے امرتسر کے ضلع میں آباد کیا تھا لیکن اسی زمانے سے ان کی قزاقانہ یورشوں کا حلقہ دریائے جہلم تک وسیع تھا اور یہی سبب ہوا کہ جب احمد شاہ ابدالی کے پوتے شاہ زماں کی بھاری توپیں پنجاب سے جاتے وقت دریائے جہلم کی ریتی میں دھنس گئیں تو اس نے رنجیت سنگھ سے وعدہ کیا کہ اگر ان کو بہ احتیاط نکلوا کر کابل بھیجدیا گیا تو اسے راجہ کا لقب اور شہر لاہور کی حکومت عطا کر دی جائے گی (۱۲۱۳ھ - ۱۷۹۹ء) رنجیت سنگھ نے اس خدمت کو مستعدی سے انجام دیا اور سال آیندہ راجہ کے شاہی خطاب کے ساتھ لاہور میں داخل ہو کر باضابطہ اس شہر پر قابض ہو گیا۔

واضح رہے کہ لاہور پر کئی سال سے افغانیوں کی حکومت برائے نام باقی رہ گئی تھی ورنہ اس پر بھی سکھ سردار قابض تھے اور اس لیے آیندہ چند سال تک رنجیت سنگھ کی انھی سکھ سرداروں سے لڑائیاں ہوتی رہیں جن کے آخر میں قریب قریب پنجاب خاص کے تمام علاقوں میں اس کی سیادت تسلیم کی جانے لگی اور این روئے ستلج کی سکھ ریاستوں کے معاملات میں بھی وہ مداخلت کرنے لگا' بلکہ کچھ روز کے واسطے انبالے پر قابض ہو گیا لیکن یہ وہ زمانہ ہے جب کہ انگریز دہلی پر مسلط ہو گئے تھے اور ہلکر سے لڑائیوں کے ضمن میں ستلج اس پار کے سکھ سرداروں تک ان کا اثر پہنچ گیا تھا' معلوم ہوتا ہے ان سکھ سرداروں کو اپنے ہمقوم راجہ کا باج گزار بننا گوارا نہ تھا اور اس کی جنگی قوت کا وہ مقابلہ نہ کر سکتے تھے لہذا انھوں نے اپنی حفاظت کے عوض میں انگریزوں کی سیادت قبول کر لی اور انگریزوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے عہد لے لیا کہ وہ ستلج اس پار کے علاقوں سے کوئی سروکار نہ رکھے گا۔ (عہد نامۂ امرتسر ۱۸۰۹ء)

باب ۸
فتوحات ملتان و کشمیر وغیرہ

شمالی ہند کی سب سے بڑی قوت سے مصالحت کرنے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ستلج کے شمال میں مزید فتوحات کی بخوبی فرصت مل گئی، اور اس نے چند ناکام حملوں کے بعد آخر کار شہر ملتان کو فتح کر لیا (۱۸۱۸ء ۱۲۳۳ھ) جہاں کا حاکم مظفر خاں کئی سال تک حیرت انگیز شجاعت و مردانگی سے سکھوں کا مقابلہ کرتا رہا تھا اور آخر میں بھی جب تک وہ زندہ رہا قلعۂ ملتان کو سکھ فتح نہ کر سکے۔ کشمیر کی فتح میں رنجیت سنگھ کو ملتان کی فتح سے بھی زیادہ نقصانات اٹھانے پڑے اور یہاں کے افغانی حاکموں نے کئی بار اسے سخت شکستیں دیں، لیکن ۱۸۱۹ء ۱۲۳۵ھ میں جب کہ کشمیر کا افغان حاکم دربار کابل کے اندرونی جھگڑوں میں حصہ لینے افغانستان چلا گیا تھا سکھوں نے پھر اس ملک پر حملہ کیا اور اس مرتبہ ان کی کوئی خاص مزاحمت نہ ہوئی، اور یہ خوبصورت صوبہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت میں داخل کر لیا گیا۔

رنجیت سنگھ کے آخری عہد کی لڑائیاں زیادہ تر پشاور و ڈیرہ جات کے علاقے میں ہوتی رہیں اور اگرچہ حکومت کابل کی اندرونی کمزوری اور سرحدی پٹھانوں کی باہمی نااتفاقی سے پشاور پر ۱۸۲۳ء ۱۲۳۹ھ ہی میں سکھوں کا قبضہ ہو گیا تھا لیکن یہ قبضہ جوکھوں سے خالی نہ تھا اور انھیں آئندہ بیس برس تک اس کے واسطے بہت سی مہمیں بھیجنی پڑیں اور بے شمار روپیہ صرف کرنا پڑا اور کبھی حکومت کابل سے اور کبھی یہاں کے باشندوں سے مسلسل لڑائیاں ہوتی رہیں جن میں شاہ سید احمدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے مذہبی جہاد کی روح پھونک دی تھی۔

سکھوں کی سلطنت پنجاب پر انگریزی تسلط کے حالات آئندہ ابواب میں ہماری نظر سے گزریں گے یہاں صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ یہ سلطنت دہلی اور کابل کی حکومتوں کی کمزوری کے زمانے میں رنجیت سنگھ کی ذاتی قابلیت و مستعدی سے قائم ہوئی تھی اور اس کی وفات (۱۸۳۹ء ۱۲۵۵ھ) کے ساتھ ہی اس کا خاتمہ ہو گیا کیونکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بعد سکھوں میں

باب ب

کوئی ایسا لائق اور صاحب تدبیر سردار پیدا نہ ہوا جو اپنی جنگجو قوم کو پوری طرح قابو میں لا کر متحد رکھ سکتا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قیمتی میراث کو اس نئی قوت کے ہاتھ میں پڑنے سے بچا لیتا جو شمالی ہند میں سلاطین مغلیہ کی جانشین ہو گئی تھی۔

باب ۶
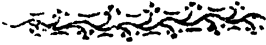
اہل یورپ کی آمد ہند میں

پہلی فصل ۔ مغربی ممالک سے بحری تجارت کا آغاز

ہندوستان کی تاریخ میں دسویں صدی ہجری (سولھویں عیسوی) کو خاص اہمیت حاصل ہے کہ اسی صدی میں مغلوں کی عظیم الشان سلطنت قایم ہوئی اور شیر شاہی انتظامات اور اکبری فتوحات نے مدت دراز کے بعد ممالک ہند کی ایک مرکزی حکومت کے ماتحت شیرازہ بندی کی لیکن تمدن انسانی کی تاریخ میں اس سے بھی بڑھ کر اہم واقعہ یہ ہے کہ اسی صدی میں ہندوستان اور نیز "نئی دنیا" کے ساتھ اہل یورپ کی براہ راست بحری آمد و رفت کا آغاز ہوا اور دسویں صدی ہجری کے ابتدائی سنین سے پرتگال کے جہاز سواحل ہند تک آنے جانے لگے ۔ اس وقت تک دخانی جہاز ایجاد نہیں ہوئے تھے اور اس لیے اہل پرتگال و ہسپانیہ کی جہاز رانی کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ ایک طرف

ا۔ب

کلمبس بحر اوقیانوس کو طے کرکے امریکا پہنچا (۱۴۹۲ء) اور دوسری طرف واسکوڈگاما اپنے تین بادبانی جہازوں کو مغربی افریقہ کے گرد چکر دیکر ہندوستان کی جنوبی بندرگاہ کالی کٹ تک صحیح سلامت لے آیا۔ (۱۴۹۸ء مطابق ۹۰۴ھ)

اگرچہ یورپ سے ہندوستان کی طرف بہت سی قومیں آئیں اور بالآخر انگریز یہاں قابض ہوگئے لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ سب سے پہلے پرتگالی ہندوستان کی طرف آئے اور یورپ کی دوسری قوموں نے ان کی پیروی کی اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ پرتگال اور ہسپانوی دونوں ہمسایہ قومیں فن جہازرانی میں سب سے پیش پیش تھیں۔ برخلاف ان کے دوسری قومیں اس فن میں ان کی خوشہ چیں ہیں نیز ان سلطنتوں کے حکمراں بھی جو پندرھویں صدی کے آخری حصے میں حکومت کرتے تھے بڑے حوصلہ مند ثابت ہوئے انھوں نے اپنے اہل قوم کی جو آگے بڑھنا چاہتے تھے خوب حوصلہ افزائی کی۔ اس کے علاوہ اس زمانے کی مذہبی کشمکش بھی اسپین اور پرتگال کی ترقی کا باعث ہوئی ہے۔ بات یہ تھی کہ پندرھویں صدی میں لوتھر کی تبلیغ سے یورپ میں ایک جدید پروٹسٹنٹ مذہب پیدا ہوگیا تھا جس کے پرانے مذہب والے جو اپنے آپ کو رومن کیتھلک کہنے لگے مخالف ہوگئے یورپ ان کا پیشوا تھا۔ وہ رومن کیتھلک افراد اور سلطنتوں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ چنانچہ ۱۴۹۳ء کا یہ بڑا دلچسپ واقعہ ہے کہ پوپ الگزنڈر ششم نے کرۂ ارض پر ایک لکیر کھینچکر دنیا کے دو حصے کردئے مغربی حصہ اسپین کو اور مشرقی حصہ پرتگال کو دے دیا تاکہ وہ غیر معلوم اقطاع کو منکشف کرکے قبضہ کریں اور پروٹسٹنٹ قوموں کو آنے نہ دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین کی جدوجہد مغرب کی طرف منعطف ہوگئی اور پرتگالی مشرق کی طرف آنے لگے چونکہ اس زمانے میں پروٹسٹنٹ قومیں ولندیزی اور انگریز اتنے قوی نہیں تھے کہ پوپ کے اس حکم کے علی الرغم آگے بڑھ سکیں۔ اس لیے آیندہ سو سال تک مشرق میں صرف پرتگالیوں کا بول بالا رہا۔ ۱۴۹۸ء سے ۱۶۰۰ء تک کئی پرتگالی جہازراں ہندوستان آئے بعد دیگرے

افریقہ کے مغربی ساحل کے برابر برابر جنوب تک پہنچتے رہے اور ان کا بحری سورما شاہزادہ ہنری ان کی ہر وقت حوصلہ افزائی کرتا تھا اور اس کی وجہ سے اکتشاف اور جہاز رانی کا شوق بڑھتا رہا۔ سنہ ۱۴۸۶ء میں برتھا موڈیس طوفان کے تھپیڑوں سے راس امید تک پہنچ گیا اور اس طریقے سے بحر ہند کا راستہ دریافت ہوگیا۔ چنانچہ اس کی بدولت دوسرے سال پیڈرو بحر ہند کے راستے سے ساحل ملابار پہنچ گیا اور اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ جنوبی مشرقی راستے سے ہندوستان پہنچنا آسان ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما نہایت اطمینان سے راس امید کا چکر کاٹ کر بحر ہند میں داخل ہوگیا اور اس کے بعد ہی کے مہینے میں کالی کٹ کے ساحل میں لنگر انداز ہوگیا۔

سواحل ہند کی بحری تجارت ان دنوں اہل عرب کے ہاتھ میں تھی لیکن پرتگیزوں نے مختلف تدبیروں سے کالی کٹ کے راجہ سے تجارت کی اجازت حاصل کرلی، اس راجہ کو وہ اور دیگر اہل فرنگ "زمورن" اور اہل عرب "سامری" کے لقب سے یاد کرتے تھے مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ پرتگیز جہاز رانوں کی حیثیت تاجرانہ نہ تھی بلکہ ابتدا سے یہ جہاز راں شاہ پرتگال کے بحری عہدہ دار تھے اور اسی لیے واسکوڈ گاما کی بخیریت واپسی پر اس کے وطن میں سرکاری طور پر خوشی منائی گئی اور اسی زمانے سے اہل پرتگال ایشیا میں اپنی سلطنت قائم کرنے کے خواب دیکھنے لگے کہ جس طرح امریکہ کے دریافت شدہ جزائر پر ہسپانیہ کا قبضہ ہوگیا تھا اسی طرح بحر ہند کے جزائر و ممالک میں پرتگال کا تسلط ہو جائے۔ چنانچہ ڈیڑھ دو سال کے بعد ہی ان کی حکومت نے تیرہ جہازوں کا بیڑا ہندوستان کی جانب روانہ کیا جس میں بارہ سو سپاہی سوار تھے۔ یہ بیڑا ہوا کی ناموافقت سے جنوبی امریکا کی جانب بہ گیا اور وہاں سے بہت دن کے بعد کالی کٹ پہنچا مگر پہنچتے ہی اس کے سردار کی زمورن اور عرب سوداگروں سے لڑائی ہوگئی جس میں پرتگیزوں کے صدہا آدمی مارے گئے اور وہ کالی کٹ میں نہ ٹھہر سکے بلکہ ان کو مجبوراً کوچین کے راجہ سے امداد لینی پڑی جو

پرتگیزوں کے سیاسی منصوبے

باب ۶

کالی کٹ کے راجہ کا رقیب تھا۔
اس مہم کی ناکامی کے بعد پھر واسکوڈگاما بیس جہازوں کا بیڑا لے کر ہندوستان آیا اور کوچین و کنانور کے رئیسوں کو ملا کر اس نے کالی کٹ پر باقاعدہ فوج کشی کی لیکن اس میں بھی چنداں کامیابی نہ ہوئی اور پرتگیز اپنے کچھ سپاہی کوچین میں چھوڑ کر واپس چلے گئے، اسی زمانے میں شاہ پرتگال نے اپنے مذہبی پیشوا یا پاپائے روم سے ایک "فرمان" حاصل کیا جس میں اس مسیحی بادشاہ کو جلبش، عرب، ایران، و ہند، "کی تجارت، فتوحات اور جہاز رانی کا" مختار تسلیم کیا گیا اور ۱۵۰۵ء (۹۱۱ھ) میں اس نے ایک شخص المیڈا کو ہندوستان میں اپنا نائب یا "ویسرائے" بھی مقرر کر دیا۔

فتح گوا

اہل پرتگال کی یہ کارروائیاں اگرچہ مضحکہ انگیز معلوم ہوتی ہیں لیکن ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ابتدا ہی سے ممالک ہند میں اپنی حکومت قائم کرنے کی فکر میں تھے اور اسی لیے ان کی عرب تاجروں یا ہندی رئیسوں سے لڑائیاں ایک حد تک سیاسی تھیں جن کے ذکر میں پرتگیزوں نے حسب دستور بہت کچھ مبالغے سے کام لیا ہے، ان کو تفصیل سے بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ کئی سال تک جدوجہد کرنے کے باوجود پرتگیزوں کو ملک گیری کے منصوبوں میں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ ہوسکی اور ان کے مشہور بحری سردار البوکرک کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے مغربی ساحل ہند کے ایک جزیرے گوآ (یا الہاس) کو فتح کر لیا جو ان دنوں سلطنت بیجاپور کے علاقے میں داخل تھا (سنہ ۱۵۱۰ء ۹۱۶ھ) پرتگیزی مصنفوں کا بیان ہے کہ اس فتح سے وہاں کے باشندے بہت خوش ہوئے تھے لیکن فتحمندوں نے جس بے دردی سے وہاں قتل عام اور غارت گری کا حکم دیا اس سے ان مصنفوں کے اقوال کی تکذیب ہوتی ہے۔[1]

[1] یہ حالات کم و بیش تفصیل کے ساتھ ہندوستان کی تمام انگریزی تاریخوں میں درج ہیں لیکن ہمارا سب سے مستند ماخذ امپیریل گزیٹیر ہے (جلد دوم صفحات ۴۴۴ تا ۴۵۰ و جلد دوازدہم صفحات ۲۵۸ وغیرہ) نیز دیکھو آکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۳۲۱ وغیرہ وغیرہ۔

باب

بہرحال گوآ پر اہل پرتگال کا قبضہ ہو گیا اور اس کو انھوں نے اس قدر مستحکم جنگی مقام بنا لیا کہ اپنے ہمسائے اہل ہند (خاص کر مرہٹوں سے) اور نیز ولندیزوں سے بار بار لڑائیاں ہونے پر بھی یہ بندرگاہ اور اس کے مضافات میں کوئی تین ہزار مربع میل کا رقبہ آج تک ان کے زیر نگین ہے۔

ہندوستان میں یہ مقام (گوآ) یورپ والوں کا پہلا مقبوضہ تھا جسے پرتگیزوں کی بحری تجارت اور جنگی قوت کی بدولت نہایت رونق حاصل ہوئی لیکن اس قوم کی سفاکی اور بد اخلاقی ضرب المثل ہے اور لوگوں کو سخت ظلم و جبر سے عیسائی بنانا اس کی سیاسی حکمت عملی میں داخل تھا لہذا ایشیا میں پرتگیزی حکومت کو کبھی قبولیت حاصل نہ ہو سکی اور ہندوستان میں جہاں کہیں مستقل اور بڑی حکومتیں قائم تھیں، وہاں پرتگیزوں کا اتنا زور نہ چل سکا کہ گوآ کی طرح دوسرے مقامات پر بھی متصرف ہو جاتے، گجرات کی بندرگاہ دئیو یا دیپ کو انھوں نے سلطان گجرات سے مصالحانہ طریق پر حاصل کیا تھا (۱۵۳۵ء مطابق ۹۴۲ھ) لیکن تقریباً ایک صدی بعد بنگالے میں جب انھوں نے ہگلی کو قلعہ بند کر کے خود مختار حکومت کی بنیاد ڈالنی چاہی تو شاہجہاں کے حکم سے وہ جبراً وہاں سے نکال دئے گئے اور ان کے جو لوگ بچ کر بھاگ سکے انھوں نے بنگالے کے دشوار گزار ساحلی مقامات میں رہ کر بحری قزاقی کا پیشہ اختیار کر لیا۔

پرتگیزوں کا زوال

ان سب باتوں کے باوجود پرتگیزوں کی آمد و رفت اور جنگی نو آبادیوں سے مجموعی طور پر ہندوستان کی بحری تجارت کو فائدہ پہنچا اور انھی نے یورپ کی دوسری قوموں کو اس ملک کا راستہ دکھایا۔ خود ان کا ملک ۱۵۸۰ء (۹۸۷ھ) میں ہسپانیہ کی سلطنت کا جزو بن گیا تھا اور اس واقعے نے ان کی بحری اور تجارتی ترقی کو اور بھی نقصان پہنچایا کہ یورپ کی وہ قومیں جو ہسپانیہ کی دشمن تھیں اب پرتگیزوں کو بھی ہر جگہ زک پہنچانے لگیں اور وہ اس امداد سے جو پہلے ان کی قومی حکومت دیا کرتی تھی، محروم ہو گئے پھر گو نصف صدی کے بعد حکومت پرتگال ہسپانیہ سے علیحدہ ہو گئی لیکن اس عرصے میں ولندیز اور انگریز تاجر

باب

ایشیائی سمندروں میں پہنچ گئے تھے اور ان قوی رقیبوں کے مقابلے میں پرتگیزوں کی تجارت و قوت کو پہلا سا فروغ پھر حاصل نہ ہو سکا۔ بلکہ گیارھویں صدی ہجری (سترھویں عیسوی) کے وسطی سنین میں لنکا اور ملیبار پر ان کے جس قدر تجارتی مقبوضات تھے قریب قریب سب ولندیزوں نے چھین لیے اور ہندوستان میں ان کی قوم کی آئندہ تاریخ ضعف و زوال و افلاس و مصائب کی عبرتناک داستان ہے کہ خشکی کی طرف سے تو دیسی رئیس ان پر دباؤ ڈالتے تھے اور سمندر میں زیادہ طاقتور مغربی قومیں ان کی جگہ لیتی چلی جاتی تھیں۔"

ولندیزی یا ڈچ

مغربی قوموں میں سے سب سے پہلے ولندیزوں یا ہالینڈ والوں نے پرتگیزوں کا زور توڑا تھا۔ اول اول ان ولندیزوں کی ایشیائی تجارت نے پرتگیزوں ہی کی وساطت سے ترقی پائی۔ اور اینٹ ورپ، امسٹرڈم وغیرہ شہر شمالی یورپ میں ایشیائی اجناس کی بہت بڑی منڈیاں بن گئے جہاں پرتگیزی جہاز ممالک ایشیا کا مال لاتے اور یورپ کی اشیا مشرق کی طرف لے جاتے تھے۔ پھر وہاں کے لوگوں نے خود ان مشرقی ممالک سے تجارت کرنی چاہی اور انگریزوں کی طرح اول اول اس کوشش میں رہے کہ یورپ و ایشیا کے شمال سے مشرق کا بحری راستہ دریافت کریں۔ اس میں ان کو ناکامی ہوئی اور آخر انھوں نے بھی بحر ہند کا وہی (افریقہ کے گرد سے آنے کا) راستہ اختیار کیا جس سے اہل پرتگال ہندوستان پہنچے تھے۔ یورپ کی اس دوسری قوم کا پہلا ناخدا جو افریقہ کے گرد ہو کر واسکو ڈگاما سے ٹھیک ایک صدی کے بعد ایشیائی سمندروں تک پہنچا باوٹ مین تھا، (سنہ ۱۵۹۶ء مطابق سنہ ۱۰۰۵ھ)۔

اس کے بعد ولندیزوں یا ڈچوں کے اور تجارتی جہاز بھی آنے جانے لگے اور ان کی پرتگیزوں سے کشمکش شروع ہو گئی۔ لیکن اس موقع پر ان کی اور اہل پرتگال کی آمد کا یہ فرق پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ولندیزوں کی اصلی غرض ایشیا آنے سے تجارت تھی اور اگرچہ یہ تجارت شروع ہونے کے دو تین سال بعد ہی ان کے سب تاجروں نے مل کر تقریباً ۵½ لاکھ پونڈ کے سرمائے سے

ایک مشترکہ کمپنی (دی یونائیٹڈ ایسٹ انڈیا کمپنی اوف دی نیدرلینڈز) قائم کی تھی جو ان کی ملکی حکومت کی زیر نگرانی تھی تاہم پرتگیزوں کی طرح اس کمپنی کے جہاز یا ملازمین براہ راست حکومت کے ملازم نہ تھے اور نہ پرتگیزوں کی طرح انھیں اول سے ممالک ایشیا کی فتح کا سودا تھا۔ کم سے کم وہ ایسے ملکوں پر ہاتھ ڈالنا نہ چاہتے تھے جہاں اہل ایشیا کی مستقل اور قوی حکومتیں موجود تھیں۔

بہرحال، ان کی آمد و رفت شروع ہونے پر بہت جلد اہل پرتگال سے تجارتی رقابت اور جنگ چھڑ گئی۔ جزیرۂ جاوا کے شہر بٹے دیا کے قبضے کو اہل پرتگال نے چنداں اہمیت نہیں دی لیکن جب ولندیزوں نے ۱۰۵۱ھ (۱۶۴۱ء) میں جزیرۂ ملاکا پر قبضہ کر لیا تو پرتگیزوں کی تجارت کو سخت صدمہ پہنچا اور ولندیزوں نے ان جزائر ملایا (شرقی)[1] کی طرف جہاں سے گرم مصالحے یورپ جاتے تھے، اپنے رقیبوں کا آنا جانا دشوار کر دیا۔ پھر انھوں نے لنکا سے پرتگیزوں کو شکست دے کر نکال دیا اور تین سال کی مسلسل جنگ میں رفتہ رفتہ ساحل ملیبار کے تمام پرتگیزی مقبوضات چھین لیے (۱۶۶۳ء مطابق ۱۰۷۳ھ)

یہی زمانہ ہے جس میں ولندیزوں کی تجارتی کوٹھیاں نہ صرف کورومنڈل اور بنگالے کے سواحل پر قایم ہوئیں بلکہ ڈھاکہ، پٹنہ، آگرہ، اور احمد آباد (گجرات) میں بھی ان کے مستقل کارخانے بن گئے اور یورپ و ایشیا کے مابین تجارت کا سب سے بڑا ذریعہ ان کی کمپنی ہو گئی۔

ولندیزوں کو اس زمانے میں تجارتی دولت اور بحری قوت نے یورپ والوں کا محسود بنا دیا تھا اور یورپ ہی میں انگریز اور فرانسیسی ہمسایوں سے ان کی وہ جنگ چھڑی جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے ۱۶۱۲ء مطابق ۱۱۲۴ھ تک جاری رہی۔ اس کشمکش نے ولندیزوں کی قلیل التعداد

[1] ان جزیروں کو انگریزی میں عام طور پر (Spices Islands) یعنی "مصالحے کے جزیرے" کہا جاتا ہے لیکن اس پورے مجمع الجزائر کا نام "ملایا پروشیا" یا جزائر ملایا ہے اور مذکورۂ بالا جزیرے اس کا مشرقی حصہ ہیں۔ لہذا ہم نے انھیں جزائر ملایا شرقی موسوم کیا۔

باب

قوم کو بہت مضمحل کر دیا اور جنگ کے آخری زمانے میں وہ اس بات پر مجبور ہوئے کہ فرانسیسیوں کے مقابلے میں انگریزوں کے حلیف ہو جائیں۔ اس اتحاد کا نتیجہ بھی یہ ہوا کہ انھیں ایشیا کی تجارت میں انگریزوں کو حصہ دار بنانا پڑا اور گو ان کی بحری قوت نے فرانسیسیوں کی ہندوستانی تجارت کو کافی نقصان پہنچایا، لیکن وہ خود بھی یہاں زیادہ فروغ و سرسبزی نہ حاصل کر سکے اور بارھویں صدی ہجری کے وسط میں ان کی تجارت و فتوحات کا مرکز جزائر شرق الہند کی طرف ہٹ گیا، جہاں اب تک کئی وسیع و زرخیز جزیروں پر ان کا قبضہ ہے۔

دیگر فرنگی اقوام کی تجارت۔

ہندوستان میں ولندیزوں پر انگریزوں کے غلبہ پانے کا حال اگلی فصل میں ہماری نظر سے گزرے گا۔ اس جگہ مختصر طور پر یورپ کی دوسری اقوام کا حال بیان کرنا مقصود ہے جنھوں نے پرتگال اور ہالینڈ والوں کی دیکھا دیکھی ممالک ایشیا سے تجارت کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان میں اہل ڈنمارک کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاوہ، جن کی گیارھویں صدی ہجری میں سیرامپور (بنگال) میں بہت بڑی تجارتی کوٹھی قائم تھی، جرمن اور آسٹریا والوں کا ذکر بھی ضروری ہے جو ایشیا سے تجارت کے بہانے اپنی بحری قوت کو بڑھانا چاہتے تھے۔ وسطی یورپ کے یہ ممالک ان دنوں سیاسی طور پر آسٹریا کے بادشاہ کے ماتحت تھے اور وہ "شہنشاہ جرمانیہ" یا قیصر کہلاتا تھا۔ اور ہر چند اس زمانے میں بحری تجارت اور جنگی جہازوں کو یہ اہمیت حاصل نہ ہوئی تھی جو آج کل حاصل ہے، پھر بھی دسویں صدی ہجری میں جہاز رانی کے فروغ اور ہسپانیہ و پرتگال کے امریکہ اور ایشیا میں ملکی مقبوضات کا حال سن کر یورپ کی باقی تمام حکومتوں کو رشک آتا تھا۔ اور وسطی یورپ کے بعض مدبرین اس خیال سے بھی خالی نہ تھے کہ محل وقوع کی وجہ سے بحری تجارت میں انھیں جو دشواریاں ہیں، ممکن ہو تو انھیں اپنی بحری قوت بڑھا کے دور کیا جائے۔ اسی قسم کی مصلحتیں تھیں کہ چند سال کے تامل و تذبذب کے بعد جرمن شہنشاہ شہر اوسٹینڈ کے سوداگروں کا سرپرست بن گیا جنھوں نے بارھویں صدی ہجری

باب

(اٹھارھویں عیسوی) کے اوائل میں ہندوستان سے تجارت شروع کی تھی' ملک بلجیم کی یہ بندرگاہ (اوس ٹینڈ) ان دنوں جرمن شہنشاہ کے زیر سیادت تھی اور یہاں اس کی بحری تجارت کو ترقی دینے سے اس کا منشا یہ تھا کہ رفتہ رفتہ اس مقام کو سلطنت جرمانیہ کی بحری قوت کا ایسا مرکز بنا دے کہ ہالینڈ اور انگلستان پر اس کا دباؤ رہے' تجارت میں بھی اول اول "اوس ٹینڈ کمپنی" کو بہت نفع ہوا اور شہنشاہ سے باضابطہ سند تجارت ملنے کے چھٹے سال ۱۷۲۹ء م ۱۱۳۹ھ) اس کے حصہ داروں میں ۳۳ فیصدی سے بھی زیادہ سالانہ منافع تقسیم کیا گیا: اس کمپنی نے کورومنڈل اور بنگالے میں ہگلی کے کنارے انگریزوں اور ولندیزوں کی تجارتی کوٹھیوں کے قریب اپنے کارخانے کھولے تھے اور انہی قوموں نے اس کے قیام کی سخت مخالفت کی' آخر شہنشاہ بعض مقامی فوائد کے عوض میں اس کمپنی کی سرپرستی سے دست بردار ہو گیا اور ادھر ولندیز اور انگریز تاجروں نے ہگلی کے فوجدار (یا صاحب ضلع) کو مختلف حیلوں سے جرمن تاجروں کا دشمن بنا دیا اور اس نے تھوڑی سی فوجی جمعیت بھیج کر انہیں جبراً اپنے علاقے سے خارج کر دیا اور ان کی تجارتی کوٹھی جس کے گرد انھوں نے خندق اور جنگی برج تیار کئے تھے' چھین کر منہدم کرا دی[۱] (۱۷۳۱ء مطابق ۱۱۴۵ھ)

اسی سال سویڈن میں ایک تجارتی کمپنی بنی اور اوس ٹینڈ کمپنی کے بعض شرکا بھی اس میں حصہ دار ہو گئے۔ یہ کمپنی زیادہ تر چین و جاپان سے تجارت کرنی چاہتی تھی لیکن جرمن تاجروں کی شرکت کی وجہ سے رقیبوں نے یہ غل مچایا کہ یہ محض اوس ٹینڈ کمپنی کو ایک دوسرے نام سے جاری رکھنے کی کوشش ہے اور آخر تھوڑے ہی دن بعد اس کمپنی کا کاروبار بند کر دیا گیا۔

آخر میں پروشیہ کے مشہور بادشاہ فریڈرک (دی گریٹ) نے اپنی رعایا کو ممالک ایشیا سے تجارت کرنے کی ترغیب دی اور خود بھی "بنگال کمپنی"

---

[۱] ریاض السلاطین میں فرنگی تاجروں کی باہمی رقابت اور اس جھگڑے کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں (صفحہ ۲۷۰) نیز دیکھو گزیٹیر جلد دوم صفحہ ۴۶۵۔

کے نام سے تاجروں کی ایک جماعت مرتب کی (۱۰۵۳ھ مطابق ۱۶۲۶ء) لیکن اول تو اس کو ابتدا میں خسارا رہا دوسرے کچھ حکومت بنگالہ کی مخالفت اور کچھ دوسرے فرنگیوں کی رقابت سے اہل پروشیہ کو ہندوستان کے اس صوبے میں قدم جمانے کا موقع نہ مل سکا اور چند روز چوری چھپے تجارت جاری رکھنے کے بعد ان کی یہ کمپنی ٹوٹ گئی۔

دوسری فصل: انگریزی کمپنی کے ابتدائی حالات

انگریزوں کی ابتدائی کوششیں

انگریز ملاحوں کو دسویں صدی ہجری کے بالکل شروع میں ہندوستان پہنچنے کا شوق دامنگیر ہو گیا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ فن جہاز رانی میں وہ پرتگیزوں کے محض مقلد نہیں بلکہ ابتدا سے ہمسری کے دعویدار تھے۔ اور گو نئے ممالک تک جہاز لیجانے میں سب سے بڑی کامیابیاں پرتگال اور ہسپانیہ کو نصیب ہوئیں لیکن انگریز بھی برابر اس دھن میں لگے رہے اور شمال مغربی راستے سے ایشیا پہنچنے کی کوشش میں جزیرۂ نیو فونڈلینڈ سب سے پہلے انہی کے ملاحوں نے دریافت کیا۔ پھر دسویں صدی ہجری (سولھویں عیسوی) کے وسط میں ان کے ایک بحری سردار نے یورپ و ایشیا کے شمال (یعنی بحر منجمد شمالی) کے راستے ممالک ایشیا تک پہنچنے کی کوشش کی اور خود اس سردار کے ہلاک ہونے کے باوجود اس کے بعض رفیق شمالی روس کے ساحل (بحر سفید) تک پہنچ گئے۔ یہاں سے وہ شاہ روس کے پایۂ تخت ماسکو آئے اور ممالک روس کے راستے ایران و بخارا سے تجارت کرنے کی اجازت حاصل کی۔ اسی طرح اور کئی مرتبہ انگریز جہاز راں انہی شمالی راستوں سے ایشیا پہنچنے کی کوشش کرتے رہے لیکن اس میں انہیں کامیابی نہ ہوئی اور انگلستان کے

باب ٦

جو چار سوداگر سب سے پہلے ہندوستان آئے وہ بھی بڑی راستوں سے یہاں تک پہنچے تھے (۸۳-۱۵۸۳ء مطابق ۹۹۳ و ۹۹۱ھ) گو آگے پرتگیزوں نے انھیں پکڑ کر قید میں ڈال دیا لیکن آخرکار انھیں رہائی مل گئی اور ایک شخص بہت سی مشکلات برداشت کرنے کے بعد واپس اپنے وطن پہنچ گیا۔

بحری تجارت کا آغاز

لیکن انگریزوں کی ہندوستان سے تجارت کا اصلی آغاز اس وقت ہوا جبکہ ہسپانیہ اور پرتگال کی بحری قوت کمزور ہو گئی اور ہسپانیہ کے زبردست بیڑے (آرمیڈا) کی تباہی کے بعد انگریز سوداگروں نے ملکہ الزبتھ سے درخواست کی کہ ہمیں بھی ممالک ایشیا سے بحری تجارت کرنے کی اجازت دی جائے (۱۵۹۱ء مطابق ۹۹۹ھ) یہ درخواست منظور ہوئی اور ان سوداگروں نے تین تجارتی جہاز ہندوستان روانہ کئے جن میں سے ایک راستے میں ڈوب گیا دو جنوبی ہند تک آئے اور یہی انگریزوں کے پہلے جہاز تھے جو آفریقہ کے گرد پرتگیزوں کے دریافت کردہ راستے سے ایشیا پہنچے۔

آئندہ چند سال کی کوشش میں انگریزوں کو ہندوستان کی بحری تجارت میں چنداں نفع نہیں ہوا بایں ہمہ ان کے شوق میں اضافہ ہوتا رہا اور آخر میں لندن کے کئی دولتمند سوداگروں نے تقریباً ۷ لاکھ روپے کے سرمائے سے ایک کمپنی مرتب کی اور سولھویں صدی عیسوی کے آخری دن ملکۂ الزبتھ نے بھی شاہی فرمان کی رو سے ان کو ایشیا سے تجارت کی اجازت دے دی (۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء مطابق رجب ۱۰۰۹ھ) لیکن اول اول یہ کمپنی زیادہ تر جزائر شرق الہند سے بیوپار کرتی رہی اور جب اس کے جہازیوں نے پرتگال والوں کی دیکھا دیکھی دیسی سوداگروں کے جہاز لوٹنے شروع کئے تو ان جزیروں میں اس کی ساکھ بگڑ گئی اور تجارت میں نقصان ہوا[۱]۔

پرتگیزوں اور ولندیزوں کی رقابت

اس عرصے میں پرتگیزوں سے انگریزی کمپنی کی لڑائی شروع ہو گئی۔ انگریزوں نے ان تجارتی رقیبوں کے خلاف ایرانیوں کو ملا لیا اور پرتگیزوں کی مقبوضہ بندرگاہ

---

[۱] گزرے نیز جلد دوم صفحہ ۴۵۵۔

باب

ہرمز (اُرمز) سے انھیں خارج کر دیا (۱۶۲۲ء مطابق ۱۰۳۱ھ) لیکن سواحل ہند
پر اہل پرتگال نے بہت دن تک انگریزوں کے قدم نہ جمنے دیے اور درحقیقت
یہ حکومت پرتگال کی اندرونی کمزوری کا نتیجہ تھا کہ وہ کرومول کے زمانے میں
انگریزوں کی تجارت کا حق تسلیم کرنے پر آمادہ ہوگئی (۱۶۵۴ء مطابق ۱۰۶۵ھ)
دراصل انگریزوں نے جب ایشیائی سمندروں میں اپنے جہاز ڈالے
اس وقت پرتگال کی بحری قوت میں زوال آرہا تھا اور ہالینڈ والوں نے
انھیں شکستیں دے کر اکثر ایشیائی مقامات سے نکال دیا تھا۔ لہذا انگریزوں
کو پرتگیزوں سے لڑ بھڑ کر اپنے واسطے جگہ نکال لینے میں اتنی دشواری نہ ہوئی
جتنی کہ ولندیزوں اور بعد میں فرانسیسیوں کی مخاصمت کی بدولت پیش آئی۔
ہالینڈ کی بحری قوت کا ان دنوں عروج تھا اور (۱۶۰۹ء مطابق ۱۰۱۸ھ)
میں ہسپانیہ سے صلح ہونے کے بعد اسے اپنے دوسرے تجارتی رقیبوں سے
لڑنے کی فرصت بھی مل گئی تھی۔ انگریزوں کے ساتھ ولندیزوں کے دوستانہ
تعلقات تھے کیونکہ یہ دونوں قومیں اسی زمانے میں رومن کیتھولک مذہب
چھوڑ کر پاپائے رومہ کی حکومت سے آزاد ہوگئی تھیں، لیکن تجارتی اغراض نے
بہت جلد ان کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا اور سرکاری طور پر
اعلان جنگ نہ ہونے کی حالت میں بھی ان کے تاجروں کے جہاز ایک
دوسرے پر حملہ کرنے لگے۔ ولندیزوں کی ابتدا میں کوشش یہ رہی کہ انگریز جزائر
شرق الہند میں قدم جمانے نہ پائیں۔ چنانچہ ان کی جو تجارتی کوٹھیاں ان جزیروں
میں قائم تھیں ان پر بارہا ولندیزی تاجروں نے حملے کئے اور جابجا انگریزوں
کو نقصان پہنچایا۔ (۱۶۱۹ء مطابق ۱۰۲۸ھ) میں دونوں قوموں کے تاجروں کی
یورپ میں مصالحت بھی ہوگئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے شریک رہ کر
تجارت کریں لیکن اس عہد و پیمان کا ایشیا میں کوئی فائدہ ظاہر نہ ہوا اور
تھوڑے ہی دن بعد مذکورہ جزائر کے دو مشہور انگریزی کارخانوں پر ولندیز
جبراً قابض ہوگئے۔

واقعہ امبوئے نا کا قتل

ولندیزوں کی اس دشمنی کا سب سے مشہور واقعہ "امبوئے نا" کا قتل تھا

باب ۶

یہ مقام جزائر ملایا میں واقع ہے اور یہاں ولندیزوں نے چند انگریز جہازیوں کو گرفتار کرکے ان پر سازش بغاوت کا الزام لگایا اور معمولی تحقیقات کے بعد سزائے قتل کا فیصلہ صادر کیا۔ تو انگریزوں کے ساتھ چند جاپانی اور ایک پرتگیز ملاح بھی شریک جرم قرار دیے گئے تھے۔ مشہور ہے کہ ولندیزوں نے ان سب کو خوفناک اذیتیں دیں اور آخر میں قتل کرا دیا (۱۶۲۳ء مطابق ۱۰۳۲ھ) انگلستان میں اس واقعے کی اطلاع نے سخت غم و غصہ پیدا کر دیا تھا لیکن سالہا سال تک صرف خط و کتابت ہوتی رہی آخر کرومول کے زمانے میں ہالینڈ کی حکومت نے ان مقتولوں کا خون بہا دلوانا قبول کیا۔

دربار مغلیہ میں سفارتیں

غرض بیس بائیس برس کی جد و جہد کے باوجود جزائر شرق الہند و ملایا میں تو انگریزی تجارت کوئی فروغ نہ پا سکی البتہ اس اثنا میں کپتان ہاکنس اور سر تامس رو کی سعی و سفارت سے انگریزوں کو سلطنت مغلیہ کے علاقوں میں تجارت کرنے کی اجازت مل گئی یا کم سے کم انھیں یہاں کے حکام سے روشناسی حاصل ہوئی اور سورت میں ان کی تجارتی کوٹھی بھی قائم ہو گئی ہاکنس جیمس اول شاہ انگلستان کا خط اور بہت سے تحائف لے کر عہد جہانگیری کے آغاز میں آگرے پہنچا تھا (۱۶۰۹ء، ۱۰۱۸ھ) اور دو تین سال تک حاضر دربار رہا اس کا بیان ہے کہ بادشاہ اس کے ساتھ بہت عنایت سے پیش آیا اور ترکی زبان میں بغیر ترجمان کے گفتگو کی۔ نیز خلوت کے جلسوں میں بھی اسے باریابی کا شرف بخشا اور چار صدی منصب عطا فرمایا[1]۔ اسی طرح تامس رو جو تین سال بعد آیا بیان کرتا ہے کہ دربار مغلیہ میں اس کا بہت اعزاز و اکرام ہوا اور جہاں پناہ اسے اپنی بے تکلفی اور خلوت کے جلسوں میں شریک کرتے تھے لیکن درایتاً ان انگریز سفیروں کے اقوال کی صحت میں شبہہ ہے اس بات کا تو وہ خود اقرار کرتے ہیں کہ جن تجارتی اغراض کے لیے وہ دربار میں آئے تھے ان میں چنداں کامیابی نہیں ہوئی ہاکنس کو اگر واقعی منصب

---

[1] اوکس ہس صفحہ ۳۷۹ وغیرہ وغیرہ۔

باب ۹

چار صدی عنایت ہوا تھا تو وہ دربار کے سب سے کمتر امیروں کا منصب ہے اور سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ اس عہد کی سرکاری تاریخوں میں ان سفیروں کا کہیں نام تک نہیں آتا اور جیسا کہ ہم ایک حاشیے میں بیان کر چکے ہیں۔ فارسی تواریخ میں صرف بالواسطہ شہادتوں سے تامس رو اور اس کے انگریزی تحائف کے دربار میں پیش ہونے کا پتا چلتا ہے۔ حالانکہ دیگر ممالک کے سفیروں کی آمد کے تفصیلی حالات محفوظ ہیں اور یوں بھی سلاطین مغلیہ کے ذاتی مشاغل کی ایسی جزئیات فارسی تاریخوں میں قلمبند کی گئی تھیں کہ اگر ہاکنس یا تامس رو پر ان کی خاص توجہ ہوتی تو یہ خلاف قیاس ہے کہ ان کے ذکر سے یہ تاریخیں خالی ہوتیں۔

ابتدائی کارخانے۔

بہرحال ۱۶۱۲ء مطابق (۱۰۲۱ھ) میں پہلی انگریزی کوٹھی سورت میں کھولی گئی اور بعد میں اس کی شاخیں برہانپور، احمدآباد، اجمیر، و آگرہ میں قائم ہوئیں جو مغربی ہند میں اس زمانے کے بڑے بڑے تجارتی مرکز تھے۔ خود سورت غالباً اس عہد میں ممالک ایشیا کی سب سے زیادہ آباد و بارونق بندرگاہ تھی اور جب یہاں پرتگیزوں کے علی الرغم انگریزی تجارت کی بنیاد پڑ گئی تو دوسرے مقامات پر بھی پرتگیز اپنے نو وارد حریفوں کو فروغ پانے سے نہ روک سکے اور کئی ناکامیوں کے بعد ۱۶۱۶ء مطابق (۱۰۲۵ھ) میں کورومنڈل کے ساحل پر مچھلی پٹم اور پیٹہ پلی میں انگریزی دکانیں کھل گئیں۔ لیکن اس طرف ان کی تجارت کے فروغ بلکہ کہنا چاہیئے کہ حکومت کے آغاز کی تاریخ وہ ہے جبکہ چینا پٹم کے راجہ نے موجودہ مدراس کی زمین معاوضے پر بطریق معافی ایک انگریز ایجنٹ کو دے دی (۱۶۳۹ء مطابق ۱۰۴۸ھ) اور تھوڑے دن بعد یہاں ان کا قلعہ سینٹ جارج تعمیر ہوا۔ (۱۶۴۰ء مطابق ۱۰۵۰ و ۱۰۴۹ھ)۔

واضح رہے کہ جنوبی ہند کے ان علاقوں میں اس وقت تک مغلوں کی عملداری نہ ہوئی تھی اور وجیانگر کے زوال نے یہاں کے مقامی رئیسوں کو خود مختار و آزاد بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ چینا پٹم کا چھوٹا سا راجہ انگریزوں کو مدراس میں جنگی استحکام بنانے سے نہ روک سکا ورنہ مغلوں کے ملک میں جو ان کی

باب ۲

تجارتی کوٹھیاں قائم ہوئیں وہاں وہ اس قسم کے قلعے بنانے کی جرأت نہ کرسکے اور ان کی حیثیت خالص تاجرانہ رہی۔ اسی گیارھویں صدی ہجری کے وسط میں بنگالے میں ان کے کئی کارخانے جاری ہوئے اور انگریزی تاریخوں کا بیان ہے کہ یہاں ان کی تجارتی ترقی بہت کچھ ڈاکٹر باوٹن کے رسوخ و کوشش کا نتیجہ تھی جو بنگالے کے مغل صوبہ دار کی سرکار میں ملازم (جراح) تھا[1]۔

انگریز سوداگروں کا باہمی تنازعہ

لندن کے ان تاجروں کو اپنی وطنی حکومت کی طرف سے ایشیائی تجارت کا اجارہ مل گیا تھا لیکن شاہ چارلس اول کے زمانے میں بعض اور سوداگروں نے بھی تجارت کی اجازت حاصل کرلی اور اب دونوں کمپنیوں میں رقابت بلکہ کبھی کبھی جنگ و جدال ہونے لگی، ادھر انگلستان میں سخت خانہ جنگی برپا ہوگئی اور بہت دن تک حکومت درہم برہم رہی، آخر شاہ چارلس دوم کے زمانے میں ان سوداگروں میں باہم اتحاد ہوگیا اور از سر نو ایک فرمان شاہی حاصل ہوا جس کی رو سے نہ صرف تجارت بلکہ اپنے ایشیائی مقبوضات میں انھیں ضرب سکہ اور حکومت کرنے کے حقوق بھی مل گئے۔ (۱۶۶۱ء مطابق ۱۰۷۲ھ)

کمپنی کا تدریجی فروغ

اسی سال چارلس نے جزیرۂ بمبئی کمپنی کو کرایہ پر دے دیا، اصل میں یہ جزیرہ پرتگیزوں کے قبضے میں تھا اور جب پرتگال کی شہزادی کی شاہ انگلستان سے شادی ہوئی تو یہ بھی اس کے جہیز میں شاہ انگلستان کو ملا تھا۔ اس جزیرے کی ان دنوں جو حیثیت و وقعت تھی اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہ لکھنا کافی ہے کہ اس کا سالانہ کرایہ صرف دس پونڈ قرار دیا گیا تھا۔ لیکن اول تو اسی زمانے میں سورت پر مرہٹوں نے تاخت کی دوسرے آہستہ آہستہ جزیرۂ بمبئی کی آبادی بڑھی اور انگریزوں کی چند عمارتیں تیار ہوگئیں۔ لہٰذا ۱۶۸۷ء م ۱۰۹۹ھ میں کمپنی نے اپنے صدر کارخانے کو سورت سے بمبئی میں منتقل کرلیا اور اس وقت سے انگریزی تجارت کے ساتھ ساتھ اس جزیرے کی رونق و آبادی

[1] گرے نیئر، جلد دوم صفحہ ۵۵۴۔

باب ۶

ملک گیری کے منصوبے اور ناکامیاں

میں برابر ترقی ہوتی رہی۔

یہی بارھویں صدی ہجری کے آخری سنین کا زمانہ ہے جس میں انگریز سوداگروں کے دل میں شوق ملک گیری پیدا ہوا اور انھوں نے سرتاسر روکے سابقہ اصول عمل کو چھوڑ کر قرار دیا کہ آئندہ سے جہاں تک ممکن ہو کمپنی کے ملازمین اپنے تجارتی کارخانوں کو جنگی اغراض کے لیے مستحکم کریں اور فوجی مصارف اور منافع کے واسطے گرد و نواح کے علاقوں پر بھی تصرف حاصل کریں۔ کمپنی کی طرف سے اس نئے منصوبے پر عمل کرنے کے واسطے جو ہدایات تحریر کی گئی تھیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک گیری کا یہ جذبہ ولندیزوں کی تقلید اور مزید منافع حاصل کرنے کے لالچ سے پیدا ہوا تھا۔[1] مگر جب اس پر عمل شروع ہوا تو کمپنی اور ہندوستان میں اس کے ملازمین کو سخت ناکامی و مصیبت اٹھانی پڑی کیونکہ یہ ملک جزائر شرق الہند کی طرح جس میں ولندیزوں کا قبضہ ہوتا جاتا تھا، نیم متمدن مقامی رئیسوں میں بٹے ہوئے نہ تھے بلکہ مغلوں کی پرشوکت و منتظم مرکزی حکومت کے ماتحت تھے۔

الغرض انگریزوں کی سرکشی کی خبر ہوتے ہی تمام صوبہ داروں کے نام شاہی احکام پہنچ گئے کہ ہر جگہ ان کی دکانیں بند اور مال ضبط کر لیا جائے۔ اسی ضمن میں کمپنی کے بعض انگریز ملازمین قید کر لیے گئے اور بعض نے روپوش ہو کر جان بچائی۔ کمپنی اپنے زعم میں سلطنت مغلیہ سے برسرپیکار تھی۔ لیکن یہاں اس کی طفلانہ "جنگ" کے حالات بیان کرنا تاریخ ہند کے ایک خفیف معاملے کو غیر معمولی اہمیت دینا ہوگا مختصر طور پر اتنا لکھنا کافی معلوم ہوتا ہے کہ

[1] کارکنان کمپنی کی نئی تجاویز کے الفاظ یہ تھے کہ "آئندہ سے ہمیں نہ صرف تجارتی نفع، بلکہ مالگزاری کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ اگر تجارت میں خسارہ ہو تو بھی اپنی "سپاہ" کے مصارف ادا کر سکیں.... یہی وہ مصلحت ہے جس کی بنا پر دانشمند ولندیز اپنی عام ہدایات میں جنھیں ہم نے دیکھا ہے، اگر ایک فقرہ اپنی تجارت کے متعلق لکھتے ہیں تو دس فقرے سیاسی اور جنگی معاملات اور اپنی مالگزاری بڑھانے کے متعلق تحریر کرتے ہیں...." گرے ٹیر جلد دوم صفحہ (۲۶۰)۔

باب

گو کمپنی نے دو تین مرتبہ جنگی بیڑے روانہ کئے جن میں انگلستان کی شاہی فوج بھی
تھی لیکن ان "حملہ آوروں" کی مجموعی تعداد غالباً دو ہزار سے کبھی زیادہ نہ تھی
اور انھوں نے سواحل بنگال پر جو حملے کئے ان سب میں نقصان و ناکامی
ہوئی۔ پھر انھوں نے بحر عرب میں حاجیوں کے جہاز لوٹنے شروع کئے لیکن
شاہی جہازوں نے اس دست برد کا بھی خاطر خواہ انسداد کر دیا اور دو تین
سال کی اس "لڑائی" میں اہل ہند کا تو کوئی قابل ذکر ملکی یا مالی نقصان ہوا
نہیں البتہ کمپنی کا دوالا نکلنے کی نوبت پہنچی۔ آخر اس کے وکیلوں نے عجز و ندامت
کے ساتھ بادشاہ سے معافی مانگی تب اسے از سر نو مگر دشوار تر شرائط پر تجارت کی
اجازت حاصل ہوئی (۱۶۹۰ء مطابق ۱۱۰۲ھ) نیز اسی سال انھیں کلکتے کے
مقام پر زمین لے کر تجارتی کارخانہ قائم کرنے کی اجازت مل گئی۔ بایں ہمہ کمپنی
کی اسی ایک جنگ نے اس کو ایسا نقصان پہنچایا، اور سبق دیا تھا کہ پھر نصف
صدی تک انگریزوں کو "ملک گیری" کا حوصلہ نہ ہوا اور بعد میں بھی یہ صرف
فرانسیسیوں سے تجارتی رقابت و آویزش کا نتیجہ تھا کہ وہ دوبارہ ہندوستان
کے سیاسی معاملات میں دخل دینے پر آمادہ ہوئے۔

نئی کمپنی اور اس کا اتحاد۔

معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی کے مذکورۂ بالا نقصانات اور ناکامیوں نے وطن
میں بھی اس کی ساکھ بگاڑ دی اور وہاں کا "آزاد خیال" (وہگ) فرقہ اس کے
تجارتی اجارے کے خلاف ہو گیا۔ اس اجارے کے باوجود بعض سوداگر چوری چھپے
نج کی تجارت تو پہلے بھی کرتے تھے لیکن اب جو کمپنی والوں نے بعض عہدہ داروں
کو دریا دلی سے رشوتیں دے کر پارلیمنٹ کے بے اطلاع ایک تازہ فرمان شاہی
حاصل کر لیا تو پارلیمنٹ میں عام ناراضی پیدا ہو گئی۔ اور دار العوام نے ایک
تجویز منظور کی جس کی رو سے انگلستان کے ہر شخص کو ایشیا سے تجارت کا حق مل گیا
اور کمپنی کے مخصوص حقوق سوخت کر لیے گئے۔ (۱۶۹۴ء مطابق ۱۱۰۶ھ)

نئی انگلش کمپنی

پرانی کمپنی کے توڑ پر ایک نئی "انگلش کمپنی" قائم ہوئی جس میں بہت
سے دولتمند اور ذی اثر لوگ حصہ دار تھے۔ اس کمپنی کے مقرر کردہ ملازمین کی پرانی
کمپنی کے نوکروں سے ہندوستان میں بہت دن تک جنگ زرگری ہوتی رہی

باب ۵

گرنئی کمپنی کو انگلستان میں جو رسوخ و اثر حاصل ہو گیا تھا ہندوستان میں حاصل نہ ہو سکا اور آخر عرصۂ دراز کے بے لطف تنازعات اور طویل بحث مباحثے کے بعد حکومت انگلستان نے دونوں کمپنیوں کو متحد کر دیا (۱۷۰۸ء مطابق ۱۱۱۹ھ) اور یہی "ایشیا سے تجارت کرنے والے سوداگروں کی متحدہ جماعت"[1] تھی جس سے بعد میں اہل ہند کو نہ صرف تجارتی بلکہ سیاسی واسطہ پڑا۔

مذکورۂ بالا اندرونی نزاع دفع ہونے کے بعد ان انگریز تاجروں کو پہلے سے زیادہ سرمائے اور اطمینان کے ساتھ اپنی تجارت ہند کو ترقی دینے کا موقع ملا لیکن اورنگ زیب کے عہد میں مغلوں سے لڑائی چھیڑ کر وہ ایسا نقصان اٹھا چکے تھے کہ اب ان کے تمام سیاسی منصوبے اور ملکی فتوحات کی آرزوئیں دلوں سے محو ہو گئی تھیں اور آیندہ چالیس برس تک انھوں نے ہندوستان کے معاملات میں حصہ لینے کی جسارت نہ کی۔ گرنے ٹیر کے مختصر تبصرے میں کمپنی کی اس چہل سالہ تاریخ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ اب کمپنی نے اسی قدیم طرز عمل کو اختیار کر لیا تھا کہ چپ چاپ اپنے بیوپار سے کام رکھے لہٰذا اس کی تاریخ میں یہ زمانہ قابل ذکر واقعات سے خالی ہے۔ ۱۷۱۵ء سے ۱۷۱۷ء (۱۱۳۰ھ) تک ایک انگریز ایلچی سورمان دربار شاہی میں رہا اور اس نے سلطنت مغلیہ کی طرف سے کمپنی کے لیے بعض تجارتی اور نیز نو آبادیاں بسانے کی مراعات حاصل کیں اور کمپنی کے ملازمین کو اپنی آنکھوں سے سلطنت کی اندرونی خرابی دیکھنے کا بھی موقع ملا لیکن اس عرصے میں خود کمپنی نے اپنے کام سے کام رکھا[1] .... بدامنی سے جو خرابیاں ملک میں رونما ہو رہی تھیں ان کے سب سے بڑے اثرات بمبئی میں ظاہر ہوئے جہاں ایک طرف انگریا نامی بحری قزاق ساحلوں پر کمپنی کی تجارت میں خلل ڈال رہا تھا اور دوسری طرف مرہٹوں کی آمد آمد نے کمپنی کی سلامتی کو مخدوش کر دیا تھا۔ لیکن بنگالے کا نیم آزاد نواب

[1] "United Company of Merchants of England Trading to the East."

اپنے انگریز ہمسایوں کے ساتھ مصالحانہ برتاؤ کرتا رہا اور مدراس میں انگریزوں کو اطمینان تھا کہ جب تک نواب نظام الملک اور مرہٹوں میں فیصلہ نہ ہو جائے اس وقت تک وہ محفوظ ہیں بایں ہمہ ۱۷۴۲ء (مطابق ۱۱۵۵ھ) کے قریب ہم دیکھتے ہیں کہ کمپنی کے تینوں مرکزی کارخانوں تک مرہٹوں کا دست تصرف دراز ہو رہا ہے..... یعنی اس سال ادھر تو مرہٹوں کا کرناٹک پر حملہ ہوتا ہے اور ادھر دو سال بعد انگریزوں کو کلکتے کی حفاظت کے لیے بعجلت خندق کھودنی پڑتی ہے" (جلد دوم صفحہ ۴۶۲)۔

تیسری فصل:۔ انگریزوں کا غلبہ فرانسیسیوں پر

پرتگیزوں کے زوال قوت کا حال اوپر ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ اندرونی قومی خرابیوں کے علاوہ ولندیزوں کی دشمنی سے ان کو سخت نقصان پہنچا۔ لیکن خود ولندیز ہندوستان میں پرتگیزوں کی جگہ نہ لے سکے جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ان کی چھوٹی سی ریاست کی حریف و ہمسایہ پروشیہ فرانس اور انگلستان جیسی قوی ریاستیں تھیں دوسرے یہ کہ ایشیا میں ان کی آمد و عروج کے وقت مغلوں کی زبردست سلطنت قایم تھی ہندوستان میں ملک گیری کا موقع نہ تھا اور چونکہ ولندیز اب کسی ملک پر مستقل قبضہ کئے بغیر وہاں تجارت کرنی پسند نہ کرتے تھے لہذا انھیں ہندوستان کے بجائے اپنے مستقر جزائر شرق الہند و ملایا میں بنانے پڑے، جہاں ان کی کشور کشائی کو روکنے والی کوئی بڑی مقامی ریاست نہ تھی۔ خام اجناس خاص کر مصالحوں کی ان جزائر میں افراط تھی جس کی بدولت ولندیزوں کو وہاں کی تجارت و زراعت میں نفع بھی خوب ہوا اور انھوں نے یہاں ایسی مضبوطی سے قدم جمائے

باب ۶

کہ اس مجمع الجزائر کے کئی بڑے بڑے جزیرے اب تک یورپ کی اسی چھوٹی سی قوم کے قبضے میں ہیں۔

اول اول انگریزی سوداگروں نے بھی بحر ہند کے ان جزائر میں اپنا بیوپار پھیلانے کی سعی کی تھی لیکن ولندیزوں کی رقابت اور قوت نے ان کا یہاں زیادہ دخل نہ ہونے دیا اور ناچار انھوں نے سواحل ہند ہی پر اپنے مرکزی کارخانے بنائے۔ بے شبہہ ان انگریز تاجروں کو بھی ولندیزوں کی طرح ملک گیری کا سودا تھا اور جیسا کہ ہم ابھی بیان کر رہے تھے، انھوں نے سترھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہندوستان کے بعض مقامات پر آزادانہ قبضہ کرنے کی ٹھان لی تھی لیکن جب اس کوشش میں نقصان ہوا تو انگریزی کمپنی نے اپنا طرز عمل بدل دیا اور دوبارہ صرف تجارت کو اپنا مقصود قرار دیا۔ یہ کمپنی اب اپنے سیاسی منصوبوں کو بالکل ترک کر چکی تھی مگر تقدیر نے انگریزوں کو ہندوستان کی بادشاہی کے لیے منتخب کیا تھا لہٰذا ان کی تجارت کے فروغ کے ساتھ ہندوستان سے ان کا تعلق بھی قوی ہوتا گیا پھر اسی تجارت کی حفاظت کی خاطر نیز دیگر اسباب نے جب ان کو اپنے فرانسیسی حریفوں سے آمادۂ پیکار کیا تو گویا وہ بلا قصد دوبارہ سیاسیات ہند کے میدان میں داخل ہوئے۔

فرانسیسیوں کی آمد ہند میں

جہاں تک جہاز رانی کا تعلق ہے۔ فرانسیسی ملاح بہت پہلے سولھویں صدی عیسوی کے آغاز ہی میں ایشیائی سمندروں تک پہنچ گئے تھے اور یکے بعد دیگرے فرانس میں کئی کمپنیاں بھی بنیں جن کا مقصد ممالک ایشیا سے تجارت کرنا تھا، لیکن اہل فرانس ان دنوں سپہگری کے دلدادہ تھے۔ تجارت سے انھیں چنداں مناسبت نہ تھی۔ ان کمپنیوں کو ملک میں کوئی قبولیت نہ حاصل ہوئی اور وہ تھوڑے دن بعد بند ہو گئیں۔ لیکن گیارھویں صدی ہجری (سترھویں عیسوی) کے وسط میں خود حکومت فرانس مشرقی ممالک سے تعلقات بڑھانے میں کوشاں ہوئی اور شاہ لوئی چہار دہم کے عہد اور اس کے وزیر کول بئیر کی سرپرستی میں سوداگروں کی ایک جماعت مرتب ہوئی جس کا مقصود ممالک ہند سے تجارت کرنا تھا۔ (۱۰۷۶ھ مطابق ۱۶۶۴ء) اس کمپنی کا پہلا تجارتی

باب ۶

کارخانہ چار سال بعد سورت میں قائم ہوا اور اگلے سال مچھلی پٹنم میں ایک شاخ کھل گئی۔ لیکن اسی زمانے میں فرانس کی ہالینڈ سے جنگ شروع ہوئی اور اس کی چنگاریوں سے ان قوموں کے ہندوستانی کارخانے بھی محفوظ نہ رہے۔ کم سے کم تجارت کو سخت نقصان پہنچا اور میلاپور (مدراس) کے ولندیزی کارخانے پر جن فرانسیسیوں نے قبضہ کر لیا تھا انھیں ولندیزوں نے شاہ گولکنڈہ کی مدد سے جبراً خارج کر دیا۔ (۱۶۷۴ء مطابق ۱۰۸۵ھ)۔

پانڈیچری کی بنا۔

یہاں سے نکل کر یہ فرانسیسی کوئی سو میل جنوب میں ساحل کورومنڈل کے اس مقام پر اترے جو تھوڑے دن پہلے انھوں نے سلطنت بیجاپور کے صوبہ دار شیر خاں لودی سے خریدا تھا۔ یہ قطعہ زمین بیجاپور کے صوبۂ جنجی میں اسی نام کی ندی کے کنارے تھا اور یہیں مارٹین فرانسیسی نے شیر خاں کی اجازت و امداد سے وہ بستی بسائی جو "پھل چیری" کہلاتی تھی اور بعد میں "پانڈی چیری" (پان دی شیری) کے نام سے مشہور ہوئی۔ شیر خاں صوبہ دار کی راست بازی اور شرافت کے فرانسیسی مورخ بہت مدّاح ہیں اور اسی نے بعد میں ان کے آبادکاروں کو قریب کی زمینیں بھی بطور جاگیر عطا کر دی تھیں۔ اس طرح ولندیزوں کی دشمنی کے باوجود، یہ چھوٹی سی فرانسیسی بستی آہستہ آہستہ ترقی کرنے لگی اور ۱۷۰۶ء م ۱۱۱۸ھ میں جب اس کا لائق بانی فوت ہوا تو وہ ایک بڑا تجارتی اور جنگی شہر بن گئی تھی۔[1]

جب جنوبی ہند میں دولتمند فرانسیسی تاجروں کا ایسا باموقع صدر مقام بن گیا تو لازمی طور پر ان اقطاع کے مقامی رئیسوں سے بھی ان کی شناسائی ہو گئی لیکن محمد شاہ کے عہد یعنی سترھویں صدی کے اوائل تک ان کا اہل ہند سے تعلق خالص تجارتی تھا اور دوسرے فرنگی سوداگروں کی طرح وہ بھی لین دین اور بیوپار کے سوا دیگر ملکی معاملات سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔ مگر ۱۷۳۵ء (مطابق ۱۱۴۸ھ) میں

[1] فرانسیسیوں کے ان حالات کا خاص ماخذ میلیسن کی کتاب "ہسٹری اوف دی فرنچ ان انڈیا" ہے۔ دیکھو صفحات ۲۰ تا ۲۶۔

باب ۷

جب ڈیوما (Dumas) ان کا صدر عامل یا گورنر مقرر ہوا تو ان کا یہ طرز عمل بدل گیا اور سچ یہ ہے کہ خود ہندی رئیسوں کے باہمی نفاق اور خود غرضی نے فرانسیسیوں کو ان کے معاملات میں مداخلت کرنے کا موقع دیا ورنہ محتاط ڈیوما خود ان جھگڑوں اور جوکھوں میں پڑنا نہ چاہتا تھا کہ مبادا فرانسیسی سوداگروں کی شہرت کو بٹہ لگے اور اہل ہند کی بدگمانی ان کو نقصان پہنچائے۔[1]

فرانسیسی مداخلت ملکی معاملات میں۔

بہرحال پہلی مرتبہ انھوں نے ۱۷۳۹ء مطابق ۱۱۵۱ھ میں تنجور کی مسند نشینی کے جھگڑے میں حصہ لیا اور اپنی مدد کے بدلے میں قصبۂ کاریکال حاصل کیا جو کول رون ندی کے دہانے پر واقع ہے اور ان دنوں نہایت باموقع تجارتی بندرگاہ سمجھا جاتا تھا۔ تنجور ایک چھوٹی سی ہندو ریاست تھی اور فرانسیسیوں کو اس کے اندرونی تنازعہ میں شریک ہونے سے کچھ تکلیف برداشت کرنی نہ پڑی۔ اور اس کا توقع سے بڑھ کر قیمتی معاوضہ حاصل ہو گیا لیکن اسی ابتدا نے ان کو آخر کرناٹک اور دکن کی سیاسی پیچیدگیوں میں پھنسایا اور آئندہ ان کی جلد بازی اور بیجا ہوس ملک گیری خود ان کے حق میں ناسازگار ثابت ہوئی۔

دراصل جب تک دور اندیش ڈیوما فرانسیسیوں کا حاکم رہا۔ اسوقت تک ان کی شہرت و قوت برابر بڑھتی رہی اور اس نے مرہٹوں کی یورش کرناٹک کے زمانے میں یہاں کے مقامی رئیسوں کی اعانت کی تو بھی فرانسیسیوں کی حیثیت محض احسان مند ہمدردوں کی سی تھی اور دوست علی رئیس کرناٹک کے اہل و عیال کو مصیبت کے وقت پانڈی چیری میں پناہ دینا بھی محض ان احسانات کا معاوضہ سمجھا جا سکتا ہے جو اس خاندان نے غریب الوطن

---

[1] بعض انگریزی تاریخوں میں لکھا ہے کہ خود ڈیوما نے ہندوستان کے سیاسی معاملات میں دخل دینے کا منصوبہ بنایا تھا اور گرزے ٹیر میں بھی یہی خیال ظاہر کیا گیا ہے لیکن یہ قول واقعات کے خلاف غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے اور ہماری مذکورۂ بالا رائے تفصیلی واقعات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد مے لیسن کی رائے کے موافق ہے۔ (دیکھو ہسٹری اوف دی فرنچ۔ باب سوم)۔

باب ۷

فرانسیسی سوداگروں کے ساتھ کئے تھے۔ لیکن مرہٹہ حملہ آوروں کے مقابلے میں اس پناہ دہی نے ادھر تو رئیس کرناٹک کے خاندان کو فرانسیسیوں کا ممنون احسان بنالیا اور ادھر ان کی جنگی قوت اور جرأت کا دکن میں ایسا شہرہ ہوگیا کہ خود نواب نظام الملک آصفجاہ اول نے دیوما کو خلعت بھیجا اور کچھ روز بعد دربار دہلی سے بھی اسے منصب اور نوابی کا خطاب ملا۔[۱] یہ سنہ ۱۷۴۰ء تا سنہ ۱۷۴۱ء کے واقعات ہیں اور چونکہ دیوما اسی زمانے میں اپنی ملازمت سے دست کش ہوگیا تھا۔ لہذا اس کی حاصل کردہ عزت و قوت سے فائدہ اٹھانے کا موقع اس کے مشہور جانشین دوپلے کو ملا جو پہلے چندر نگر کے فرانسیسی کارخانے کا منتظم تھا اور اب پانڈیچیری کا صدر عامل یا گورنر مقرر ہوا۔ (سنہ ۱۷۴۱ء)

دوپلے

دوپلے کی اکثر انگریز مورخوں نے سخت مذمت کی ہے کہ وہ ذاتی طور پر مکار و بد اخلاق آدمی تھا۔ لیکن حال میں جب سے اہل فرانس کے ساتھ انگریزوں کی قدیم رقابت اور دشمنی میں فرق آیا ہے اس مذمت میں بھی کمی آگئی ہے اور اب دوپلے کی سازش و جعل سازی کی تاویل شروع ہوگئی ہے خود اہل فرانس اب دوپلے کو اپنے محسنین قوم کی فہرست میں داخل کرتے ہیں حالانکہ زندگی میں انھوں نے بڑی ذلت و خواری کے ساتھ اسے معزول کیا تھا! اس تغیر رائے کی ایک خاص وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ آجکل یورپ میں قومی فوائد کے لیے مکر و فریب کو بھی جائز سمجھا جانے لگا ہے پس دوپلے نے اگر ہندوستان میں کوئی سازش یا جعلسازی کی تو صرف اتنا ثابت کردینا ان جرائم کو محاسن کی شکل میں بدل دیگا کہ یہ کام اس نے فرانس کو فائدہ پہنچانے کی "نیت" سے کئے تھے! لیکن ذاتی اخلاق سے قطع نظر ہمیں یہاں خاص طور پر جو بات یاد رکھنی چاہئیے وہ یہ ہے کہ دوپلے کی ناکامی کا اصلی سبب یہ ہوا کہ وہ اپنی بساط سے بڑھ کے کام کرنا چاہتا تھا اور جلد بازی سے جو اہل فرانس کی قومی خصائص میں داخل ہے۔ تمام ممالک دکن کو چند ہی سال میں دبا لینے کا

[۱] میلیسن "ہسٹری آوف دی فرینچ"

باب ۶

آرزومند تھا حالانکہ اہل ہند کو اندرونی خرابیوں نے خواہ کتنا ہی کمزور کردیا ہو۔ مگر اس وقت یورپ والوں میں اتنی قوت نہ تھی کہ اتنی وسیع مملکت کو آسانی سے ہضم کرجائیں۔

انگریزوں سے پہلی جنگ

بہرحال، دوپلے کو ہندوستانی معاملات میں کوئی خاص دخل دینے کا ابھی موقع نہ ملا تھا کہ ۱۷۴۴ء (۱۱۵۷ھ) میں فرانس و انگلستان کی جنگ چھڑ گئی اور ہندوستان میں بھی خود انگریزوں نے پیش دستی کی یعنی پانڈی چیری پر حملہ کیا۔ ان کی اس جرأت کا اصلی سبب یہ تھا کہ اس وقت اہل فرانس کا کوئی جنگی بیڑا ایشیائی سمندروں میں موجود نہ تھا اور اہل انگلستان لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی ایک بیڑا خاص اس واسطے ادھر روانہ کرچکے تھے کہ فرانس کی ایشیائی تجارت اور نوآبادیوں کو غارت کرڈالے[1]۔

اہل فرانس کی غفلت سے انگریزوں کو پانڈی چیری کی فتح کا موقع تو بہت اچھا مل گیا تھا۔ لیکن اب کرناٹک، بیجاپور و گولکنڈے کے نااہل بادشاہوں کے تحت میں نہ تھا۔ اور نہ وہاں دوست علی کے زمانے کی سی بدعملی تھی بلکہ اسی زمانے میں نواب نظام الملک آصفجاہ اول نے ازسرنو اس علاقے کا انتظام درست کیا اور وہاں اپنے ایک سردار انورالدین خاں کو ناظم بنادیا تھا جیسا کہ پچھلے باب میں ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ انورالدین خاں نہایت مستعد اور لائق حاکم تھا اور جب اس موقع پر دوپلے نے اس کے حضور میں انگریزوں کی زیادتی کی فریاد کی تو اس نے مدراس حکم بھیجکر جبراً انگریزوں کو پانڈی چیری پر حملہ کرنے سے روک دیا۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد ماریشس سے ایک فرانسیسی بیڑا ہندوستان آپہنچا اور اب خود دوپلے نے مدراس پر فوج کشی کی اور انورالدین خاں نے اس فوج کشی کی اجازت اس شرط پر دی کہ فرانسیسی اس شہر کو تسخیر کرنے کے بعد نواب موصوف کے حوالے کردیں گے۔

---

[1] میلیسن۔ ۹۹۔۱۰۰۔

۱۷۴۶ء (اواخر ۱۱۵۹ھ) میں فرانسیسیوں نے مدراس فتح کرلیا لیکن اس پر قابض ہونے کے بعد ان کے سرداروں میں باہم نزاع ہوگئی اور اسی جھگڑے کی وجہ سے شہر کا نواب انورالدین خاں کے حوالے کرنا ملتوی رہا۔ اور نواب نے جو فوج اس امید پر مدراس روانہ کی تھی کہ حسب اقرار فرانسیسی اس شہر کو خالی کردیں گے، اس فوج پر فرانسیسیوں نے غالباً دھوکے[1] سے حملہ کیا اور شکست دی، ساتھ ہی دوپلے نے مدراس کو مستقل طور پر فرانسیسی مقبوضہ بنانے کا اعلان کردیا۔

جنگ میلاپور کی مفروضہ اہمیت

مذکورۂ بالا "جنگ" مدراس کے چند ہی میل جنوب میں موضع میلاپور کے قریب واقع ہوئی تھی، یوروپین راویوں کا بیان ہے کہ اس میں نواب کی فوج "تقریباً دس ہزار" تھی اور مقابلے میں پانڈی چیری اور مدراس کے فرانسیسی سپاہیوں کی تعداد کم وبیش دو ہزار بتائی گئی ہے جن میں سے اصلی اور پہلا حملہ کرنے والے ایک ہزار سے بھی کم تھے، بلکہ اس فتح میں تعریف کا اصلی حقدار اگر فرنگی سپاہیوں کو سمجھا جائے تو ان کی تعداد اور بھی کم یعنی دو سو تیس کے قریب تھی[2]، انھی "بہادروں" کے حملے کی دشمن تاب نہ لایا اور طرفۃ العین میں بے حواس ہوکر فرار ہوگیا، پس مےلیسن صاحب دعویٰ کرتے ہیں کہ تاریخ ہندوستان کی جس قدر بڑی بڑی لڑائیاں ہوئی ہیں ان میں سے اس میلاپور کے معرکے سے زیادہ کوئی بھی یادگار کے قابل نہیں! پھر وہ اور قریب قریب تمام انگریز تاریخ نویس یقین دلاتے ہیں کہ یہی ایک معرکہ اس بات کا قطعی اور پہلا ثبوت تھا کہ ایک مٹھی بھر قواعد داں اور بہادر فرنگی سپاہ کے مقابلے میں ہندوستانیوں کے بڑے سے بڑے لشکر کی کچھ حقیقت نہیں ہے!

[1] اس لڑائی کا ہماری کسی فارسی تاریخ میں ذکر نہیں اور فرانسیسیوں کے بیانات کا جو خلاصہ مےلیسن صاحب نیز دیگر انگریز تاریخ نگاروں نے بیان کیا ہے اس کا طرز تاریخ کے بجائے خیالی داستانوں سے ملتا جلتا ہے مگر دوسرا ماخذ نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں چاروناچار قیاس ودرایت کے زور سے انھی مبالغہ آمیز روایات میں سے اصلی واقعات کا سراغ لگانا پڑے گا۔

[2] ہسٹری اوف دی فرنچ، صفحہ ۱۹۰ تا ۱۹۲۔

باب

لیکن اس سے قطع نظر کہ ان "فرنگی افواج" میں ہندوستانی سپاہیوں کی تعداد فرنگیوں کی نسبت ہمیشہ سہ گنی چہار گنی رہی ہے، یہ فرنگی مورخ خود ستائی کے جوش میں اس بات کو بھی بھول جاتے ہیں کہ میلاپور کی لڑائی کو پورا ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ نواب انورالدین خاں کے اسی بے قاعدہ لشکر نے فرانسیسیوں کو کدلور کے قریب شکست دی اور یہ قواعد داں بہادر اس طرح فرار ہوئے کہ دو گھنٹے تک انھوں نے کہیں ٹھیرنے کا نام نہیں لیا! (یکم دسمبر ۱۷۴۶ء)[1] پھر جب ہم پڑھتے ہیں کہ دوپلے کو آخر میں نواب سے اس شرط پہ صلح کرنی پڑی کہ مدراس کے جنگی مورچے منہدم کرا دیئے جائیں گے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ انورالدین خاں کا اصلی مقصود پورا ہو گیا۔ اسی ضمن میں یہ جتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ناظم کرناٹک کی دس ہزار فوج کے مقابلے میں فرانسیسی سپاہ کی جو تعداد (دو ہزار) بتائی گئی ہے وہ کسی قدر مشتبہ ہے کیونکہ اگرچہ برس پہلے، پان ڈی چیری میں ضرورت کے وقت پانچ ہزار قواعد داں ہندوستانی اور ایک ہزار سے زیادہ فرنگی سپاہی بھرتی ہو سکتے تھے[2] تو سمجھ میں نہیں آتا کہ دوپلے کے زمانے میں ان کی تعداد اتنی کم کیوں تھی۔ حالانکہ یہ مسلم ہے کہ وہ اپنے محتاط پیش رو سے کہیں زیادہ پرجوش و خودنما تھا اور اس جنگ کے موقع پر روپیہ بھی زیادہ صرف کر سکتا تھا!

دوسری جنگ

بہرحال انگریز اور فرانسیسیوں کی یہ لڑائی یورپ سے شروع ہوئی تھی اور وہیں ختم ہوئی، (عہدنامہ ایکس لا شاپیل، مرتبہ ۱۷۴۸ء مطابق ۱۱۶۱ھ) لیکن دو برس بعد ان کے باہم جو جنگ ہندوستان میں چھڑی وہ محض مقامی تھی یعنی حکومت فرانس و انگلستان کا آپس میں کوئی جھگڑا نہ تھا بلکہ ابتداً، یہ صرف ان قوموں کے تاجروں کی جنگ تھی (۱۷۵۰ء تا ۱۷۵۴ء مطابق ۱۱۶۷ھ)

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ نواب نظام الملک آصفجاہ اول کی وفات کے بعد مرحوم کے ایک نواسے (ہدایت محی الدین خاں عرف مظفر جنگ) کو بھی

---

[1] ہسٹری آف دی فرنچ صفحہ ۳۹ تا ۴۰

[2] ملیسن، کتاب مذکور صفحہ ۵۸

باب

مسند دکن کا دعویٰ تھا، اسی طرح کرناٹک کی نظامت کا حسین دوست خاں عرف چندا صاحب مدعی بن گیا جو یہاں کے پہلے رئیس صفدر علی کا داماد تھا اور ان دونوں کی پشت پناہی دوپلے نے اپنے ذمے لی لیکن فرانسیسیوں کو مظفر جنگ کی رفاقت میں علانیہ دکن پر فوج کشی کی ہمت نہ تھی اور یوں بھی کرناٹک زیادہ قریب تھا لہذا اول اول انھوں نے چندا صاحب کی اعانت پر اکتفا کی۔ تقدیر کی یاوری سے پہلی ہی لڑائی میں نواب انورالدین خاں مارا گیا (جنگ امبر ۱۷۴۹ء ۱۱۶۲ھ) اور اہل سازش ملک پر قابض ہو گئے۔ لیکن اس بغاوت کا حال سن کر نواب ناصر جنگ نے جب ادھر رخ کیا تو اتحادیوں نے پان دی چیری کی جانب راہ فرار اختیار کیا اور نواب ناصر جنگ نے یہاں تک بھی ان کا تعاقب نہ چھوڑا۔ شہر سے کچھ فاصلے پر فرانسیسیوں نے بہت مستحکم مورچے اور دمدمے بنا لیے تھے لیکن فرانسیسی سپاہی نواب ناصر جنگ کے زبردست لشکر کی آمد آمد دیکھ کر گھبرا گئے۔ معمولی زد و خورد ہی میں ان کی شجاعت اور قواعد دانی کی قلعی کھل گئی اور وہ راتوں رات اپنے مورچوں سے چھپ کر بھاگ گئے۔ یورپی راویوں کا قول ہے کہ مظفر جنگ کو بھی انھوں نے اپنے ساتھ پان ڈی چیری میں چل کر پناہ لینے کی صلاح دی تھی لیکن اس نے خود انکار کر دیا، اور دوسرے دن ماموں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا[1] (۱۷۵۰ء م ۱۱۶۳ھ)

نواب ناصر جنگ اور پھر مظفر جنگ کے قتل اور فرانسیسیوں کے دربار دکن میں رسوخ حاصل کرنے کے حالات گزشتہ باب میں ہماری نظر سے گزر چکے ہیں، انگریزوں نے اب تک ان سازشوں اور لڑائیوں میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا تھا لیکن دربار دکن میں فرانسیسیوں کا روز افزوں رسوخ دیکھ کر انھیں

---

[1] مے لیسن صفحہ ۲۴۳ وغیرہ۔ مگر یہ روایتیں بناوٹ سے خالی نہیں۔ صاحب مآثر الامرا نے اسی واقعے کو مختصر طور پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "بست و ششم ربیع الآخر ۱۱۶۳ھ تا سہ پاس کامل آتش خانہ فرنگ سرگرم اشتعال بود۔ آخر کار (بتاریخ) بست و ہفتم سنہ فرنگیاں از رعب و مہابت محمدیاں رو بہ ہزیمت آوردند و ہدایت محی الدین خاں زندہ دستگیر شد" جلد سوم صفحہ ۴۵۳۔

باب

سخت وہم وحسد پیدا ہوا اور بقول صاحب مآثر الامراء "ہوائے مداخلت در ملک بادشاہی بہم رسید کہ آلو آلو را دیدہ رشک میگیرد" اور چونکہ دکن تک رسائی دشوار تھی، لہٰذا ان کی کوشش کرناٹک تک محدود رہی اور وہ نواب محمد علی خاں کے حلیف و مددگار بن گئے۔ یہ شخص نواب انورالدین خاں کا چھوٹا بیٹا اور بہ اعتبار وراثت نظامت کرناٹک کا حق دار تھا، مگر چندا صاحب نے اسے اب شمالی کرناٹک سے دھکیل کر ترچناپلی میں محصور کر رکھا تھا (۱۱۶۴ھ مطابق ۱۷۵۱ء) اور ابتدا میں انگریز بھی اس کو بچانے سے مایوس ہو گئے تھے، لیکن اس مہم کو جلد سے جلد فیصلہ کرنے کی دھن میں چندا صاحب نے اپنی تمام فوج اسی شہر (ترچناپلی) کے گرد جمع کر لی تھی اور خود اپنے صدر مقام ارکاٹ کو غیر محفوظ چھوڑ آیا تھا، اتفاق سے انھی دنوں تازہ دم فوج انگلستان سے مدراس آئی اور چونکہ اسے ترچناپلی لے جانا دشوار و بیکار نظر آتا تھا لہٰذا کلائیو کو ارکاٹ پر حملہ کرنے کی تدبیر سوجھی، اور انگریزوں نے یک بہ یک پہنچ کر بلا مزاحمت اس قلعے پر قبضہ کر لیا۔

محمد علی کی کامیابی

قرینہ کہتا ہے کہ چندا صاحب کو اس بات کا گمان نہ تھا کہ مدراس کے انگریز تاجر بطور خود اس کے ملک پر حملہ کرنے کی جرأت کریں گے لیکن اس واقعے نے لڑائی کا رنگ بدل دیا اور چندا صاحب کو ترچناپلی کے محاصرے کے ساتھ اپنا صدر مقام واپس لینے کی فکر لاحق ہو گئی۔ اسی وقت فرانسیسیوں کو بھی غالباً اپنی ہوس بیجا کے برے نتائج اور یہ بات معلوم ہوئی ہو گی کہ ان کا جنوبی ہند میں فروغ محض مکر و سازش کی اتفاقی کامیابی ہے ورنہ خود ان میں اس قدر قوت نہ تھی کہ وہ حیدرآباد ایک طرف، صرف کرناٹک ہی کو اپنے قابو میں رکھ سکتے، کیونکہ محمد علی کی وجاہت و خوش نصیبی نے بہت سے ہندی رئیسوں کو اس کی اعانت پر آمادہ کر دیا اور آئندہ سال خود چندا صاحب گھر کر گرفتار و قتل ہوا تو فرانسیسی کچھ بھی نہ کر سکے اور کرناٹک میں نواب محمد علی کا کوئی حریف نہ رہا انگریزوں کو بھی محمد علی کے جیتے جی ملک میں مداخلت کرنے کا

باب ۷

زیادہ موقع نہیں مل سکا[1] تاہم متعدد فوائد و مراعات کے علاوہ یہی جیت کچھ کم نہ تھی کہ فرانسیسیوں کا کرناٹک میں کوئی اثر نہ رہا، اور وہ آئندہ جنگ میں پان ڈی چیری کی بھی خاطر خواہ مدافعت نہ کر سکے۔

فرانسیسیوں کی آخری جنگ اور شکست

یہ آخری جنگ انگلستان و فرانس کی مشہور "جنگ ہفت سالہ" کا ضمیمہ تھی جس کا یورپ میں ۱۷۵۶ء (۱۱۶۹ھ) میں آغاز ہوا اور حکومتِ فرانس نے اپنے مشہور فوجی سردار کونٹ لالی کو خاص ہندوستان کی مہم پر مامور کیا کہ وہاں سے انگریزوں کو نکال دے، لیکن لالی کسی قدر سخت گیر و خود پسند آدمی تھا دوپلے کئی سال پہلے "گورنری" سے معزول کر دیا گیا تھا اور ہندوستان میں لالی کو اپنے دوسرے عیش دوست اور نافرماں ہموطنوں سے کوئی مدد نہ مل سکی بلکہ بعض اوقات انھوں نے اسے زک دینے کی کوشش میں اپنے ملک و قوم کو نقصان پہنچانے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ ایک دقت یہ پیش آئی کہ ریاست حیدرآباد سے تعلقات رکھنے کی وجہ سے فرانسیسیوں کی ذمہ داریاں بہت وسیع ہو گئی تھیں اور ادھر حکومت فرانس ایک دفعہ لالی کو بھیج کر ہندوستان کی طرف سے ایسی بے خبر ہو گئی تھی کہ انگریزی بیڑا اور تازہ دم فوجیں ہندوستان آئیں، مدراس کا محاصرہ کرتے کرتے فرانسیسیوں کو خود محصور ہونا پڑا، لیکن فرانس والے اپنے قلیل التعداد ہموطنوں کو کوئی مدد نہ پہنچا سکے، پھر پان ڈی چیری میں محاصرین کی برّی اور بحری ناکہ بندی نے سامان خوردنی کا قحط ڈال دیا تو مجبور ہو کر فرانسیسیوں نے شہر کو انگریزوں کے حوالے کر دیا اور اطاعت قبول کر لی (جنوری ۱۷۶۱ء مطابق ۱۱۷۴ھ)

یورپ میں جنگ ہفت سالہ کے بعد جب صلح ہوئی تو فرانس کے قدیم ہندوستانی مقبوضات بھی اسے واپس ملے (۱۷۶۳ء) انگریزوں نے پان ڈی چیری کی عمارات کو بے دردی سے گرا کر شہر کی اینٹ سے اینٹ

---

[1] غالباً اس کا سب سے بڑا یہی قصور تھا جس کی بنا پر ونسنٹ اسمتھ صاحب نہایت بازاری پیرائے میں اس کی مذمت کرتے ہیں! (دیکھو اوکس فورڈ ہسٹری صفحہ ۴۷۶ وغیرہ)

بجادی تھی[1]۔ اب اگرچہ بروئے معاہدہ یہ مقام ان کو واپس دینا پڑا اور فرانسیسیوں نے دوبارہ اسے تعمیر کرا لیا تاہم ان سے یہ شرط لے لی گئی کہ آئندہ یہاں کبھی جنگی استحکامات نہ بنائے جائیں گے، چنانچہ گو بعض مقامات پر اب تک اہل فرانس کی عملداری ہے لیکن جنوبی ہند میں ان کے منصوبۂ ملک گیری کا اسی وقت سے خاتمہ ہو گیا، اور ان کے موجودہ مقبوضات محض تجارتی اور غیر مصافی حیثیت رکھتے ہیں۔

---

[1] اوکس بحس، صفحہ ۵۰۰ بحوالہ اورم وغیرہ۔
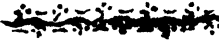
ابتدائی مقبوضات اور لڑائیاں

ممالک ہند پر انگریزی تسلط کے حملہ واقعات نہایت شرح و بسط سے انگریزی زبان میں موجود ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ حالات ایک ایسی قوم کے لکھے ہوئے ہیں جو آخر کار اس وسیع ملک پر حکمراں ہوگئی۔ اس لیے اپنی فضیلت اور دوسروں کی تحقیر سے اس کی معمولی تاریخوں کا خالی نہ ہونا ایک قدرتی امر ہے، دنیا کا قاعدہ بھی یہی رہا ہے کہ ملک گیری کی تاریخ ملک پر تسلط کرنے والے لکھا کرتے ہیں تاکہ ان کا نام دنیا میں روشن ہو اور ان کی اولوالعزمی کی مثالیں ان کی اولاد و اخلاف کے پیش نظر رہیں، لیکن جن قوموں کے ملک پر تسلط کیا جاتا ہے وہ انقلاب حکومت کے زمانے میں یا تو بالکل خاموش رہتی ہیں یا اگر قلم اٹھاتی بھی ہیں تو زیردست اور مغلوب کی حیثیت سے جس کا نتیجہ پڑھنے والے کے لیے بجز انفعال کے اور کچھ نہیں ہوتا، بہرکیف قومی تفاخر اور تعلی کے ساتھ تاریخ نویسی گو قوم بالادست کے لیے کیسی ہی دلکش اور مفید ہو لیکن جو قومیں اس وقت مغلوب ہیں ان کے حق میں علاوہ غیر صحیح ہونے کے ایسی تاریخ موجب نقصان و دلشکنی ہوتی ہے اور

باب

اسی وجہ سے افسوس ہے کہ اس تاریخ کے اکثر بیانات یک طرفہ یا غلط یا مشکوک سمجھے جاتے ہیں۔

لیکن طالب علم کو یاد رکھنا چاہئیے کہ قطع نظر ایسے تاریخی سرمائے کے جس کو ہم اطمینان سے اپنا کہہ سکیں خود انگریزی زبان میں انگریزی عہد حکومت کے حالات اور واقعات کا ذخیرہ اس قدر وافر ہے اور بعض انصاف پسند اور راست گو انگریزوں نے خود اکثر واقعات کے تمام پہلوؤں پر ایسی مفصل بحث کی ہے کہ جہاں کہیں طالب علم کو کوئی شک یا شکایت پیدا ہو تو وہ ان کے مطالعہ سے کوئی اطمینان بخش نتیجہ ایسا نکال سکتا ہے جس کو عام انگریزی تاریخوں نے نظر انداز کر دیا ہے اور دوسروں کی کہانی اپنی زبان سے اسی طرح سنا سکتا ہے جیسے کہ اپنی کہانی دوسروں کی زبان سے سنتا رہا ہے۔ بہرکیف طالب علم کا فرض ہے کہ جہاں کہیں اس قسم کی شکایت ہو نہایت تحقیق و تجسس سے انصاف کو مدنظر رکھ کر تاریخ کی کتابوں کی ورق گردانی کرے اور صحیح نتائج تک پہنچکر جو کوفت غیروں سے اپنی خواریاں سن کر دل میں پیدا ہوتی ہے' اس کو علمی وسعت اور عالی حوصلگی سے رفع کرے اور انسان کے تعلقات کو جو ہمیشہ بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے اچھی امیدوں کے ساتھ بلند نظری سے دیکھے اور سمجھے کہ سچائی کبھی کسی کے چھپائے نہ چھپے گی۔

حیدر علی حاکم میسور کے حالات میں ایک انصاف پسند انگریز لکھتا ہے کہ اس نامور شخص کی نسبت قابل اطمینان رائے قائم کرنی دشوار بلکہ محال ہوگئی ہے کیونکہ اس بارے میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی رائیں رقابت قومی کی وجہ سے بالکل متضاد ہیں۔" اس قول سے ہی اس نتیجے پر پہنچنے کی جرأت کی جاسکتی ہے کہ جس وقت سے یورپ کی قوموں کا قدم ہندوستان میں آیا اس ملک کی صحیح تاریخ مختلف قیاسی روایات کے انبار میں دب گئی۔ لیکن ایک ذہین متجسس کے لیے اسی انبار سے صحیح واقعات کا آشکارا کر دینا دشوار رہی مگر غیر ممکن نہیں۔

زمانۂ انقلاب کی تاریخ کے متعلق جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں

ایک مشکل یہ ہے کہ خود ہند کے مصنفین عصر نے (تیرھویں صدی ہجری کے وسط تک)
عہد برطانوی کی کوئی مفصل دستند تاریخ نہیں لکھی سیر المتاخرین یا ریاض السلاطین
وغیرہ مقامی تاریخیں ملتی ہیں لیکن یہ بھی ایک حد تک انگریزوں کی سرپرستی کی
امید پر لکھی گئی تھیں اس لیے اطمینان نہیں ہوتا کہ وہ رو رعایت سے خالی ہونگی۔
پھر بھی ان کی شہادت معمولی انگریزی تاریخوں سے زیادہ قابل توجہ معلوم ہوتی
ہے ہم بھی جہاں تک ممکن ہوگا ان تاریخوں سے گو وہ ناکافی اور قلیل ہیں مدد لینگے
مگر مجموعی طور پر انگریزی کے سرمایۂ معلومات پر حصر کیئے بغیر چارہ نہیں۔ اس کو
بھی ہم کوئی بیچارگی محض تصور نہیں کرتے کیونکہ خود اس سرمائے میں ایسا مواد مل جاتا
ہے جس سے عام انگریزی تاریخوں کی بے احتیاطی ظاہر ہو جاتی ہے۔ بہر حال
اس مختصر تاریخ میں ہم نے یہ التزام رکھا ہے کہ جہاں کہیں مشکوک یا غلط روایات
کی تصحیح خود انگریزی اسناد سے یا اپنی کتابوں سے نہیں ہوسکی ہے وہاں از روئے
درایت ان کی صحت یا عدم صحت سے بحث کی ہے اور روایت کی غلطی یا
اس کا ضعف ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔

انگریزوں کے قبضۂ بنگالہ کی تاریخ کچھ ایسے ہی مبالغہ آمیز روایات سے شروع
ہوتی ہے جن میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ انگریزوں کے تسلط سے بنگالہ میں
بہت بڑا انقلاب رونما ہوگیا۔ بات یہ ہے کہ کرناٹک کی طرح بنگالہ میں بھی
انگریزوں کے ساتھ فرانسیسیوں اور ولندیزیوں کی بھی منڈیاں تھیں چنانچہ
انگریزی کمپنی کلکتے میں تھی تو فرانسیسی چندر نگر اور ولندیزی چنسورہ میں تھے۔
ان میں سے ہر قوم بنگالے پر تسلط کرنا چاہتی تھی ان کی تجارتی رقابت یورپ
کی لڑائیوں کی وجہ سے زیادہ شدید ہوتی گئی۔ اور کرناٹک کی طرح بنگالے کی
سرزمین بھی اس کشمکش کا دنگل بن گئی۔ جس سے بنگالے کے امن و امان اور
تجارت کو نقصان پہنچتا تھا۔ بنگالے کی حکومت بھی اس کو محسوس کرتی تھی۔
مرشد قلی خاں کے عہد میں ان تاجروں کے تمام راستے مسدود کردیے گئے تھے
تاکہ یہ لوگ آگے نہ بڑھنے پائیں علی وردی خاں کے عہد میں ان کو قلعے بنانے
کی اجازت نہیں تھی اور چونکہ انگریز زیادہ پیش پیش تھے اس لیے معلوم ہوتا ہے

کہ بنگالے کی حکومت ان کو مشتبہ نظر سے دیکھتی تھی۔ چنانچہ جب ۱۷۵۶ء میں سراج الدولہ بنگالے کا ناظم ہوا تو اس نے بھی اپنے پیشرو حکمرانوں کے نقش قدم پر ان تاجروں کا راستہ مسدود کرنے کی کوشش کی اور اس کو بھی انگریز کمپنی سے ڈر محسوس ہونے لگا اور وہ دوسری مغربی قوموں کے مقابلے میں انگریزوں کا زیادہ مخالف ہوگیا اور کیونکہ یہ زیادہ طاقتور تھے اور غالباً اس کا یہ خیال تھا کہ انگریزوں کو مغلوب کرکے دوسری قوموں پر دار کرے چنانچہ شروع سے اس نے اس کمپنی کی طاقت توڑنے کی کوشش کی انگریز مورخ اس کو کتنا ہی نالائق اور بیوقوف ٹھیرائیں لیکن آئندہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ڈر بہت کچھ حق بجانب تھا اور اس کے فیصلوں میں معقولیت تھی۔

انگریزوں سے سراج الدولہ کی کھلی مخالفت اس طرح شروع ہوئی کہ انگریز کمپنی نے حکومت بنگالہ کے پرانے احکام کے خلاف قلعے بنا لیے تھے اور ان کو اس کی ضرورت اس وجہ سے محسوس ہوئی تھی کہ انگریز اور فرانسیسیوں کے تعلقات روز بروز کشیدہ ہو رہے تھے اور چند ہی دنوں کے بعد ان دونوں قوموں کے درمیان یورپ میں ایک بڑی جنگ چھڑ گئی جو "جنگ ہفت سالہ" کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کے بعض باغیوں کو انگریز کمپنی نے پناہ دے رکھی تھی جس سے سراج الدولہ کو سخت شکایت پیدا ہوگئی۔ چنانچہ اس نے قاسم بازار کے کارخانے کو ضبط کرکے پچاس ہزار فوج کے ساتھ کلکتے پر پیش قدمی کردی۔ ۱۶ جون ۱۷۵۶ء کو یہ حملہ ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جنوبی لڑائیوں کی وجہ سے جو کرناٹک میں ہوئی تھیں یہاں انگریزی فوجیں بہت کم تھیں۔ بہت سے انگریز مع صدر کارخانہ ڈریک کے کشتیوں میں فرار ہوگئے اور قلعے میں جو لوگ رہ گئے تھے انھوں نے حملے کی تاب نہ لاکر ۲۰ جون کو ہتھیار ڈال دیے اور گرفتار ہوگئے۔ یہ محصورین تعداد میں ۱۷۰ بیان کئے جاتے ہیں۔ اور ہول ول جو ڈریک کے بھاگنے کے بعد قلعہ میں کمانڈر بنا یا گیا تھا ~~بیان کرتا ہے کہ منجملہ~~
~~ان کے ۱۴۶ قیدی ایک تنگ و تاریک کمرے میں ایک رات بند کر دیے گئے~~
~~اور صبح کو دیکھا گیا تو ان میں سے ۱۲۳ مر گئے تھے اور باقی نیم جان باہر نکلے جن میں~~

ہول ول بھی تھا۔ اس واقعے کی کوئی اصلیت نہیں ہے بلکہ یہ سب ہول ول کی من گھڑت تھی۔ خود ایک انگریز مسٹر لٹل ساکن بنگالہ نے بڑی تحقیق و تفصیل سے رسالہ "بنگال ماضی و حال" میں ایک مضمون لکھ کر اس قصے کے بے اصل ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے کاغذات و مراسلات سند میں پیش کئے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدت تک اس قصے کی کسی کو خبر تک نہ تھی اور نظمائے کمپنی کو انگلستان میں اس کی کبھی (سرکاری طور پر) اطلاع تک نہیں دی گئی۔ مزید براں بنگالے کی دو ہمعصر فارسی تاریخیں موجود ہیں جن میں نواب سراج الدولہ کی انگریزوں سے ناراضی اور کلکتے کی تسخیر و غارت گری کے حالات کو بہت تفصیل سے لکھا ہے مگر ان میں بلیک ہول کے ہولناک واقعے کا خفیف سا اشارہ بھی نہیں پایا جاتا۔ حالانکہ ایک کتاب یعنی "ریاض السلاطین" تو ایک انگریز عہدہ دار کی زیر سرپرستی مرتب کی گئی تھی اور دوسری کتاب "سیر المتاخرین" کا مصنف انگریزی قوم کا نہایت مدّاح اور طرف دار ہے اور سراج الدولہ اور اس کے اہل دربار کے ظلم و ستم اور جہل و سفاہت کے بیان میں اس نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔

انگریزی تاریخوں کا بیان ہے کہ جس کوٹھری میں ۱۴۶ انگریز قیدی رات بھر بند رہے وہ مشکل سے ۱۸×۱۴ فٹ کی تھی۔ اس میں صبح کو صرف ۲۳ آدمی زندہ ملے اور باقی سب تلف ہو گئے لیکن یہاں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر قید کرنے والے ہندوستانی شدت سے ظالم اور شقی القلب تھے تو بھی وہ اتنے زندہ آدمیوں کو ایسی چھوٹی سی جگہ میں کیونکر بند کر سکے اور کیونکر اتنے لوگ ایسی تنگ جگہ میں سما سکے۔ ونسنٹ اسمتھ صاحب اپنی نئی تاریخ ہند میں لکھتے ہیں کہ "اس قصے کو ایک من گھڑت کہانی ثابت کرنے کی اس زمانے میں جو کوشش کی گئی وہ پختہ دلائل پر مبنی نہیں ہے۔ بلیک ہول کا واقعہ ضرور پیش آیا گو اس کے بعض جزئیات کافی طور پر یقینی نہ ہوں" لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس واقعے میں ظلم و اذیت کی نوعیت زیادہ تر ان جزئیات ہی پر موقوف ہے۔ مثلاً اگر قیدیوں کی تعداد کم تھی تو اس واقعے کے ظلم ہونے میں تو جب بھی

شبہ نہیں لیکن ظلم کی ہولناک شدت میں تخفیف ہوجاتی ہے۔ بہرکیف یہ لائق مولف سراج الدولہ کے متعلق اتنا ضرور لکھتا ہے کہ "انگریزی قیدیوں کو کال کوٹھری میں بند کرنے کا حکم نواب نے نہیں دیا تھا۔ البتہ اس کا قصور یہ تھا کہ اپنے ماتحتوں کو اس فعل پر اس نے کوئی سرزنش یا اس ہولناک نتیجے پر کوئی اظہار افسوس نہیں کیا، لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ کلکتے کی تسخیر کے بعد سراج الدولہ اور انگریزوں کے مخالفانہ تعلق میں اتنی کمی ہوگئی تھی کہ لڑائی کے بعد سراج الدولہ کو اتنی قدرت یا مہلت ملی تھی کہ وہ اس وحشیانہ حرکت پر اپنے ملازموں کو سرزنش کرتا اور اپنا اظہار افسوس انگریزوں تک پہنچاتا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ سراج الدولہ کو اتنی مہلت اور قدرت کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ کلکتے پر سراج الدولہ کے حملے کے متعلق (جس کے سلسلے میں بلیک ہول کا واقعہ اور آخر جنگ پلاسی کے بعد خود سراج الدولہ کا نہایت بے رحمی سے قتل ہونا پیش آیا) یہ بتا دینا ضروری ہے کہ گو سراج الدولہ کے آتشیں مزاج اور کوتاہ اندیش ہونے میں کلام نہیں لیکن اس موقع پر ابتدا اس کی طرف سے نہیں ہوئی بلکہ معلوم ہوتا ہے جب اس کے نانا الہ وردی خاں نے وفات پائی (۱۱۶۹ھ/۱۷۵۶ء) تو گو وہ اپنی زندگی میں سراج الدولہ کو ولی عہد بنا چکا تھا، لیکن دستور کے مطابق بعض امرا اور اہل خاندان خفیہ یا علانیہ نئے نواب کے مخالف ہوگئے اور عجب نہیں کہ ملک میں شورش کے یہی آثار دیکھ کر انگریز تاجروں کو یہ جرات ہوئی ہو کہ انھوں نے چند مجرمین کو جو بھاگ کر کلکتے میں پناہ گزیں ہوئے تھے، نواب کے حوالے کرنے سے انکار کردیا، یہ سراج الدولہ کی مسند نشینی سے دو مہینے بعد (شعبان ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۶ء) کا واقعہ ہے۔ خود وہ اس وقت راج محل کی طرف دورہ کرنے روانہ ہوا تھا کہ مذکورۂ بالا اطلاع ملی اور نواب غضبناک ہوکر جہاں تھا وہیں سے جنوب کی طرف پلٹ پڑا اور ماہ رمضان المبارک (یعنی جون ۱۷۵۶ء) میں اس کی فوجیں انگریزوں کی تجارتی نوآبادی (کلکتہ) کے سامنے اس قدر جلد اور غیر متوقع طور پر نمودار ہوئیں کہ انگریز بھاگنے کے لیے کشتیاں بھی فراہم نہ کرسکے۔ جن سے نکلا گیا وہ نکل گئے ورنہ ایک گروہ کثیر یہیں گرفتار رہا اور ان کے تجارتی کارخانے کو

نواب کی فوج نے دل بھر کر لوٹ لیا۔[1] کلکتے کی حفاظت کے لیے نواب نے دیوان مانک چند کو مقرر کیا جو کہ "در جمیع امور بے شعور و از جوہر شجاعت ہم محروم" تھا۔ پھر دریا کی گزرگاہ پر چند فوجی چوکیاں مقرر کر کے مرشد آباد کو مراجعت کی۔
کلکتے سے جو انگریز جان سلامت لیجا سکے تھے وہ فلٹا میں ٹھہرے جہاں ولندیزوں کی تجارتی کوٹھی تھی۔ یہیں مدراس سے ان کو فوجی کمک بھیجی گئی اور تھوڑے دن بعد "فاتح ارکاٹ" کلائو (جو اب کرنل ہو گیا تھا) اور امیر البحر واٹسن ولایت کی تازہ دم فوج لے کر آپہنچے۔ نواب کے سرداروں نے غالباً رشوتیں لے کر کلکتے کی مدافعت سے پہلو تہی کی اور تھوڑی سی گولہ باری ہوتے ہی یہ شہر پھر انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا (۱۱۷۰ھ مطابق ۱۷۵۷ء)۔

ان سرداروں ہی پر منحصر نہیں سراج الدولہ کے اکثر درباری اس کے خلاف غدر و بیوفائی پر آمادہ تھے۔ خود حکومت بنگالہ کا رکن رکین میر جعفر جو نواب کا رشتہ دار بھی تھا، اس کی بیخ کنی کے درپے تھا اور درحقیقت اسی کے اصرار سے انگریزوں نے نواب کے خلاف سازش اور آخر میں مرشد آباد پر فوج کشی کرنے کی جرأت کی۔ انگریزوں کو اس بات کا اطمینان دلایا گیا تھا کہ ساری فوج سراج الدولہ کے خلاف ہے اور اس فوج کے مقابلے میں محض صف آرائی کرنا سپاہیوں کو منتشر کر دینے کے واسطے کافی ہو گا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ جب انگریزی سپاہ مرشد آباد کے قریب (موضع پلاسی) تک بڑھی اور سراج الدولہ کو مقابلے کے واسطے باہر آنا پڑا۔ تو پچاس ہزار کے لشکر میں پانچ ہزار سپاہی بھی ایسے نہ تھے جنھوں نے نمک حلالی اور لڑائی میں شرکت کی ہو۔ اسی اندیشے سے نواب کو مرشد آباد سے باہر آنے میں پہلے ہی تامل تھا اور اب ہر چند

[1] بظاہر اسی ہل چل میں چند انگریز عورتوں نے ایک شخص امیر بیگ نامی کی پناہ لی تھی اور اس نے اپنے کو خطرے میں ڈالا مگر جس طرح ممکن ہوا انھیں چھپا کر کلکتے سے باہر وہاں تک بحفاظت پہنچا گیا جہاں مفرور انگریزوں کی کشتیاں لنگر انداز تھیں اس جوانمردی اور احسان کا انگریزوں نے روپے سے معاوضہ کرنا چاہا تھا مگر امیر بیگ نے انکار کیا کہ میں نے یہ کام روپے کی طمع میں نہیں کیا بلکہ محض مقتضائے شرافت و انسانیت سمجھ کر کیا ہے.... (امیر المتاخرین صفحہ ۶۲۲)۔

باب ۲

اس لئے اپنے عہدہ داروں کی منت سماجت کی اور اپنے قصوروں کی معافی مانگ کر انھیں لڑائی پر آمادہ کیا، لیکن ان خودغرضوں پر کوئی اثر نہ ہوا اور لڑائی صرف اس جمعیت کے ساتھ ہوئی جو نواب کے وفادار بخشی میر مدن کے ماتحت تھی اور جس میں غالباً ایک ہزار سے زیادہ سپاہی نہ تھے۔ ورنہ باقی تمام فوج اپنی اپنی جگہ دور کھڑی لڑائی کا تماشا دیکھتی رہی۔ میر مدن کے ثبات قدم اور اس کے پہلے دن کے حملے نے انگریزوں کو پریشان کر دیا تھا وہ میر جعفر کے وعدوں سے بدگمان ہو کر اپنے آپ کو اس جھگڑے میں پھنسانے سے پشیمان تھے لیکن جب انگریزوں کو میر مدن کے حملے نے پسپا کیا اور انھوں نے ایک آموں کے باغ میں پناہ لی کہ ممکن ہو تو رات کو نواب کی فوج پر چھاپہ ماریں۔ اسی وقت اتفاق سے توپ کے ایک گولے سے میر مدن نے مہلک زخم کھایا اور اس کے مرنے سے خود نواب کا دل چھوٹ گیا، وہ اسی شام کو میدان جنگ سے نکل گیا۔ فوج کے اکثر سپاہی پہلے ہی لڑائی سے الگ رہے یا گھروں کو واپس روانہ ہو چکے تھے۔ لہذا صرف چند دستے جنھیں نواب کے نکل جانے کی خبر نہ ہوئی تھی میدان میں رہے اور انھی سے معمولی زد و خورد کے بعد یہ مشہور "لڑائی" فتح ہو گئی![1] (جون ۱۷۵۷ء مطابق شوال ۱۱۷۰ھ)۔

میر جعفر کی نوابی۔

ابنائے زماں کی عداوت نے سراج الدولہ کے ایسے حواس بگاڑے تھے کہ اسے بھاگنا بھی نہ آیا اور خشکی کے بجائے وہ تری کے راستے سے عظیم آباد جا رہا تھا کہ راہ میں پکڑا گیا اور مرشد آباد میں لا کر قتل کرا دیا گیا۔[2]

[1] مذکورۂ بالا حالات سیر المتاخرین جلد دوم (صفحہ ۶۳۷ و ۶۳۸) سے لیے گئے ہیں۔ نیز دیکھو کین کی تاریخ ہند جلد اول (۱۶۴ و ۱۶۵) ریاض السلاطین ۳۷۰ وغیرہ وغیرہ۔ پچیس تیس برس پہلے تک انگریز تاریخ نویس اس "فتح" پر نہایت فخر و ناز کیا کرتے تھے لیکن اب اکثر نئے مصنف اس سے ابا کرنے لگے ہیں۔

[2] لیفٹیننٹ اسمتھ صاحب اور نیز اکثر انگریز مورخ لکھتے ہیں کہ سراج الدولہ کو میر جعفر کے بیٹے میرن نے نہایت بیرحمی سے قیمہ قیمہ کرا دیا لیکن انھیں شاید یہ خبر نہیں کہ یہ قتل انگریزوں کی صوابدید و صلاح سے عمل میں آیا تھا! (ریاض السلاطین صفحہ ۳۷۲)

باب

اب میر جعفر کی نوابی میں کوئی خرخشہ باقی نہ رہا اور اس نے اپنے انگریز مددگاروں کو جس دریا دلی کے ساتھ انعام دیا وہ بنگالے کی تاریخ میں ضرب المثل ہے چنانچہ مشہور ہے کہ زرد اشرفی سے پوری ایک کشتی بھر کر کلکتے بھیجی گئی تھی جس میں سے بچیس لاکھ کے قریب صرف "ثابت جنگ کرنل کلیف" (یعنی کلائیو) کے حصے میں آیا۔ کمپنی کو "چوبیس پرگنے" نامی ضلع کے حقوق زمینداری بھی حکومت بنگالہ نے عطا کئے اور اس کی آمدنی (تقریباً تین لاکھ روپے سالانہ) کلائیو کے نام لکھدی۔

لیکن میر جعفر جسے اتنی آسانی اور محض سازش سے حکومت بنگالہ مل گئی ذاتی طور پر بالکل نا اہل و نالائق آدمی تھا بخصوص دراں وقت کہ نشہ بنگ بہ تائید جلوس بر مسند امارت بنگ دو بالا گشتہ" اس کو عیش و عشرت نے اور بھی بیکار کر دیا تھا۔ ادھر ایک تو اسی زمانے میں شہزادۂ عالی گوہر (شاہ عالم) فتح بنگالہ کے ارادے سے بہار کے حدود میں داخل ہوا۔ اور دوسرے انھی دنوں کلائیو بنگالے کے "غنائم" سے مالامال ہو۔ ولایت روانہ ہوگیا۔ (سنہ ۱۷۶۰ء) میر جعفر کا سب سے بڑا حامی اور دوست وہی تھا مگر اس کے جانشین کو میر جعفر کی رفاقت ترک کرنے میں زیادہ نفع نظر آیا لہذا کلکتہ کونسل کے بعض اراکین کی خودغرضانہ مخالفت کے باوجود اس نے میر جعفر کے داماد میر قاسم سے سازباز کر لیا اور میر قاسم ہی انگریزوں کی مدد[1] سے بنگالے کا فرمانروا ہوگیا (سنہ ۱۷۶۰ء مطابق سنہ ۱۱۷۴ھ)

[1] اس عزل و نصب کے متعلق مختلف روایتیں ہیں اور اس لیے ذیل میں "ریاض السلاطین" کی روایت کا بجنسہ نقل کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

میر محمد قاسم خاں باتفاق جگت سیٹھ با سرداران انگریز ساختگی کردہ آنہا را براں آورد کہ سرداران انگریز تابع مرضی خاں مذکور شدہ بنواب جعفر علی خاں نوشتند کہ ہنگامۂ طلب و تنخواہ سپاہ روبہ طولانی دارد بہتر آن ست کہ قلعہ صوبہ بہ میر قاسم خاں سپردہ خود از قلعہ برخاستہ بکلکتہ بیایند میر محمد قاسم خاں بہ دلجمعی تمام باحصول مطالب مراجعت بہ مرشدآباد نمودہ سرداران سپاہ انگریز با وے موافق شدہ نواب جعفر علی خاں را از قلعہ برکشتی سوار کردہ بہ کلکتہ رسانیدند۔ (صفحہ ۳۸)

باب میر قاسم سے مخالفت۔

نئے نواب نے رشوت میں زر کثیر کمپنی کے عہدہ داروں کو اور تین پرگنے یا ضلع خود کمپنی کو دیے اور معاہدہ ہوگیا کہ ان پرگنوں کی آمدنی سے کمپنی ایک فوج مہیا رکھے گی کہ وقت ضرورت نواب کے کام آئے لیکن تھوڑے ہی دنوں میں یہ عہد و پیمان اور دوستانہ تعلقات درہم برہم ہوگئے۔ میر محمد قاسم کی انتظامی قابلیت کو قریب قریب ہر انگریز مورخ نے سراہا ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ محض ملازمین کمپنی کی حرص نے اسے انگریزوں کی مخالفت پر آمادہ کیا اور اس پر بھی وہ حتی الامکان علانیہ لڑائی شروع کرنے سے بچنا چاہتا تھا اور مرشدآباد کے بجائے اس نے مونگھیر کو اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا کہ کلکتے کے انگریزوں سے دور ہو جائے لیکن حق یہ ہے کہ اسے ان لوگوں سے معاملہ پڑا جن کی اس وقت تک کوئی منتظم مرکزی حکومت نہ تھی اور گو کلکتے میں رسمی طور پر ایک صدر کونسل قائم تھی لیکن درحقیقت کمپنی کی ہر کوٹھی کا منتظم اپنے آپ کو آزاد و خود مختار سمجھتا تھا اور کچھ کمپنی کے اور زیادہ تر اپنے ذاتی فوائد کی خاطر نواب بنگال کو دھمکی یا فریب سے آسامی بنانا چاہتا تھا مگر مناسب ہوگا کہ اس قصے کو ہم انگریز مورخ کین کی زبانی سنیں جس نے واقعات کو مختصراً تسلسل کے ساتھ بیان کیا ہے:-

وہ لکھتا ہے کہ "عین اس زمانے میں جب کہ پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو ہزیمت نصیب ہوئی، فرانسیسیوں اور انگریزوں کی باہمی کشمکش کا طویل سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ یعنی ۱۵ جنوری (۱۷۶۱ء مطابق جمادی الثانی ۱۱۷۴ھ) کے دن پانڈی چیری کی فرانسیسی فوج نے کرنل کوٹ کی اطاعت قبول کر لی اور اس شہر پر قبضہ ہوتے ہی مدراس کے انگریزی حکام کے حکم سے وہاں کے جنگی استحکامات فوراً منہدم کرا دیے گئے۔"

مگر ان واقعات سے انگریزوں کو جو فرصت و اطمینان میسر آیا اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ بنگالے کے قابوچی عہدہ داروں کو دوبارہ دست درازی کرنے کی ہمت ہوگئی اور جس قدر روپیہ وہ میر قاسم سے اینٹھ سکتے تھے اسے وصول کرنے کے بعد اب انھوں نے اس کے ساتھ اس قسم کے جھگڑے نکالے

۱؎ یعنی مدناپور بردوان اور چاٹ گام۔

باب

جو ذاتیات میں داخل تھے۔ مثلاً میجر کارنک نے نواب کی طرف سے شاہ عالم کے خلاف جنگ تو شروع کی اور اس میں شکست دے کر بادشاہ کے فرانسیسی سردار لا کو قید بھی کر لیا لیکن دوسرے دن جب کارنک کی بادشاہ سے ملاقات ہوئی تو ادھر تو شاہ عالم نے کمپنی کو پورے صوبۂ بنگالہ کی دیوانی دینے پر آمادگی ظاہر کی اور ادھر کارنک اس کے ساتھ ایسے انکسار و لجاجت سے پیش آیا کہ میر محمد قاسم کو طرح طرح کے اندیشے پیدا ہو گئے ++ اسی طرح جب کارنک کی بجائے کوٹ انگریزی فوج کا سپہ سالار مقرر ہوا تو اس نے بھی عمداً ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جس سے خواہ مخواہ میر قاسم کو رنج و پریشانی پیدا ہوئی اور اس طرزِ عمل میں پٹنے کے انگریزی کارخانے کا منتظم مسٹر ایلس بھی کوٹ کا مقلد تھا۔ جھگڑے کی اصلی وجہ یہ تھی کہ کمپنی کا ہر ملازم اپنے تجارتی مال کو محصول راہ داری سے مستثنیٰ کرانا چاہتا تھا حالانکہ یہ محصول نواب کے مداخل ریاست میں بہت معقول آمدنی کا ذریعہ تھا لیکن شاہ عالم بادشاہ کی رضا جوئی بھی رقابت کا ایک سبب بن گئی کیونکہ اس پریشاں حالی کے باوجود شمالی ہند میں حکومت کا جائز وارث وہی تھا۔ اور گو ابھی دنوں وہ اپنے برائے نام وزیر نواب شجاع الدولہ کے علاقے میں ہٹ آیا تھا۔ اور دو سال تک وہیں پناہ گزیں رہا، پھر بھی ہر فریق کی اسی "تاجدار بے ملک" کی طرف نگاہ لگی ہوئی تھی۔

آخر کار زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ کلکتے کے انگریز حکام کی میر قاسم سے اسی محصولِ راہ داری پر علانیہ ان بن ہو گئی۔ کمپنی کا انگریز عامل یا گورنر وَن سٹارٹ اعتدال پسند آدمی تھا اور کلائیو نے اسے مدراس سے بلا کر اس عہدے پر اسی لیے مقرر کرایا تھا کہ "کلکتہ کونسل" کی ناجائز حرکتوں کی روک تھام کرے۔ اسی کونسل کا ایک اور فرد یارکن وارن ہیسٹنگز بھی قابلیت کے ساتھ اس کی تائید کرتا تھا۔ یہ وہ شخص ہے جس کا ہم فلتا کے پناہ گزینوں کے ساتھ پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ وہ دولت و اقتدار کی حرص سے مبرّا نہ تھا بایں ہمہ ایسا بد اخلاق اور بے حمیّت بھی نہ تھا کہ اپنے دوسرے ساتھیوں کی

باب ۷

ریشہ دوانیوں میں شریک ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ ون سٹارٹ نے اسی کو منتخب کیا کہ جا کر نواب میر قاسم سے ملے اور مذکورۂ بالا نزاع کو مصالحانہ طریق پر طے کرنے کی کوشش کرے۔ پھر اس خیال سے کہ نواب کی ناراضی کے باعث معاملہ ذرا نازک ہو گیا ہے۔ وَن سٹارٹ خود بھی گیا اور فیصلے کی یہ معقول شرائط قرار پائیں کہ خاص کمپنی کے مال درآمد و برآمد پر نواب کی طرف سے محصول نہ لیا جائے گا لیکن جو انگریز نج کے طور پر تجارت کرتے اور محصول سے بچنا چاہتے ہیں، اس کی ممانعت کر دی جائے گی۔ وَن سٹارٹ ۲۰ر جنوری ۱۷۶۳ء (۱۱۷۶ھ) کو کلکتے واپس آگیا اور معلوم ہوتا تھا کہ معاملہ بالکل طے ہو گیا ... لیکن ادھر تو کلکتہ کونسل نے اس عذر پر کہ گورنر کو ایسے معاہدے کرنے کا اختیار ہی نہیں تھا، وہ شرائط منسوخ کر دیں اور ادھر ایلیس کو اجازت دے دی کہ وہ خاص خاص حالتوں میں فوجی قوت سے کام لے سکتا ہے، ایلیس نے جنگ و جدال کا موقع نکالنے میں دیر نہ کی اور اس کے جواب میں نواب نے بھی اس کے سپاہیوں کی سرزنش کے واسطے ایک رسالہ روانہ کیا۔ ساتھ ہی ایک حکم شائع کر دیا کہ آئندہ سے محصول راہ داری انگریز و غیر انگریز کسی سے نہ لیا جائے گا تاکہ دیسی سوداگر بھی انھی کی مساوی شرائط پر تجارت کر سکیں (یہ وضاحت کر دینی چاہیے کہ اس وقت کمپنی کا ہر عہدہ دار نج کی تجارت میں کچھ نہ کچھ حصہ لیتا تھا)۔

نواب کے اس حکم نامے کو ایلیس اور اس کے بالادست (کلکتہ کونسل کے) عہدہ داروں نے، وَن اسٹارٹ اور ہیسٹنگز کے علی الرغم کثرت رائے سے اعلان جنگ قرار دیا اور میر قاسم بھی اپنی جگہ پر آخر کار لڑائی کی تیاری کرنے لگا۔ مگر ''تصادم'' کی ابتدا ایلیس ہی نے کی اور پھر خود بچ کر نکلنا چاہتا تھا کہ غضب ناک نواب کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا۔[۱]

جنگ بنگالہ

کین نے یہ بھی لکھا ہے کہ میر قاسم نے انگریز قیدیوں کو قتل کرا دیا اور

---

[۱] کین۔ تاریخ ہند جلد اول صفحہ ۱۷۶،۱۷۵۔

باب

یہی خبر پاکر کلکتہ کونسل نے اس کے خلاف لشکر کشی کی اور دوبارہ میر جعفر کو نواب بنایا۔ لیکن یہ غلط اور سخت غلط فہمی میں ڈالنے والی روایت ہے۔ کیونکہ کلکتہ کونسل نے فوجیں جولائی (۱۷۶۳ء) میں روانہ کیں۔ اور پہلی لڑائی بھی پلاسی کے قریب اسی مہینے میں ہوئی لیکن انگریز قیدیوں کا قتل ماہ اکتوبر کا واقعہ ہے[1] اور خود کین کو اقرار ہے کہ اس کی بھی نواب نے پیش از پیش انگریز سپہ سالار کو اطلاع دے دی تھی کہ اگر پٹنے پر حملہ ہوا تو ان قیدیوں کی خیر نہ ہوگی۔

بہر حال جنگ میں میر قاسم کی فوجوں کو دو تین مقامات پر پیہم شکست ہوئی۔ اس کے مستعد اور منظم ہونے میں کلام نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ زیر نظر عہد میں اہل ہند کے طبقۂ اعلیٰ کے افراد سے فوجوں کو لڑانے کی قابلیت مفقود ہوگئی تھی اور میدان جنگ میں ان کے چند سردار بھی اشتراک و اتحاد کے ساتھ کام نہ کر سکتے تھے۔ باہمی رقابت اور خود غرضی نے ان میں سخت نفاق پیدا کر دیا تھا اور سب سے آخری لڑائی میں جو اودھوا نالے کے کنارے راج محل کے قریب ہوئی (ماہ صفر ۱۱۷۷ھ / ۱۷۶۴ء) خود میر قاسم کا مشہور سردار مرزا نجف خاں انگریزوں سے مل گیا اور اسی کی رہبری سے چھپ کر انگریز راتوں رات ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں سے نواب کا لشکر توپوں کی زد میں تھا۔ اس شبخون میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور میر قاسم کی فوج کا شیرازہ بکھر گیا[2]۔

حصول دیوانی

بنگالے کا شکست خوردہ حاکم (میر قاسم) بہار سے ہٹ کر ریاست اودھ کے علاقے میں چلا آیا تھا۔ اور شاہ عالم اور نواب شجاع الدولہ اس کے معین و مددگار ہوگئے تھے لیکن جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں والی اودھ نے آخر میں بیوفائی کی اور میر محمد قاسم کی فوج کو اپنے ساتھ ملا کر خود اسے حراست میں لے لیا۔ اس طرح اگرچہ والی اودھ کی سپاہ میں نہایت

---

[1] اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۵۰۰۔

[2] مرزا نجف کی غداری اور شبخون کے حالات سیر المتاخرین میں تفصیل سے تحریر ہیں (صفحہ ۷۴۸) نیز دیکھو ریاض السلاطین ۳۸۱

باب

معقول اضافہ ہوگیا تھا مگر جب اس نے بطور خود انگریزوں سے جنگ کی تو اس میں سخت شکست ہوئی اور بہار و بنگالہ کی فتح تو ایک طرف خود اس کی ریاست کے بعض اضلاع ہاتھ سے نکل گئے کیونکہ مقابلہ بہار کی عین مغربی سرحد کے مقام بکسر پر ہوا (۱۷۶۴ئ مطابق ۱۱۷۸ھ) فتحمند تعاقب کرتے ہوئے چنار و الہ آباد تک بڑھ آئے اور ان مقامات پر بھی ان کا بلادقت قبضہ ہوگیا۔

لیکن انگریزوں کو لڑائی کا اصلی فائدہ یہ ہوا کہ شاہ عالم والی اودھ کا ساتھ چھوڑ کر انگریزی لشکر میں آگیا اور صوبہ بہار و بنگال واڑیسہ کی سند دیوانی دے کر اس نے انگریزوں کے قبضۂ بنگال کی تصدیق و توثیق کردی اس جگہ یہ صراحت کردینی چاہئے کہ نواب میر جعفر کا اسی زمانے میں انتقال ہوا (جنوری ۱۷۶۵ئ) اور گو کلکتہ کونسل نے اس خداداد موقع پر بھی پہلے کی طرح اس کے بیٹے (نجم الدولہ) سے بہت سی رشوتیں[1] لے کر اسے بنگالے کا نواب تسلیم کیا تھا مگر اسے کمزور و بے حقیقت دیکھ کر جب انھوں نے بالاہی بالا شاہ عالم سے دیوانی کی سند حاصل کرلی تو پھر بنگالے کا یہ نام نہاد نواب اپنے رہے سہے اختیارات سے بھی محروم ہوگیا۔

شاہ عالم بادشاہ سے جو معاہدہ "عہد نامۂ الہ آباد" کے نام سے انگریزوں نے کیا اس کی اہم شرائط یہ تھیں کہ کوڑہ اور الہ آباد کے ضلعے جو انگریزوں نے والی اودھ سے چھینے تھے، بادشاہ کے حوالے کردئے جائیں گے اور بہار و بنگال کی مالگزاری کے نام سے ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ بھی وہ بادشاہ کو ادا کرتے رہیں گے جس کے عوض میں بادشاہ نے انگریزی کمپنی کو ان مشرقی صوبوں کا دیوان بنا دیا جس کا درحقیقت قانونی مطلب صرف یہ تھا کہ نواب (یا ناظم) بنگالہ کے ماتحت یا مددگار کی حیثیت سے

[1] گورنر وَن سٹارٹ جس کی قابلیت کی بہت کچھ تعریفیں کی جاتی ہیں، اس رشوت ستانی میں شریک تھا اور اس کے حصے میں بھی پانچ لاکھ روپیہ آیا تھا (اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۵۰۰ بحوالۂ مل جلد سوم وغیرہ وغیرہ)

باب

ان صوبوں کی سرکاری مالگزاری کا انتظام انگریزوں کے ہاتھ میں رہے گا۔ البتہ بادشاہ نے مدناپور و بردوان وغیرہ چند پرگنوں پر (جو نواب کی طرف سے انھیں پہلے بطور جاگیر مل چکے تھے) کمپنی کا براہ راست قبضہ تسلیم کر لیا۔[1]

تتمہ
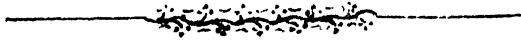
[1] یہ خبریں مل کی اور نیز حال کی بعض مفصل انگریزی تاریخوں میں موجود ہیں۔ بایں ہمہ اکثر انگریز تاریخ نویس اس "دیوانی" کے ملنے کا اس طرح ذکر کرتے ہیں گویا کمپنی کو اسی موقع پر حکومت ہند کی سند مل گئی مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ بے شبہ نواب نجم الدولہ کی نااہلی اور بے بسی کی بدولت رفتہ رفتہ تمام اختیارات انگریزوں کے ہاتھ میں آگئے لیکن عہدنامۂ الہ آباد کی رو سے ان کی اصلی اور قانونی حیثیت محض "دیوان" کی تھی جو ناظم یا صوبہ دار کے ماتحت صرف صیغۂ مالگزاری کا اعلیٰ عہدہ دار ہوتا تھا۔ چنانچہ انگریزوں کا بھی وصول مالگزاری کے سوا سالہا سال تک دیگر انتظامات میں براہ راست کوئی دخل نہ تھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تتمہ فہرست ماخذات نمبرا

ذیل میں صرف ان کتابوں کے نام اور سنین طبع وغیرہ درج ہیں جن کا تاریخ ہند (برائے اف اے) کی دوسری اور تیسری جلد میں جابجا حوالہ دیا گیا ہے۔ جن ماخذوں سے کہیں کہیں جزئی مدد لی گئی ہے ان کے نام اس فہرست میں داخل نہیں کئے گئے۔

(۱)۔ فتوح البلدان (عن بلاذری) مطبوعۂ یورپ ۱۸۶۶ء
(۲)۔ تحفۃ الکرام (مؤلفۂ علی شیر قانع) جلد سوم مطبوعۂ لکھنو ۱۳۰۴ھ
(۳)۔ تاریخ سندھ (مؤلفۂ میر معصوم بھکری) قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد
(۴ و ۵)۔ تاریخ سندھ (مؤلفۂ مولوی عبدالحلیم صاحب شرر) دو جلد مطبوعۂ لکھنو
(۶)۔ مسالک الممالک (عن اصطخری)
(۷)۔ " " (عن ابن حوقل)
(۸)۔ کتاب المسالک والممالک (عن ابن خرداذبہ)
(۹)۔ احسن التقاسیم فی معرفت الاقالیم (مقدسی البشاری)

(۶ تا ۹: مرتبہ ڈی گوئیری مطبوعۂ یورپ)

(۱۰)۔ المغرب وارض السودان ... (ادریسی) معہ ترجمہ فرانسیسی مطبوعہ یورپ ۱۸۶۴ء
(۱۱)۔ تقویم البلدان (ابوالفدا) مطبوعہ یورپ ۱۸۲۹ء
(۱۲)۔ عجائب الہند (مؤلفۂ بزرگ بن شہریار) عربی معہ ترجمہ فرانسیسی مطبوعہ یورپ
(۱۳۔۱۴)۔ تاریخ فرشتہ (دو جلد) مطبوعۂ نولکشور ۱۲۸۱ھ
(۱۵، ۱۶)۔ طبقات اکبری (دو جلد) " "
(۱۷ تا ۱۹)۔ منتخب التواریخ (ملا عبدالقادر بداؤنی) تین جلد مطبوعۂ ایشیاٹک سوسائٹی
(۲۰، ۲۱)۔ حبیب السیر دو جلد مطبوعہ بمبئی ۱۲۷۳ھ

(۲۲)۔ مآثر الکرام مطبوعۂ آگرہ ۱۹۱۰ء
(۲۳)۔ طبقات ناصری مطبوعۂ ایشیاٹک سوسائٹی
(۲۴)۔ اخبار الاخیار۔ مطبوعۂ میرٹھ ۱۲۸۳ھ
(۲۵)۔ چہار مقالہ۔ مطبوعۂ بمبئی
(۲۶-۲۷) لباب الالباب (عوفی) دو جلد مطبوعۂ یورپ
(۲۸) شعر العجم (مولوی شبلی نعمانی) حصۂ اول
(۲۹)۔ تاریخ بیہقی مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی
(۳۰)۔ تاج المآثر (قلمی) کتب خانہ آصفیہ
(۳۱)۔ فوائد الفواد مطبوعۂ اودھ اخبار لکھنو ۱۳۰۲ھ
(۳۲)۔ تاریخ فیروز شاہی (برنی) مطبوعۂ ایشیاٹک سوسائٹی
(۳۳)۔ " " (شمس سراج عفیف)
(۳۴)۔ تزک بابری (فارسی) مطبوعہ ۱۳۰۸ھ
(۳۵)۔ ریاض السلاطین (غلام حسین سلیم) مطبوعۂ ایشیاٹک سوسائٹی
(۳۶-۳۷)۔ اکبر نامہ (ابو الفضل) تین جلد " " " "
(۳۸)۔ آئین اکبری (دو جلد) " " " "
(۳۹ تا ۴۱)۔ مآثر الامرا۔ تین جلد " " " "
(۴۲) اقبال نامۂ جہانگیری " " "
(۴۳) تزک جہانگیری (قلمی) کتب خانہ آصفیہ
(۴۴)۔ دبستان مذاہب مطبوعۂ بمبئی ۱۲۹۲ھ
(۴۵)۔ زبدۃ المقامات (ترجمۂ اردو) مطبوعہ لاہور
(۴۶-۴۷)۔ بادشاہ نامہ (دو جلد) مطبوعۂ ایشیاٹک سوسائٹی
(۴۸-۴۹)۔ منتخب اللباب (خافی خاں) دو جلد " "
(۵۰)۔ رقعات عالمگیری مطبوعۂ نولکشور
(۵۱)۔ لطائف الاخبار (قلمی) کتب خانہ آصفیہ
(۵۲)۔ آداب عالمگیری (" ") " " " "

(۵۳)۔ واقعات عالمگیری (قلمی) کتب خانہ آصفیہ
(۵۴)۔ مآثر عالمگیری۔ مطبوعۂ ایشیاٹک سوسائٹی
(۵۵)۔ واقعہ خرابی دہلی (قلمی) کتب خانہ آصفیہ
(۵۶-۵۷)۔ سیر المتاخرین (جلد دوم و سوم) مطبوعۂ نولکشور سنہ ۱۲۸۳ھ

۵۸ تا ۶۵ History of India as told by its own historians.

(Elliot & Dowson) 8 volumes

۶۶ Early History of India. by V. A. Smith 1914)

۶۷ Elphinstone's History of India, (1916)

۶۸ L, Poole's Mediaeval India. (S. N. S.)

۶۹ V. A Smith's "Oxford History of India" (1918)

۷۰ و ۷۱ Browne's "Literary History of Persia" (2 volumes)

۷۲ "Chronicles of the Pathan Kings of Delhi"

By E. Thomas (1871)

۷۳ و ۷۴ Raycrty's English translation of Tabakat-i-Nasiri

(2 Vol)

۷۵ "The Memoirs of Baber" (Fas: III). translated

by Mrs: Beveridge.

۷۶ Erskine's India under Baber (First volume)

۷۷ L Poole's "Baber" (R. I. S.)

۷۸ G. Duff's "A History of the Marhattas'

Caicutta 1818. Edition (First volume)

۷۹ تا ۸۴ J Sirkar's "History of Aurangzeb" (4 volumes)

۸۳ L. Poole's "Aurangzeb (R. I. S.)

۸۴ Bernier's Travels (Edited by V. A. Smith)
1916 Edition

۸۵ "India at the death of Akbar" 1920

۸۶ تا ۸۸ Blochman & Jarrett's English translation of the
Ain-i-Akbari, (3 Vol)

....

Reference & Maps

Imperial Gazetteer of India 1908.

Encyclopaedia Britt: (Eleventh Edition)

Royal Atlas. (1916 Edition)

"Joppen's Historical Atlas of India" (1917.)

صحت نامہ

تاریخ ہند جلد سوم (برائے انٹرمیڈیٹ)

طبع دوم

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
۱۸	حاشیہ سطر ۵	زبان	زبان میں
۴۰	۱۴	غرور وخودداری	غرور وخودرائی
۴۳	حاشیہ سطر ۴	ان کی	اس کی
۵۰	۱۴	ابھی	انھی
۷۲	۹	پیادہ سوار	پیادہ وسوار
۸۴	۱۷	قصیبے	قصبے
۱۰۵	۱۵	نندباریانذربار	نندباریانمدبار
۱۰۸	۴	ہم حاشیے میں	ہم کسی حاشیے میں
۱۱۰	۲۱	گزی	گزری
۱۱۲	۲	بادشاہ کر	بادشاہ کو
۱۲۴	حاشیہ سطر ۲	انشاپرداری	انشاپردازی
۱۲۶	عنوان سطر ۱	تیسری فصل	چوتھی فصل
۱۳۰	۱۱	دوادی	وادی
۱۳۲	۱۵	لگائی	نکالی
۱۴۷	حاشیہ سطر ۹	پھر اسے	پھر اس نے
۱۵۰	۲	ریس	رئیس
۱۵۲	۱۵	ہے	ہے کہ
۱۶۴	۲	گولگنڈے	گولکنڈے
۱۶۸	۱	اعزار	اعزاز
۱۶۹	عنوان حاشیہ	وسائل سفر	وسائلِ سفر
۱۹۸	حاشیہ سطر ۱	البٹ	الیٹ
۲۰۲	۱۳	نشریف	تشریف

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
۲۰۴	۷	محمد شا	محمد شاہ
۲۱۷	۱۵	ایک مقام پر پہنچنے میں	ایک مقام پر
۲۱۸	۲۲	منتظم	منتظم
۲۲۱	۳	کرلی جو.	کرلی - اور یہ
۲۳۰	۲	مآثر الامرا	مآثر الامرا
۲۴۲	۴	اینے	اپنے
〃	۷	جنانچہ	چنانچہ
۲۴۳	۲۲	اسسے	ایسے
۲۴۵	۱۹	اں	آں
۲۴۶	۲۳	تحفئے	تحفے
۲۵۲	۱۹	اس بار کی	کی
۲۵۳	۲۰	اس بار کے	کے
۲۵۴	۴	حیرت نگیز	حیرت انگیز
۲۵۸	۱	حبوب	جنوب
〃	۱	تحری	بحری
〃	۲	ھا	تھا
۲۶۸	۳	توانگریزوں	نوانگریزوں
۲۷۱	۱۱	جس میں	جہاں
۲۹۱	۵	کہ کلکتے	کہ آیا کلکتے
〃	۶	کہ لڑائی	یا لڑائی
۲۹۴	۱۲	کے حدود	کی حدود